بھرم

محی الدین نواب

بھرم

محی الدین نواب

علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

فہرست

بھرم

ایک غیرت مند بھائی کی غیرت کا قصہ۔
اس نے اپنی زندہ بہن کو اپنے ہاتھوں قبر میں اتار دیا تھا۔
اُس بہن کا قصہ جس کا دامن ہر گناہ سے
پاک تھا مگر اس نے اپنے بھائی کی غیرت کا بھرم
رکھنے کے لئے بے مثال قربانی دی تھی۔
عزت اور غیرت کے فلسفے کے گرد گھومتی ہوئی نوکیلی کہانی۔

بیل گاڑی کچے اور ناہموار راستے پر ڈانواں ڈگمگاتی چلی جا رہی تھی۔ وہ گاڑی ایک ریڑھے کی طرح چاروں طرف سے کھلی ہوئی تھی۔ اس کے آگے بیل بندھا ہوا نہ ہوتا تو وہ ریڑھا ہی کہلاتی۔ بیل کو ہانکنے کی جگہ ایک ادھیڑ عمر کا شخص صدمے سے نڈھال بیٹھا ہوا تھا۔ وہ گاڑی کو سنبھال سنبھال کر آگے بڑھا رہا تھا لیکن راستہ ایسا ناہموار تھا کہ جب گاڑی چلتے وقت دائیں طرف جھکتی تو پیچھے رکھی ہوئی لاش دائیں طرف کھسک جاتی تھی۔ کبھی وہی لاش بائیں طرف سرکنے لگتی تھی۔

لاش سر سے پاؤں تک ایک چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں وہ کیسی لاش تھی۔ کس بیماری نے اسے کھا لیا تھا کہ اس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ وہ ان مکھیوں کو اڑاتا تھا' پھر سامنے اور خلاء میں دیکھتے ہوئے بیل کو ہانکنے لگتا تھا۔ دور ایک کھیت میں کام کرنے والے کسان نے ہاتھ ہلا کر گاڑی ہانکنے والے کو آواز دی۔ "اوئے صمدو بھائی! شہر سے لوٹ آئے' رانی کہاں ہے؟"

گاڑی ہانکنے والے صمدو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سامنے ایک ٹک دیکھتا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے وجود میں صرف اتنی جان بھر دی گئی ہے کہ وہ بیل کو ہانک سکتا ہے۔ اس [illegible] نہیں جانتا۔ وہ ساری دنیا کو فراموش کر بیٹھا ہے اور [illegible] آسمان [illegible] رہا ہے جو جھک کر زمین سے ملتا ہے۔

آسمان اور زمین کبھی نہیں ملتے۔ یہ فریب نظر ہوتا ہے انسانی رشتے بھی ایک فریب کی طرح ہوتے ہیں اور پھر بچھڑ جاتے ہیں۔ ایک رشتہ زندہ رہ جاتا ہے اور دوسرا رشتہ لاش بن جاتا ہے۔

آگے جا کر پگڈنڈی پر دو دیہاتی نظر آئے۔ انہوں نے صمدو کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں بھائی صمدو! شہر سے اب لوٹ آئے' رانی کہاں ہے؟؟"

وہ چپ چاپ بیل ہانکتا ہوا یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے بہرا ہو گیا ہو۔ دنیا کی کوئی آواز سنائی [illegible]

پوچھنے والے دونوں دیہاتی گاڑی کے قریب آ گئے۔ پھر انہوں نے پیچھے کی طرف دیکھ کر چونکتے ہوئے پوچھا۔ "ارے' یہ کس کی لاش ہے؟؟"

وہ اور آگے بڑھے۔ پھر ٹھٹک گئے کیونکہ لاش پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ دونوں دوڑتے ہوئے گاڑی کے اگلے حصے کی طرف آئے۔ بیل گاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ انہوں نے بیل گاڑی کے دونوں سروں کو دونوں طرف سے تھام کر باری باری پوچھا۔ "تم خاموش کیوں ہو' بولتے کیوں نہیں' کیا یہ ہماری رانی...........؟؟"

دوسرے نے کہا۔ "ابے کیوں بکواس کرتا ہے۔ ہماری رانی بہن تو گڑیا ہے گڑیا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ کیوں بھیا صمدو! تو بولتا کیوں نہیں۔ یہ کس کی لاش ہے؟؟"

تب صمدو کے ہونٹ لرزنے لگے۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہ میری رانی ہے۔"

اس کی بات سننے والوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک گم صم گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ سر گھما کر پیچھے لاش کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر ایک نے کہا۔ "بھیا! یقین نہیں آتا۔ ہماری گڑیا رانی تو اچھی بھلی تیرے ساتھ شہر گئی تھی۔ پھر اسے کس کی نظر کھا گئی؟؟"

دوسری طرف سے دوسرے نے پوچھا۔ "ہاں' بھیا کیا ہو گیا بیمار ہو گئی تھی کیا؟؟"

صمدو نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ "اسے کوڑھ ہو گیا تھا۔ دیکھتے نہیں مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔"

یہ سنتے ہی وہ دونوں گاڑی سے ذرا دور ہٹ گئے۔ انہوں نے سہمی ہوئی نظروں سے لاش کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا اسے اپنی بستی میں لے جا رہے ہو؟؟"

صمدو نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں وہاں سے بھاگتے ہوئے بستی کی طرف جانے لگے۔ گاڑی کے پہیئے چوں چرر کی آوازیں پیدا کرتے ہوئے جیسے رو رہے تھے۔ رانی کی لاش پر ماتم کرتے جا رہے تھے۔ بستی وہاں سے ابھی تقریباً ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھی۔ جب وہ بالکل قریب پہنچنے لگا تو اس نے دیکھا۔ بستی کے سرے پر بہت سے گاؤں والے جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی پگڑیوں کے پلو سے اپنی ناک اور منہ کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ان کے ساتھ وہاں کا زمیندار بھی تھا۔ اس نے دور ہی سے صمدو کو دیکھا اور ہاتھ اٹھا کر للکارتے ہوئے کہا۔ "صمدو! گاڑی وہیں روک دو۔ آگے بڑھنے سے پہلے ہمارے سوالوں کے جواب دو۔"

صمدو نے گاڑی روک لی۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس گاڑی پر کھڑا ہو گیا۔ زمیندار نے پوچھا۔ "کیا تیری بہن مر چکی ہے؟؟"

"ہاں' میں اس کی لاش لے کر آ رہا ہوں۔"

"کیا اسے کوڑھ ہو گیا تھا؟؟"

"ہاں' وہ اس مرض میں مبتلا رہ کر مر گئی۔"

"تو اسے بستی سے دور کہیں دفن کر دے۔ اس بیماری کو بستی کے اندر نہ لا۔"

صمدو نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "چوہدری جی! تم جانتے ہو کہ میں کسی سے دب کر نہیں رہتا۔ یہاں دس آدمیوں پر بھاری پڑتا ہوں مگر آج بہن کی موت نے میری کمر توڑ دی ہے۔ میں ہاتھ جوڑ کر التجا کرتا ہوں کہ مجھ پر یہ ظلم نہ کرو۔ میں اپنی بہن کو اپنے مکان کے احاطے میں دفن کروں گا۔"

سب لوگ نہیں' نہیں کی آوازیں بلند کرنے لگے۔ انکار میں کبھی ہاتھوں کو اور کبھی سر کو ہلانے لگے۔ زمیندار نے سب کو خاموش کراتے ہوئے صمدو سے کہا۔ "دیکھو صمدو! ہمارے بستی والوں کی بھلائی کے لئے تجھ سے یہ کہا جا رہا ہے۔ تجھے اپنی بہن سے محبت ہے تو اس محبت کے ناطے اس بیماری کو ہم لوگوں میں نہ پھیلا۔ یہ بری بلا ہے۔ ہم سب [illegible] کی۔ ہم کدال اور بیلچے تیرے پاس پہنچا دیتے ہیں۔ تو دریا کے کنارے جا کر اس لاش کو [illegible]۔"

[illegible] "دیکھو صمدو! دریا کے کنارے اسے دفن [illegible] ہماری رانی [illegible] پرندوں سے بڑی محبت کرتی تھی۔ [illegible] دیکھتی تھی۔ [illegible] دریا کے کنارے پانی بھرنے جاتی [illegible] پرندوں کے [illegible] اڑنے اور شکار کرنے کا تماشا دیکھتی رہتی تھی۔"

[illegible] صمدو [illegible] اس منظر میں کھو گیا اس کی نگاہوں کے سامنے [illegible]۔ کنارے پر آبی پرندے اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ پرندے [illegible] دریا کی سطح پر سے گزرتے تھے۔ کبھی ڈبکی لگانے کے انداز میں اپنی [illegible] پانی میں ڈبوتے تھے۔ دوسرے ہی لمحے جب پرواز کے دوران وہ پانی سے اپنی چونچ [illegible] تو اس میں مچھلی تڑپتی ہوئی نظر آتی۔ یہ پرندے اڑنے کے دوران دیکھ لیتے تھے کہ مچھلی کہاں تیر رہی ہے اور وہ کس طرح شکار کر سکتے ہیں۔ رانی بڑی خوش ہو کر دونوں

ہاتھوں سے تالی بجا بجا کر یہ تماشا دیکھتی رہتی تھی۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ دریا کے کنارے زمین کھود رہا تھا۔ ایک طرف بیل گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ وہاں رکھی ہوئی لاش پر ابھی تک مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ گاؤں کے لوگ اس سے اتنے خوفزدہ تھے کہ ایک فرلانگ کے فاصلے پر کھڑے ہوئے رانی کی تجہیز و تکفین کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ کسی میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ لاش کے پاس جا کر اسے ہاتھ لگاتا اور صمدو کی مدد کرتا۔ وہ اکیلے ہی اپنی بہن کا آخری بوجھ اتار رہا تھا۔

جب قبر کی کھدائی مکمل ہو گئی تب وہ کدال کو ایک طرف رکھ کر گاڑی کے پاس آیا۔ پھر وہاں سے اپنی بہن کی لاش کو دونوں بازوؤں میں اٹھانے لگا۔ وہ ایک تو تھکا ہوا تھا دوسرا صدمے سے نڈھال تھا۔ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ لاش کو اٹھا کر قبر تک چلتے ہوئے وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ قبر کے قریب پہنچ کر وہ لڑکھڑاتے ہوئے بیٹھ گیا۔ گرتے گرتے سنبھل گیا۔ دور بہت دور کھڑے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "ہم میں سے کسی کو اس کی مدد کرنی چاہئے۔"

دوسرے نے کہا۔ "تو پھر کھڑے کیا دیکھ رہے ہو' جاؤ اس کی مدد کرو۔"

کہنے والا ہچکچانے لگا۔ دوسری طرف صمدو آہستہ آہستہ لاش کو قبر میں اتار رہا تھا۔ پھر وہ گاڑی کے پاس آیا اور رہڑے کے جس حصے پر لاش رکھی ہوئی تھی' وہاں کے لکڑی کے تختوں کو اکھاڑنے لگا۔ پھر ان تختوں کو قبر کے اوپر جمانے لگا۔ اس کے بعد اس نے قبر کی مٹی برابر کی۔ وہاں قبر کی صورت میں مٹی کو بلند کیا۔ وہاں پانی چھڑکنے کے بعد فاتحہ پڑھی پھر اپنی گاڑی کے پاس آیا۔ گاڑی آدھی سے زیادہ ٹوٹ چکی تھی۔ اس نے بیل کو کھول دیا۔ پھر اس نے سوکھی لکڑیاں گاڑی پر جمع کیں' اس کے بعد اس نے اپنے کپڑے اتار کر ان سوکھی لکڑیوں پر رکھے۔ اب وہ صرف ایک لنگوٹ پہنے ہوئے تھا۔ پھر اس نے ماچس کی تیلی سے اپنے کپڑوں میں آگ لگا دی۔ کپڑوں کی آگ سوکھی لکڑیوں تک پہنچی۔ پھر سوکھی لکڑیوں سے شعلے بلند ہونے لگے۔ وہ شعلے بچی کھچی گاڑی کو اپنی لپیٹ میں لے کر جلانے لگے۔

صمدو نے بیل کے گلے کی رسی پکڑی۔ پھر اسے دریا کے کنارے لا کر نہلانے لگا اور خود اپنے اوپر پانی ڈالنے لگا۔ جب دونوں کا غسل ہو گیا تو وہ بیل کو کھینچتے ہوئے بستی کی طرف جانے لگا۔ اب بستی والے مطمئن تھے اور سر جھکا کر وہ بھی اس کے آگے پیچھے چل رہے تھے۔ کچھ لوگ زیر لب اس کے ساتھ ہمدردی جتا رہے تھے اور اس کی بہن کی

تعریفیں کر رہے تھے۔

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ پانی میں بھیگنے کے باعث صمدو کو ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے مکان کے احاطے میں پہنچ کر اس نے بیل کو ایک جگہ باندھا۔ پھر اپنے دروازے پر پڑے ہوئے تالے کو دیکھا۔ ایک جگہ سے لوہے کی ایک سلاخ اٹھائی۔ پھر اس سے تالے کو توڑ دیا۔ اب سے پہلے اسے کبھی دروازہ کھولنا نہیں پڑا۔ وہ دروازہ اس کے انتظار میں کھلا رہتا تھا اور اس کی بہن کی آنکھیں اس کی راہ تکتی رہتی تھیں۔ دور ہی سے اسے دیکھ کر کہتی تھیں۔ "بھیا اب جلدی آیئے' بھوک سے برا حال ہے۔ میں نے مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ پکایا ہے' مزہ آ جائے گا۔"

مگر اب زندگی بے مزہ ہو گئی تھی۔ وہ دروازہ بند تھا۔ صمدو نے غصے سے دروازے کو دیکھا اور ایک زور کی لات ماری۔ لات پڑتے ہی دروازے کے دونوں پٹ ایک جھٹکے سے کھل گئے۔ احاطے کے باہر گاؤں کے کچھ لوگ جو اس کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے آئے تھے اور اب واپس جا رہے تھے۔ انہوں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ انہیں تعجب ہوا کہ وہ ابھی صدمات سے نڈھال تھا اس نے غصے سے دروازے پر لات کیوں ماری۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ایک بوڑھے نے کہا۔ "بے چارہ صدمے سے پاگل ہو رہا ہے۔ اسے تنہا چھوڑ دینا چاہئے۔ کچھ دیر روئے گا' ماتم کرے گا تو دل اور دماغ کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

وہ مکان کے اندر آیا۔ پہلے اس نے صندوق کو کھول کر اپنے لئے لباس نکالا' اسے پہنا۔ پھر چولہے میں لکڑیاں ڈال کر تیل چھڑک کر آگ لگائی اور وہاں آگ تاپنے بیٹھ گیا۔ جیسے ہی وہ آگ تاپنے لگا تو اس کی نظر سامنے میز پر رکھی ہوئی تصویر پر گئی۔ ایک فریم میں بھائی اور بہن کی تصویر تھی۔ پچھلے سال جب وہ بہن کو میلہ دکھانے لے گیا تھا تو یہ تصویر ایک فوٹوگرافر سے اتروائی تھی۔

اس نے تصویر کے اس فریم کو میز پر سے اٹھایا اور اسے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں جیسے انگارے بن گئی تھیں۔ وہ دانت پر دانت جمائے جیسے غصے میں دانت پیس رہا تھا اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پھر اس نے یکبارگی تصویر کو اٹھا کر فرش پر زور سے دے مارا۔

فریم کمزور تھا۔ فرش پر گرتے ہی چاروں طرف سے کھل گیا۔ شیشہ ٹوٹ گیا' تصویر الگ ہو گئی۔ وہ تھوڑی دیر تک ادھر گھورتا رہا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر اس تصویر کو اٹھا لیا۔ چولہے کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ شعلوں کی روشنی تصویر پر پڑ رہی تھی۔ پھر اس کا ہاتھ

آہستہ آہستہ شعلوں کی طرف بڑھنے لگا۔ شعلے اب دھیمے پڑ رہے تھے لیکن ایسے بھی دھیمے نہیں تھے کہ تصویر کو جلا نہ سکتے۔ وہ تصویر آہستہ آہستہ جل رہی تھی۔ آہستہ آہستہ راکھ ہو رہی تھی۔ ایک رانی قبر میں دبی ہوئی تھی' دوسری رانی انگیٹھی میں گم ہو رہی تھی اور تیسری کوئی رانی ہو گی تو وہ اس کے دماغ کے چور خانے میں کہیں چھپی ہوئی ہو گی۔

☆======☆======☆

زمیندار حشمت علی اپنی بیٹھک میں شراب پی رہا تھا۔ اس کے سامنے اس کے دو چمچے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ حشمت علی نے اپنے ایک چمچے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "کرمو! اگر تو تین مہینے پہلے رانی کو اٹھا لاتا تو آج دل میں حسرت نہ رہ جاتی۔ وہ مر گئی اور میں اس کے لئے مرتا جا رہا ہوں۔"

کرمو نے کہا۔ "مالک! میں تو آپ کا غلام ہوں۔ ادھر آپ حکم دیتے ہیں ادھر حاضر کر دیتا ہوں مگر رانی کی بات کچھ اور تھی اس کے لئے بہت سوچ سمجھ کر منصوبہ بنانا چاہتا تھا۔ آپ جانتے ہیں صمدو کیسا ٹیڑھا آدمی ہے۔ ایک دم سے شیر ببر ہے اسے ذرا بھی شبہ ہوتا تو ہم سب کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتا۔"

حشمت علی نے دوسرے چمچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دادو کس لئے ہے؟ صمدو کو ذرا بھی شبہ ہوتا تو اپنا دادو رانی کو بردہ فروشوں کے حوالے کر دیتا۔ آج کل تو بڑا شور ہے کہ عورتیں اٹھالی جاتی ہیں۔ پھر ان کا پتہ نہیں چلتا کہ کہاں پار کر دی گئیں۔"

دادو نے کہا۔ "مالک میں نے سنا تھا کہ صمدو رانی کو شہر' رشتہ کرنے کے لئے لے گیا تھا؟"

حشمت علی نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں میں نے بھی یہی سنا تھا کہ پہلے سے رانی کا رشتہ اس کے کسی دور کے رشتہ دار سے طے ہو گیا تھا اور وہ اس کی شادی کرنے گیا تھا مگر تین مہینے تک وہاں کیا کرتا رہا۔ کچھ پتہ نہیں۔ واپس آیا تو اس کی لاش لے کر آیا۔"

دادو نے اپنی داڑھی کو کھجاتے ہوئے کہا۔ "مالک' بستی کے کسی آدمی نے رانی کی لاش نہیں دیکھی۔ میرا مطلب ہے لاش تو آنکھوں کے سامنے موجود تھی مگر میں نے بھی نہیں دیکھی۔ ہمت نہیں پڑی۔ اب سوچتا ہوں تو عجیب سا لگتا ہے۔ بس یقین نہیں آتا کہ وہ مر گئی ہے۔"

حشمت علی نے کہا۔ "ہاں آنکھوں سے لاش کو نہ دیکھو تو یقین نہیں آتا۔ میں بھی کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ وہ زندہ ہے اتنی جلدی مر نہیں سکتی۔"

کرمو نے کہا۔ "آج تک ہماری بستی میں ایسا نہیں ہوا اس کا جنازہ نہیں اٹھا' کسی نے کاندھا نہیں دیا' کسی نے اس کی لاش کو ہاتھ نہیں لگایا۔ سب دور سے تماشا دیکھتے رہے اور وہ مٹی میں دفن ہو گئی۔ سچ مچ سوچیں تو عجیب سا لگتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے صمدو نے ہم لوگوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنی بہن کو کہیں چھپا دیا ہے۔"

ایک ملازم نے اندر آ کر کہا۔ "مالک' ڈاکیہ آیا ہے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"اسے اندر بھیج دو۔"

ملازم باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ڈاکیے نے کمرے میں داخل ہو کر زمیندار کو ادب سے سلام کیا پھر خوشامدانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "حضور! آپ کے حکم کے مطابق پہلے آپ ہی کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے کہا تھا کہ بستی میں کسی کی چٹھی [illegible] تو پہلے آپ کو بتایا جائے۔"

"[illegible]وئی خاص چٹھی آئی ہے کیا؟"

"جی ہاں! صمدو کے نام شہر سے ایک خط آیا ہے۔ یہ دیکھئے۔"

[illegible] کہہ کر اس نے ایک لفافہ حشمت علی کی طرف بڑھایا۔ حشمت علی نے اسے لے [illegible] چاک کیا۔ اس نے اندر سے تہہ کیا ہوا ایک کاغذ نکالا پھر اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ لکھا تھا

"[illegible]!

[illegible] لکھا تھا کہ آپ رانی کو لے کر شہر آ رہے ہیں۔ [illegible] اگر آپ شہر آتے تو رکشہ' ٹیکسی میں [illegible] آپ فوراً لکھیں کہ اگر شہراب تک [illegible] لندن سے آنے کے بعد میں بہت مصروف ہو گیا ہوں۔ [illegible] نہیں آئیں گے تو میں وقت نکال کر آؤں گا۔ بچپن میں [illegible] برس گزر چکے ہیں' وہ کتنی بدل گئی ہو گی۔ میں اسے [illegible]۔ اگر آپ نہیں آئیں گے تو میں ضرور آ جاؤں گا۔"

فقط

آپ کا اپنا ضمیر حسن

[illegible] کے بعد زمیندار حشمت علی کے ماتھے پر شکنیں پھیل گئیں۔ اس نے جیب [illegible] ایک نوٹ نکال کر ڈاکیے کو دیتے ہوئے کہا۔ "جاؤ' موج کرو۔" زمیندار

نے خط واپس کر دیا۔

ڈاکیہ خوش ہو کر سلام کرنے کے بعد وہاں سے چلا گیا۔ کرمو نے پوچھا۔ "کیا بات ہے مالک! خط میں کیا لکھا ہے؟"

"خط میں جو کچھ لکھا ہے اس سے تو کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ صمدو اپنی بہن کو لے کر شہر گیا اور تین مہینے کے بعد واپس آیا۔ مگر اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے رشتہ دار ضمیر حسن کے پاس نہیں گیا تھا۔ پھر وہ تین مہینے تک اپنی بہن کو لے کر کہاں گیا' کہاں بھٹکتا رہا۔ اب جو واپس آیا تو بہن کی لاش اس کے ساتھ تھی۔ یہ تو کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔"

ڈاکیے کے تھیلے میں گنتی کے چند خطوط تھے۔ وہ انہیں بانٹتا ہوا صمدو کے مکان پر پہنچ گیا اور صمدو کے نام آنے والا خط اس کے حوالے کر دیا۔

"چاچا تم جانتے ہو کہ میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔ یہ خط تم ہی سنا دو۔" صمدو بولا۔

ڈاکیے نے خط پڑھ کر سنایا۔ صمدو پوری توجہ سے سن رہا تھا۔ آخر میں اس نے جیب سے دو روپے نکال کر ڈاکیے کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "چاچا' اب اس خط کا جواب بھی لکھ دو۔"

"ڈاکیے نے خوش ہو کر روپے جیب میں رکھتے ہوئے اپنے تھیلے میں سے سادہ کاغذ اور قلم نکالا' پھر بولا۔ "ہاں' تو کیا لکھوں؟"

"لکھ دو' ضمیر بھائی! ہم شہر گئے تھے مگر کیا بتائیں قسمت کو منظور نہیں تھا کہ ہم تم سے ملیں۔ وہاں رانی بہت بیمار ہو گئی تھی۔ اب میں پوری تفصیل بتا نہیں سکتا۔ بس سمجھ لو کہ موت نے اسے نگل لیا۔ میں اسے واپس بستی میں لے آیا۔ اب میرے گھر میں رانی نہیں ہے۔ تم آؤ گے تو اس کی قبر ملے گی۔ نہ آؤ تو بہتر ہے۔ اس کی قبر پر آنسو بہانے کے لئے میں اکیلا کافی ہوں۔ جب کوئی آبی پرندہ اس کی قبر پر آ کر بیٹھتا ہے تو میرے حلق سے چیخیں نکلنے لگتی ہیں۔ کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے اور میں ہزار صبر اور ضبط کے باوجود رونے لگتا ہوں۔ آہ' وہ آبی پرندوں سے کتنی محبت کرتی تھی۔ افسوس' اب میں زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ میری آنکھیں رو رہی ہیں۔ تھوڑے لکھے کو بہت سمجھو۔"

تمہارا اپنا صمد خان عرف صمدو

ڈاکیے نے خط لکھنے کے دوران سر اٹھا کر صمدو کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں نہیں رو رہی تھیں۔ اس نے جھوٹ لکھوایا تھا۔ اس کی آنکھیں تو بالکل خشک تھیں۔ چہرہ سخت

تھا جیسے اندر ہی اندر کسی جنگ میں مصروف ہو۔ خط ختم کرنے کے بعد ڈاکیے نے اپنے تھیلے میں سے ایک لفافہ نکال کر اس میں رکھا۔ پھر صمدو کے بتائے ہوئے پتے کو اس لفافے پر لکھنے لگا۔ صمدو نے کہا۔ "چاچا! تحصیل کا ڈاک خانہ اتنی دور ہے کہ تم ہی ہمارے خط لاتے ہو اور تمہی ہمارے خط لے جاتے ہو۔ یہ خط بھی رکھ لو۔ ڈاک خانے میں دے دینا۔"

واپسی پر ڈاکیے نے پھر زمیندار حشمت علی کو جا کر سلام کیا۔ "حضور! میں نے جس ضمیر حسن کا خط ابھی آپ کو دیا تھا' صمدو نے اسی کے نام ایک خط لکھوایا ہے۔ میں نے سوچا شاید یہ آپ کے کسی کام کا ہو۔ دیکھ لیں' حکم ہو گا تو لے جا کر پوسٹ کر دوں گا نہیں تو آپ کی مرضی۔"

حشمت علی نے اس خط کو کھول کر پڑھا پھر کہا۔ "ہوں' ٹھیک ہے' اس خط کو رہنے دو' پوسٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خط جب ضمیر حسن کو نہیں ملے گا اور وہ صمدو اور رانی کا انتظار کرتا رہے گا تو بے چین ہو کر ضرور ادھر آئے گا اور جب وہ ادھر آئے گا تو باتیں ہوں گی اور کھلیں گی۔ یہ سالا اپنی بیمار بہن کے ساتھ تین مہینے تک کہاں رہا۔ شہر تو بڑی مہنگی جگہ ہے۔ یہ کہاں سے کھاتا پیتا رہا۔ کہاں سوتا رہا۔ اپنے رشتہ داروں کے پاس کیوں نہیں گیا؟"

ڈاکیے نے کہا۔ "مالک! کیوں نہ ضمیر حسن کے نام ایک خط لکھ کر اسے یہاں بلایا جائے۔ [illegible] جائے گا۔"

حشمت علی نے [illegible] غور کرنے کے بعد کہا۔ "نہیں یہ بات صمدو کو معلوم ہو گی تو [illegible] کس نے خط لکھ کر ضمیر حسن کو یہاں بلایا ہے۔ جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے۔ آرام سے انتظار کرنا چاہیے۔ دیکھنا چاہیے کہ ضمیر حسن کب یہاں آتا ہے اور وہ ضرور آئے گا۔"

اور وہ آ گیا۔ رانی کی موت کے دو ماہ بعد ایک دن ایک بڑی سی سفید رنگ کی کار جب سڑک پر اچھلتی ہوئی بستی میں آئی تو مرد' عورتیں اور بچے سب کے سب گھروں سے نکل کر دیکھنے لگے۔ وہاں کبھی کوئی سرکاری پولیس آفیسر جیپ کار میں آتا تھا ورنہ موٹر کار وہاں سے گزرتی نہیں تھی۔ وہ گاڑی بستی میں ایک دو جگہ رکی پھر صمدو کے مکان کے پاس [illegible]۔

صمدو نے گھر سے نکل کر دیکھا تو کار سے ایک لمبے قد کا صحت مند نوجوان باہر آ رہا

تھا۔ اس نے صمد کو دیکھا۔ صمد نے اسے دیکھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش کھڑے رہے۔ صمد آگے بڑھ کر لکڑی کے ایک ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے آنے والے کو خوش آمدید نہیں کہا۔ سر جھکائے چپ چاپ خود اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ نوجوان آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس آیا پھر بولا۔ "صمد بھائی! مجھے بستی کے لوگوں سے معلوم ہو چکا ہے۔ میں سوچ رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی تم رو پڑو گے۔ رانی کی جدائی ایسی ہے کہ میں دل ہی دل میں اس کے لئے روتا ہوں۔ میں مرد ہوں۔ اس لئے میری آنکھ نہیں رو سکتی۔"

صمد نے ایک گہری سانس لی، لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ نوجوان نے صمد کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "کیا مجھے گھر کے اندر آنے کے لئے نہیں کہو گے؟"

صمد نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر اس کی طرف سے پلٹ کر مکان کی طرف جانے لگا۔ مکان کے برآمدے میں پہنچ کر اس نے پلٹ کر پھر نوجوان کو دیکھا، جیسے خاموش نگاہوں سے کہہ رہا ہو۔ "آ جاؤ۔"

وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ نوجوان اس کے پیچھے مکان میں داخل ہوا۔ پھر چاروں طرف کمرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں کیسے کیسے خواب دیکھتا تھا۔ رانی کی بچپن کی صورت نگاہوں کے سامنے گھومتی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ وہ بڑی ہو کر کتنی خوبصورت ہو گئی ہو گی۔ میری منگیتر ہے۔ مجھے خواب دیکھنے کا حق ہے نا؟"

صمد نے اسے گھور کر دیکھا، پھر کہا۔ "اب اس کے ساتھ تمہارے خوابوں کو بھی مر جانا چاہئے۔"

"یہی تو بات ہے صمد بھائی! آدمی مر جاتا ہے، خواب نہیں مرتے۔ رانی میرے خیالوں میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اسے کوئی نہیں مار سکے گا۔"

صمد باورچی خانے کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی باتیں سنتے ہی ایک دم سے چونک کر پلٹ گیا۔ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "جس کو مرنا ہوتا ہے مر جاتا ہے۔ تم پڑھے لکھوں جیسی باتیں مجھ جاہل کے سامنے نہ کرو۔"

"ہاں، اچھا یاد آیا صمد بھائی! آپ نے رانی کو کتنا پڑھایا تھا؟"

"نو جماعتیں پڑھ چکی تھی۔ میں نے پھر اسکول جانے سے روک دیا۔ یہاں سے بس میں بیٹھ کر تحصیل جاتی تھی اور وہاں سے شام کو واپس آتی تھی۔ جوان ہونے لگی تھی، مجھے ڈر لگتا تھا اس لئے میں نے اسے گھر میں بٹھا لیا۔ اُدھر چار برس سے پھر ضد کر رہی

تھی کہ آگے پڑھے گی۔ مگر میں نے اس کی ضد نہیں پوری کی۔"

وہ صمد کے قریب آ کر بڑی اداسی سے بولا۔ "مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ مر چکی ہے۔"

صمد ایک دم سے بھڑک کر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر غصے سے بولا۔ "کیا میں جھوٹ بولتا ہوں۔ کیا یہ بستی والے پگلے تھے؟ انہوں نے نہیں دیکھا ہے کہ میں نے اپنی بہن کی لاش کو اپنے ہاتھوں سے ان کی آنکھوں کے سامنے دریا کے کنارے دفن کیا ہے۔ خود اپنے ہاتھوں سے قبر کھودی۔ تمہیں یقین کیوں نہیں آتا؟"

"ارے صمد بھائی! تم تو ناراض ہو رہے ہو۔ خواہ مخواہ غصہ دکھا رہے ہو۔ میں تو اپنے دل کی بات کہہ رہا ہوں کہ جس سے محبت ہوتی ہے، گہرا لگاؤ ہوتا ہے، اس کے مر جانے کے بعد بھی اس کے مرجانے کا یقین نہیں ہوتا۔"

صمد پہلے تو اسے غصے سے دیکھ رہا تھا۔ پھر نرم پڑ گیا۔ آہستگی سے بولا۔ "ضمیر! میں [illegible] نہیں ہوں۔ رانی کی بات نکلتی ہے تو میرے دل میں کچھ ہونے لگتا ہے۔ [illegible] اس کی باتیں زیادہ نہ کرو۔ جاؤ، اس کے کمرے میں بیٹھو۔ میں کھانا تیار کر [illegible]"

وہ باورچی خانے کی طرف جانے لگا۔ ضمیر نے کہا۔ "صمد بھائی! رانی کی کوئی [illegible] اس کی صورت دیکھنے کے لئے بے چین ہوں۔"

"[illegible] اتنی ہی محبت ہوتی اور رشتہ کا خیال ہوتا تو دس [illegible] رانی کی کوئی تصویر نہیں ہے۔"

"صمد بھائی! [illegible] ناراض ہو جاتے ہو۔ دس برس تک اگر میں دور رہا [illegible] تو رانی کو سکھی رکھنے کے لئے ہی کر [illegible] ادھر میں اسے ہمیشہ کے لئے گم کر دوں [illegible] اس کی تصویر [illegible]"

"[illegible] اس کی کوئی تصویر نہیں ہے۔ تم پورے گھر کی تلاشی لے لو۔ اب اس کی [illegible] بھی نہیں ہے۔"

[illegible] دوسرے کمرے کی طرف جانے لگا۔ صمد باورچی خانے میں چلا گیا۔ دوسرا کمرہ رانی کے لئے مخصوص تھا۔ وہاں اس کا بستر بچھا ہوا تھا۔ میز پر کتابیں اور کاپیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر جا بجا تصویریں آویزاں تھیں اور ہر تصویر میں آبی پرندے

نظر آ رہے تھے۔ وہاں جتنا سامان رکھا ہوا تھا' سب پر گرد جمی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اس کی موت کے بعد اس کمرے کی صفائی نہیں کی گئی ہے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میز کے پاس آیا اور وہاں رکھی ہوئی کتابوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ ایک ڈائری نظر آئی۔ اس نے اس کی گرد جھاڑ کر اسے کھولا تو اس میں بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ تحریر اتنی خوبصورت تھی کہ لکھنے والے کے حسن کا پتہ چلتا تھا۔ اتفاق سے ڈائری کا وہ صفحہ کھلا تھا جس کے بعد پھر کوئی تحریر نہیں تھی۔ صفحات سادے رہ گئے تھے۔ اس آخری تحریر میں لکھا تھا۔ "آج میں بھیا کے ساتھ شہر جا رہی ہوں۔ میرا دل رہ رہ کر میرے سینے میں یوں دھڑک رہا ہے جیسے ابھی سے شہر پہنچ گیا ہو اور ضمیر کے دروازے پر دستک دے رہا ہو۔ ضمیر دروازہ کھولو۔ دیکھو' میں آ گئی ہوں۔ ان دس برسوں میں پتہ نہیں تم نے مجھے کبھی یاد کیا ہے یا نہیں مگر میں تمہیں یاد کرتے کرتے جوان ہو گئی۔ تمہاری امانت ہوں۔ خود ہی تمہارے پاس چل کر آئی ہوں۔

ہائے وہ کیسی گھڑی ہو گی جب ہمارا سامنا ہو گا۔ میں شرم سے نظریں نہیں اٹھا سکوں گی۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ حسین منظر ہو گا جب آبی پرندے ساحل پر پر تولتے ہیں اور دریا کی سطح پر سے پانی کو چھوتے ہوئے گزرتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کی یادوں کے آبی پرندے میرے دل کی سطح کو چھو کر کیسے گزرتے رہتے ہیں۔"

رانی کی تحریر ادھوری تھی۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ باقی حصہ بعد میں لکھے گی اور پھر لکھ نہیں سکی تھی۔ ضمیر نے اس صفحے پر لکھی ہوئی تاریخ دیکھی تو آج سے پانچ ماہ پہلے کی تاریخ تھی یعنی دو ماہ پہلے ضمیر نے صمدو کو خط لکھا تھا کہ وہ لوگ شہر کیوں نہیں آئے جبکہ تین ماہ پہلے آنے کی بات تھی' اس کا مطلب یہ تھا کہ پانچ ماہ پہلے صمدو رانی کو لے کر شہر گیا تھا۔

ضمیر نے ڈائری کو میز پر رکھا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے سے گزرتا ہوا باورچی خانے میں پہنچا۔ پھر اس نے کہا۔ "صمدو بھائی! تم تو رانی کو لے کر شہر گئے تھے۔ پھر مجھ سے ملاقات کیوں نہیں کی؟"

صمدو نے ہانڈی میں چمچ ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں خط میں لکھ چکا ہوں۔"

"تمہارا کوئی خط مجھے نہیں ملا۔"

"کیا بات کرتے ہو؟ میں نے ڈاکیہ چاچا سے خود اپنے سامنے خط لکھایا پھر اسے پوسٹ کرنے کے لئے دے دیا۔ تمہیں کیسے نہیں ملے گا؟"

"میں جو کہہ رہا ہوں کہ تمہارا وہ خط مجھے نہیں ملا۔ چلو اس بحث کا فائدہ بھی کیا ہے۔ اب بتاؤ کہ تم جب رانی کو شہر لے گئے تھے تو میرے پاس کیوں نہیں آئے؟"

"بس' یونہی وہ بیمار پڑ گئی تھی اور اسے بہت برا مرض ہو گیا تھا۔ میں تمہارے پاس نہیں لانا چاہتا تھا۔"

"آخر کیا مرض تھا؟"

"اسے کوڑھ ہو گیا تھا۔ میں نے شہر میں اس کا علاج کرایا لیکن وہ اچھی نہ ہو سکی اور اسی مرض میں مبتلا رہ کر مر گئی۔"

"آپ وہاں کتنے عرصے تک رہے؟ آپ اسے ہسپتال میں چھوڑ کر میرے پاس پہنچ سکتے تھے۔ آپ نے اس کا علاج کہاں کرایا تھا؟"

صمدو نے پریشان ہو کر کہا۔ "تم یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہو۔ بھئی اتنے سارے ہسپتال ہیں۔ کہیں بھی کرا لیا تھا۔"

"آخر کس ہسپتال میں' مجھے معلوم تو ہو؟"

صمدو نے تھوڑی دیر تک سوچا۔ پھر کہا۔ "وہ جو صدر کے پاس بڑا سا گرجا گھر ہے' اس کے سامنے ایک بڑا ہسپتال ہے۔"

"صمدو بھائی! وہ تو جنرل ہسپتال ہے۔ جہاں کوڑھ کا علاج نہیں ہوتا۔ پورے شہر میں صرف ایک ہسپتال ہے جہاں جذام کے مریض جاتے ہیں۔ ایسے مریضوں کو کسی دوسرے ہسپتال میں داخلے کی اجازت نہیں ملتی۔ پھر آپ رانی کو جنرل ہسپتال میں کیسے لے گئے تھے؟"

"آں۔" صمدو نے گڑبڑا کر اس کا منہ دیکھا۔ پھر جھنجھلا کر کہا۔ "تم خواہ مخواہ پولیس والوں کی طرح سوال جواب میں کیوں لگ گئے ہو۔ کیا میں اپنی بہن کا دشمن ہوں؟ ارے وہ بیمار تھی تو کہیں نہ کہیں تو علاج کرایا ہو گا۔ اب مجھے شہر کی باتیں' شہر کی عمارتیں یاد نہیں رہتیں۔ پتہ نہیں کس ہسپتال میں لے گیا تھا مگر لے گیا تھا۔ علاج کرایا تھا۔ اس کی قسمت میں موت لکھی ہوئی تھی مر گئی' اب زیادہ کچھ نہ پوچھو۔ جاؤ کمرے میں بیٹھو' میں کھانا لے کر آ رہا ہوں۔"

ضمیر نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ پھر پلٹ کر وہاں سے نکلتے ہوئے دوسرے کمرے میں آیا۔ اس کے دل میں ایک نامعلوم سا اضطراب تھا۔ وہ رانی کے متعلق اپنے دل کی بہت سی باتیں کہنا چاہتا تھا اور بہت سی باتیں اس کے متعلق سننا چاہتا تھا لیکن صمدو رہ رہ

کر غصہ دکھاتا تھا اور ضمیر اس کے تیور دیکھ کر خاموش ہو جاتا تھا مگر اندر جو ایک دھیما دھیما سا تجسس پیدا ہو گیا تھا' وہ اسے چین لینے نہیں دے رہا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد کھانے کے دوران اس نے پھر سوال کرنا شروع کیے۔ "صمدو بھائی! آپ شہر میں رانی کے ساتھ کتنے دن رہے تھے؟"

اس نے لقمہ چباتے ہوئے پوچھا۔ "آخر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو۔ بھئی وہ بیمار تھی۔ میں اس کا علاج کرا رہا تھا۔ میں اس کے لئے بہت پریشان تھا۔ اس کو مرض ایسا تھا کہ تمہارے پاس لانا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ پھر شہر میں رہنے کی پریشانیاں الگ تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے کہ کتنے دنوں تک وہاں رہا۔ بس مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے سو سال گزر گئے ہوں۔ وہ اللہ کو پیاری ہو گئی اور میں اسے لے کر آ گیا۔"

ضمیر نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔ "کچھ بھی ہو۔ اگر وہ زیر علاج تھی تو تم اسے ہسپتال میں چھوڑ کر مجھ سے ملنے آ سکتے تھے لیکن تم نے مجھے ایسا غیر سمجھا کہ میری طرف رُخ نہیں کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ سے کترانے کی وجہ کیا تھی؟"

"بس سمجھ لو کہ تم میرے دشمن ہو اور میں تم سے ملنا نہیں چاہتا تھا اور میں کیا جواب دوں۔ کہہ تو دیا کہ وہاں پریشان تھا۔ اس لئے تمہارے پاس ملنے نہیں آیا۔ اب گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ؟"

ضمیر اس کے بعد خاموش ہو گیا۔ رانی کے متعلق اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ دوپہر کو سونے کا عادی تھا۔ رانی کے کمرے میں آ کر اس نے وہاں کے سامان پر سے گرد صاف کی۔ بستر کو بھی اچھی طرح صاف کیا۔ چادر کو جھٹک کر دوبارہ بچھایا۔ پھر رانی کے بستر پر آرام سے لیٹ گیا۔ جب سو کر اٹھا تو شام ہو چکی تھی۔ چائے پینے کے بعد وہ بستی کی سیر کرنے کے لئے نکل پڑا۔ اس نے صمدو سے بھی چلنے کے لئے کہا لیکن اس نے بہانہ کر کے اسے ٹال دیا۔ وہ بالکل بدل گیا تھا۔ بہن کی موت کے بعد سب سے دور تنہا رہتا تھا۔ اتنا آدم بیزار ہو گیا تھا کہ دس برس کے بعد ضمیر سے' اپنی بہن کے منگیتر سے مل کر بھی خوش نظر نہیں آتا تھا۔ ایسا بیزار لگتا تھا جیسے اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہو۔

ضمیر اکیلے ہی بستی کی سیر کرنے نکل پڑا۔ زمیندار اور اس کے چمچے اس کی تاک میں تھے۔ یہ خبر تو دوپہر ہی سے گشت کر رہی تھی کہ شہر سے کوئی بابو بڑی سی کار میں آیا ہے۔ زمیندار حشمت علی سمجھ گیا تھا کہ ضمیر حسن ہی ہو سکتا ہے۔ انہوں نے ایک جگہ اسے

گھیر لیا۔ پھر حشمت علی نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ "میں یہاں کا زمیندار حشمت علی ہوں۔ آپ شاید شہر سے آئے ہیں اور صمدو کے مہمان ہیں؟"

"جی ہاں' میرا نام ضمیر حسن ہے۔ رانی میری منگیتر تھی۔ میں دس سال بعد یہاں آیا ہوں۔"

حشمت علی نے افسوس کا اظہار کیا۔ "پھر تو بڑے دکھ کی بات ہے کہ آپ اپنی منگیتر سے نہ مل سکے۔ بے چاری جوانی میں مر گئی۔ آپ نے تو اسے جوانی میں دیکھا ہی نہیں ہو گا؟"

ضمیر حسن نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "ہاں' بڑی حسرتیں لے کر آیا تھا۔ یہاں تو اس کی ایک تصویر بھی نہ ملی۔ صمدو بھائی کہتے ہیں کہ اس کی کوئی تصویر ہی نہیں تھی۔"

زمیندار کے چمچے کرمو نے کہا۔ "ارے واہ' تصویر کیسے نہیں تھی۔ رانی نے میری بٹی کو دکھایا تھا۔ ایک بار صمدو اسے لے کر میلے گیا تھا۔ وہاں اس نے تصویر اتروائی تھی۔ تصویر گھر میں رکھی ہوئی تھی۔ میں نے بھی اپنی آنکھوں سے وہ تصویر دیکھی ہے۔"

ضمیر حیرانی سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر رانی کی کوئی تصویر گھر میں ہے تو صمدو نے اسے کیوں نہیں دکھائی۔ رانی کی صورت اس سے کیوں چھپا رہا ہے؟

زمیندار حشمت علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ضمیر صاحب! آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں' کیا ہوا۔ اگر آپ رانی کو نہیں دیکھ سکے۔ ہم اس کا ناک نقشہ بتا دیتے ہیں۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ سات گاؤں اِدھر اور سات گاؤں اُدھر کوئی اس کے مقابلے کی حسین لڑکی نہیں تھی۔ وہ حسین بھی تھی اور ذہین بھی۔ اسکول پڑھنے جاتی تھی اور بڑے اچھے نمبروں سے پاس ہوتی تھی۔ سب سے ہنستی بولتی تھی۔ بستی کے سبھی لوگ اس سے پیار کرتے تھے۔"

ضمیر نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "افسوس' اتنی حسین لڑکی کوڑھ کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ آپ لوگوں نے تو دیکھا ہو گا مرنے کے بعد اس کا چہرہ کیسا لگ رہا تھا؟"

زمیندار حشمت علی نے اپنے کانوں کو چھو کر کہا۔ "توبہ' توبہ مرنے کے بعد تو کوئی اس کی لاش کے قریب نہیں گیا۔ اسے تو کوڑھ ہو گیا تھا۔ کون قریب جا سکتا تھا۔ ہم نے دور ہی سے دیکھا۔ اس کی لاش پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ہم ہٹ دور کھڑے رہے اور صمدو خود ہی قبر کھود کر اسے دفن کرتا رہا۔"

ضمیر کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے زمیندار حشمت

علی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا رانی کی لاش چادر یا کسی کپڑے سے ڈھانپ کر نہیں رکھی گئی تھی؟"

"ہاں، وہ ایک چادر میں چھپی ہوئی تھی۔"

تب ضمیر نے دل ہی دل میں سوچا۔ اگر چادر میں چھپی ہوئی تھی تو مکھیاں کیوں لگ رہی تھیں۔ زخم کھلا ہو تو مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔ پٹیاں باندھ دی جائیں یا چادر میں چھپا دیا جائے تو شہر سے یہاں تک آنے کا فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ کھلی فضا میں مکھیاں اتنی دور تک چادر پر بیٹھ کر نہیں سکتیں۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ شہر سے پیچھے لگنے والی مکھیاں راستے ہی میں رہ گئی ہوں اور راستے میں دوسری مکھیوں نے ان کی جگہ لے لی ہو۔ دوسری مکھیاں اس چادر پر کیوں بیٹھیں گی جبکہ زخم نظر نہیں آتا تھا۔ ضمیر نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ شاید زخم کا مواد اور غلاظت بھری کشش ایسی ہو جو چادر کے نیچے بھی مکھیوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔

وہ زمیندار وغیرہ سے کچھ دیر تک گفتگو کرتا رہا اور اس کا ذہن دوسری طرف الجھتا رہا۔ پھر وہ ان سے رخصت ہو کر دریا کے کنارے سیر کرنے کی غرض سے چل پڑا۔

کنارے کنارے چلتے ہوئے وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں رانی کی قبر بنی ہوئی تھی۔ وہ قبر بستی سے تقریباً ایک، ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہو گی۔ وہاں قبر کے سرہانے ایک کھردرے سے پتھر پر رانی کا ٹیڑھا میڑھا سا نام لکھا ہوا تھا۔ صمدو نے شاید کسی سے یہ نام لکھوا لیا تھا۔ اس بات کی شناخت ہو گئی کہ وہ رانی کی قبر ہے۔

ضمیر وہاں سر جھکائے، دونوں ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔ دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے رانی کے لیے دعائیں مانگتا رہا۔ نظریں جھکائے دعائیں مانگتے وقت اس کی نظر قبر کے آس پاس تھی۔ اس نے دیکھا چیونٹیوں کی ایک بڑی سی قطار رینگتے ہوئے قبر کے اندر سوراخ بنا کر جا رہی تھی۔ وہ سوراخ کافی بڑا تھا اور کتنے ہی چیونٹے اندر جا رہے تھے اور باہر آ رہے تھے۔ پہلے تو ضمیر نے زیادہ توجہ نہیں کی۔ پھر اچانک ہی اسے مکھیاں یاد آئیں۔ جب لاش دفن نہیں ہوئی تھی، تو مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور دفن ہونے کے بعد چیونٹے اس لاش کی طرف جا رہے تھے۔ آخر اس کا کیا مطلب تھا۔ یہ کیا ماجرا تھا؟

وہ تیزی سے پلٹ کر اس بستی کی طرف جانے لگا۔ وہ چل رہا تھا۔ کبھی دوڑ رہا تھا اور کبھی چل رہا تھا۔ ہانپتا جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ پھر وہ اپنی کار کے پاس پہنچ گیا۔ صمدو مکان کے باہر برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ضمیر کو کار میں بیٹھتے

ہوئے دیکھ کر اس نے چیختے ہوئے پوچھا۔ "ضمیر! کہاں جا رہے ہو؟"

ضمیر نے کار کے اندر سے چیخ کر جواب دیا۔ "میں تحصیل جا رہا ہوں۔ اب کل صبح واپس آؤں گا۔ مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔"

اس نے جواب سنے بغیر گاڑی اسٹارٹ کی پھر اسے موڑ کر تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس وقت شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا ایک گھنٹے کے اندر تحصیل کے علاقے میں پہنچ گیا۔ وہاں کے ڈاک خانے میں پہنچتے ہی اس نے شہر کے ایک ڈاکٹر رئیس احمد کے نام کال بک کرائی۔ وہ جذام کا بہت مشہور ڈاکٹر تھا اور وہی شہر میں ایسے مریضوں کا علاج کرتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی رابطہ قائم ہو گیا۔ ضمیر نے ریسیور کان سے لگا کر ماؤتھ پیس پر بلند آواز سے کہا۔ "ہیلو، رئیس! میں ضمیر حسن بول رہا ہوں۔ شکر ہے کہ تم اس وقت ہسپتال میں ہو۔ تم سے ایک بہت ضروری کام ہے۔"

رئیس نے دوسری طرف سے پوچھا۔ "یہ تم تحصیل صدیق آباد میں کیسے پہنچ گئے، کیا بات ہے؟"

"میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اپنا ریکارڈ دیکھ کر مجھے ابھی بتاؤ کہ پانچ ماہ پہلے کوئی ایسی مریضہ تمہارے پاس آئی جس کا نام رابعہ عرف رانی ہے اور اس کے بھائی یا سرپرست کا نام صمد خان عرف صمدو ہے؟"

"یہ تم اتنی دور سے کیا بکواس کر رہے ہو۔ میں پانچ مہینے پہلے کا ریکارڈ دیکھنے یہاں بیٹھا ہوں، اور مریضوں کو چھوڑ دوں؟"

"تم اپنے کسی آدمی سے کہو کہ وہ پانچ ماہ پہلے کے ریکارڈ کی چھان بین کرے۔ مئی جون اور جولائی میں آنے والے مریضوں کا ریکارڈ ضرور دیکھے۔ شاید اس میں رابعہ عرف رانی کا نام نظر آ جائے۔ میں یہاں ڈاک خانے میں بیٹھا ہوا ہوں۔ ابھی آدھے گھنٹے بعد دوبارہ فون کروں گا۔ یہ کام ضرور ہونا چاہیے۔"

یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ دوسری بار پھر کال بک کرائی اور تاکید کر دی کہ آدھے گھنٹے بعد رابطہ قائم کیا جائے۔ بہرحال آدھے گھنٹے بعد پھر رابطہ قائم ہوا۔

دوسری طرف سے رئیس احمد نے کہا۔ "ہم نے سارے ریکارڈ دیکھ لئے ہیں۔ خصوصاً مئی، جون، جولائی کی فائلیں دیکھی ہیں۔ رابعہ عرف رانی نام کی کوئی مریضہ ہمارے ہسپتال میں نہیں آئی تھی اور تم جانتے ہو کہ اتنے بڑے شہر میں جذام کا یہی ایک ہسپتال

ہے۔"

ضمیر نے ڈاکٹر رئیس احمد کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ریسیور رکھ دیا۔ اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ بجنے والے تھے دکانیں بند ہو رہی تھیں۔ وہ فوراً ہی کار میں بیٹھ کر بازار پہنچا۔ وہاں اس نے ایک کدال اور ایک بیلچہ خرید کر ڈکی میں رکھا۔ ایک دکان سے ٹارچ خریدی' پھر وہاں سے دوبارہ بستی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب اسے جلدی نہیں تھی۔ وہ آدھی رات کے بعد بستی میں پہنچنا چاہتا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر اس نے گاڑی روک دی۔ وہاں ایک ہوٹل میں تھوڑا سا کچھ کھایا۔ چائے پی پھر آرام سے دوبارہ سفر شروع کیا۔ جب وہ بستی میں پہنچا تو آدھی رات ہو چکی تھی۔ سارے لوگ سو چکے تھے۔ بالکل قبرستان کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ بستی سے ذرا دور تک دریا کے کنارے کنارے گاڑی کو اونچے نیچے راستے پر ڈرائیو کرتا ہوا لے جا رہا تھا۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ بستی والوں کو اس کی آمد کی خبر نہ ہو۔

آخر وہ قبر کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے گاڑی روک دی۔ ٹارچ کو روشن کر کے گاڑی کے اوپر اس طرح رکھا کہ اس کی روشنی قبر کی طرف جانے لگی۔ وہ ہیڈ لائٹس کو بھی روشن کر سکتا تھا لیکن اس کی روشنی بہت دور تک پھیلتی تھی۔ بستی کا کوئی بھی آدمی ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے سے اس روشنی کو دیکھ سکتا تھا۔ ٹارچ کی روشنی مختصر ہوتی ہے اور اس روشنی میں وہ بہ آسانی اپنا کام کر سکتا تھا۔

اس نے ڈکی سے بیلچہ اور کدال نکالی' پھر قبر کو کھودنا شروع کیا۔ قبر کے اس حصے میں وہ سوراخ موجود تھا جہاں سے چیونٹے گزر کر اندر جاتے تھے اور اندر سے باہر آتے تھے۔ اب بھی کچھ چیونٹے دکھائی دے رہے تھے۔ دریا کی ساحلی مٹی نرم تھی۔ کدال کی ضرب نہیں پڑ رہی تھی۔ وہ بیلچے سے مٹی کو کھود کر اٹھا اٹھا کر ایک طرف پھینک رہا تھا۔

کام کرنے کے دوران اچانک ہی اس کے ہاتھ رک گئے۔ رات کے سناٹے میں اور ٹارچ کی روشنی سے پرے گہری تاریکی میں کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ وہ کان لگا کر سننے لگا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا پھر اس نے آگے بڑھ کر گاڑی کے اوپر رکھی ہوئی ٹارچ اٹھائی اور آواز کی سمت روشنی پھینکتے ہوئے دیکھا۔ ایک گیدڑ تھا۔ ٹارچ کی روشنی پڑتے ہی وہ بدک کر بھاگنے لگا۔

ضمیر نے اطمینان کی سانس لی۔ پھر روشنی کا رخ قبر کی طرف کرتے ہوئے ٹارچ کو گاڑی کے اوپر رکھ دیا۔ دوبارہ قبر کے پاس آ کر اوپر کی مٹی بیلچے سے ہٹانے لگا۔ اکتوبر کا

مہینہ تھا۔ دن کو گرمی ہوتی تھی اور رات کو سردی محسوس ہونے لگتی تھی۔ سردی کے باوجود وہ اب پسینے میں نہا رہا تھا۔ کبھی اس نے مٹی نہیں کھودی تھی۔ کدال نہیں چلائی تھی۔ بیلچے سے کام نہیں لیا تھا۔ اب محنت اور مشقت کے باعث پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

اوپر کی مٹی ہٹ گئی۔ اب لکڑی کے وہ تختے نظر آ رہے تھے جو بیل گاڑی کے پچھلے حصے سے توڑ کر لگائے گئے تھے۔ وہ ان تختوں کو ہٹانے سے پہلے گاڑی کے پاس گیا۔ پھر وہاں سے ٹارچ اٹھا کر لے آیا۔ وہ دھیرے دھیرے ہانپ رہا تھا۔ اب ایسے مرحلے میں پہنچ گیا تھا جہاں کمزور دل کے لوگ دہشت سے تھرتھرانے لگتے ہیں۔ اس کے دل و دماغ پر دہشت نہیں تھی۔ تجسس تھا۔ اس کا دماغ پوچھ رہا تھا کہ اب اسے قبر میں کیا نظر آئے گا۔ کیا رانی کی صورت دکھائی دے گی۔ دو مہینے میں وہ صورت برقرار رہی ہو گی یا قبر کے عذاب نے اس کے چہرے کے گوشت کو نوچ کھسوٹ کر صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیا ہو گا؟

اس نے ٹارچ کی روشنی قبر کے سپاٹ حصے میں ڈالی۔ لکڑی کے ٹکڑے ایک دوسرے سے ملے ہوئے چادر کی طرح قبر پر بچھے ہوئے تھے۔ ان لکڑیوں کی چادر کے نیچے قبر کی تہہ میں رانی سو رہی تھی۔ گہری نیند میں ہو گی۔ تختے کو ہٹایا جائے گا تو اس کی آنکھ کھل جائے گی۔ وہ کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ سوچ رہا تھا قبر کا منہ کھلے گا تو رانی ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ جائے گی۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے گی۔ دس برس کے بعد اب مجھے ملنے آئے ہو۔

وہ کان لگا کر کچھ سننے لگا۔ آواز ایسے آ رہی تھی جیسے قبر کے اندر کوئی سانس لے رہا ہو۔ وہ قبر کی طرف ہی کان لگا کر غور سے سننے لگا۔ نہیں قبر کے اندر نہیں قبر کے باہر آواز تھی۔ سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا گزر رہی تھی۔ وقت سانس لے رہا تھا۔

قبر موت کا گھر ہے۔ ضمیر اس گھر کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے ایک سرے کے تختے کو ہٹا دیا۔ ایک تختے کے ہٹنے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ نظر نہیں آ سکتا تھا۔ ٹارچ کی روشنی قبر کی ایک سرے والی دیوار پر گئی تھی۔ صرف مٹی کی دیوار نظر آ رہی تھی۔

اس نے دوسرے تختے کو ہٹایا۔ اب ٹارچ کی روشنی قبر کی تہہ کی طرف گئی۔ پھر بھی منظر واضح نہ ہو سکا۔ اس نے تیسرے تختے کو ہٹایا۔ پھر روشنی قبر کی تہہ میں پہنچ گئی۔

جو کچھ اس نے دیکھا اسے دیکھنے کے بعد اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ آنکھیں

سوچنے لگیں کہ جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ ہے کیا؟ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے چوتھے تختے کو ہٹا کر ایک طرف پھینکا۔ پھر پانچویں اور چھٹے تختے کو ہٹایا۔ اس طرح قبر کھلتی چلی گئی۔ منظر واضح ہوتا گیا۔

ٹارچ کی روشنی بتا رہی تھی کہ وہاں یقیناً لاش پڑی ہوئی ہے لیکن کیسی لاش تھی کہ اس کا کفن بالکل سیاہ تھا۔ کیا رانی کو کالے کفن میں لپیٹ کر قبر میں سلایا گیا تھا؟ ضمیر قبر کے سرے پر گھٹنے ٹیکے بیٹھا ہوا تھا۔ اوپر سے جھانک کر نیچے تہہ میں دیکھ رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی جو دکھا رہی تھی وہی سمجھ میں آ رہا تھا۔ پھر اس نے ذرا غور کیا تو پتہ چلا کہ کفن آہستہ آہستہ سرسرا رہا ہے۔ ہل رہا ہے۔ سر سے پاؤں تک اُس میں کہیں کہیں لہریں پیدا ہو رہی ہیں۔ پہلے وہ کفن ساکت تھا۔ کوئی حرکت نہیں تھی۔ اب لگ رہا تھا کہ وہ کفن بیدار ہو رہا ہے۔ آہستہ آہستہ انگڑائی لے رہا ہے۔ تب ہی اسے آواز آئی۔ "ضمیر!"

وہ ایک دم سے چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر آواز آئی۔ "ذلیل' کتے' میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اس آواز کے ساتھ ہی ضمیر نے ٹارچ کی رشنی دوسری طرف پھینک دی۔ اس روشنی میں دور صدو نظر آیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں لاٹھی پکڑے دوڑتا ہوا اس پر حملہ کرنے آ رہا تھا۔ ضمیر نے فوراً ہی ٹارچ اس کی طرف اچھال دی۔ صدو کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ صحیح نشانے پر حملہ نہ کر سکا۔ اتنی دیر میں ضمیر لڑھکتا ہوا دوسری طرف گیا۔ وہاں بیلچہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی بیلچہ اٹھا لیا۔

"صدو بھائی! تم نے مجھے رانی کی تصویر نہیں دکھائی۔ میں اس کی لاش دیکھنے آ گیا۔ اب بتاؤ۔ کیا تم نے اسے کالا کفن پہنایا تھا؟"

"کمینے' کالا کفن تو میں تجھے پہناؤں گا۔"

یہ کہتے ہی اس نے لاٹھی سے حملہ کیا۔ ضمیر نے بیلچہ سے اس حملے کو روکتے ہوئے کہا۔ "پاگل نہ بنو۔ میں نے قبر کو جس طرح کھولا ہے اسی طرح بند کر دوں گا۔ مجھے دیکھ لینے دو۔"

"نہیں دیکھنے دوں گا۔ تمہاری آنکھیں پھوڑ دوں گا۔ تمہیں بھی اسی قبر میں دفن کر دوں گا۔"

وہ ایسا کہتے ہوئے لاٹھی سے حملے کرتا جا رہا تھا۔ ضمیر اس کے حملے کو بیلچے سے روکتے ہوئے اور پیچھے ہٹتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "دیکھو صدو بھائی! مجھ پر حملہ مت کرو نہیں تو میں

جوابی حملے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ اطمینان سے باتیں کرو۔ میں تمہیں سمجھاؤں گا کہ اس قبر کو میں نے کیوں کھودا ہے۔"

"تم شیطان کے بچے ہو۔ تمہیں ایک مسلمان کنواری لڑکی کی قبر دوبارہ کھولنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ تم نے کس سے اجازت لی تھی؟"

باتیں جاری تھیں' حملے بھی جاری تھے۔ اب صدو پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اب ضمیر حملے کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "پہلے میری بات سنو کہ میں نے ایسا کیوں کیا ہے۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ رانی کو کوڑھ کا مرض نہیں ہوا تھا۔ تم نے بستی والوں سے اور مجھ سے جھوٹ کہا ہے۔"

پہلے وہ لڑتے ہوئے قبر سے دور چلے گئے تھے۔ پھر صدو پیچھے ہٹنے لگا تو وہ پھر قبر کے پاس پہنچ گئے۔ ضمیر کا آخری حملہ بڑا زبردست تھا۔ صدو کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ کر دور چلی گئی لیکن اس پر جنون سوار تھا۔ وہ غصے میں ایسے تلملا رہا تھا کہ ضمیر کے ہاتھ میں بیلچہ کو دیکھنے کے باوجود پاگلوں کی طرح اس پر جھپٹ رہا تھا۔ اب ضمیر اس کا جانی دشمن تو نہیں تھا کہ بیلچے سے زخمی کر دیتا۔ وہ رانی کے حوالے سے صدو کی بہت عزت کرتا تھا۔ مجبوراً اس نے بھی بیلچہ کو ایک طرف پھینک دیا۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے پر حملے کرنے لگے۔ ضمیر کی کوشش یہی تھی کہ وہ حملوں کو روکے اور جوابی حملہ نہ کرے۔ مگر اسے دور ہٹانے کے لئے حملہ کرنا ہی پڑتا تھا۔ پھر وہ دونوں زمین پر گر پڑے۔ کبھی صدو اس پر چڑھ بیٹھتا تھا۔ کبھی ضمیر اسے نیچے گرا کر خود اس پر آ جاتا تھا۔ اسی طرح وہ لڑھکتے ہوئے قبر کے کنارے آ گئے۔

اب صدو اس پر غالب آ گیا تھا۔ اس کے اوپر چڑھ بیٹھنے کے بعد اس کا گلا گھونٹتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "ضمیر! میں تمہیں آخری بار سمجھا رہا ہوں۔ اپنی گاڑی میں بیٹھو اور چپ چاپ شہر چلے جاؤ۔ پھر کبھی ادھر کا رُخ نہ کرنا۔ میں ابھی اس قبر کو برابر کر دوں گا۔ کل صبح بستی کے لوگ یہ نہیں سمجھ پائیں گے کہ اسے کسی نے کھودنے کی کوشش کی تھی۔ کیا تم یہاں سے جاؤ گے؟"

جواب میں ضمیر نے اس کے منہ پر ایک گھونسہ رسید کیا۔ نیچے سے تڑپ کر اسے اپنے ساتھ زمین پر گرا لیا۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے اور ایک دوسرے پر چڑھ بیٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کوشش میں وہ زمین پر لڑھکنے لگے۔ وہ پہلے ہی قبر کے کنارے تھے۔ اچانک دونوں کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ وہ لڑھکتے ہوئے قبر کے

اندر لاش کے اوپر جا گرے تھے۔

ضمیر کو ہوش تھا کہ وہ کہاں آ گرا ہے مگر صمدو ہوش سے بیگانہ تھا۔ وہ وہاں پہنچ کر بھی اس سے لپٹا ہوا تھا۔ اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ گالیاں دے رہا تھا اور اس پر حملے کر رہا تھا۔ وہ اپنے پاگل پن سے باز نہیں آ سکتا تھا۔ ضمیر کو اسی قبر میں ہمیشہ کے لئے سلا کر دم لینا چاہتا تھا۔

پھر ایکبارگی ان پر قبر کا عذاب نازل ہونے لگا۔ ایکبارگی یوں لگا جیسے کتنی ہی بلائیں ان سے چمٹ گئی ہوں۔ صمدو اور ضمیر ایک دوسرے سے آپ ہی آپ الگ ہو گئے اور اپنے بدن کو دونوں ہاتھوں سے اِدھر اُدھر جھٹکنے لگے۔ کراہنے لگے اور قبر سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کوشش میں وہ ایک دوسرے سے ٹکرائے، پھر گرے۔ اٹھے مگر ٹارچ کی روشنی دوسری طرف تھی۔ قبر میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اٹھنے کے باوجود انہیں نکلنے کا راستہ سجھائی نہیں دیا۔ حالانکہ راستہ نہایت آسان تھا مگر ان پر بدحواسی طاری تھی۔ بلائیں انہیں نوچ رہی تھیں کاٹ رہی تھیں اور ان کے جسم میں انگارے جیسی جلن پیدا کر رہی تھیں۔

پہلے ضمیر کسی طرح تڑپ کر قبر سے باہر آیا۔ زمین پر لوٹ لگاتا ہوا اپنے ہاتھ پاؤں اِدھر اُدھر جھٹکتا ہوا ٹارچ کے پاس پہنچا۔ پھر اس کی روشنی میں اپنے آپ کو دیکھا تو کتنے ہی کالے چیونٹے اسے اپنے بدن پر رینگتے ہوئے نظر آئے۔ تب معلوم ہوا کہ رانی کی لاش کالے کفن میں لپٹی ہوئی نہیں تھی، وہ کالے چیونٹے تھے جو سر سے پاؤں تک اس پر چھائے ہوئے تھے۔ پہلے وہ ساکت تھے۔ شاید سو رہے تھے یا بے حس و حرکت اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر ٹارچ کی روشنی پڑنے لگی تو ان میں بے چینی پیدا ہوئی۔ وہ حرکت کرنے لگے تو رات کے وقت قبر کو کھولنے کے بعد جو ذہن کے کسی گوشے میں ہلکی سی دہشت چھپی ہوئی تھی اس نے یہی سمجھا کہ پہلے جو کفن ساکت تھا، وہ حرکت کرنے لگا ہے، لہریں لینے لگا ہے حالانکہ وہ چیونٹے حرکت کر رہے تھے۔

اس نے کسی طرح تمام چیونٹوں کو اپنے جسم سے جھٹک کر الگ کیا۔ پھر ٹارچ کو لے کر قبر کے پاس آیا جہاں صمدو ابھی تک بیٹھا ہوا تھا۔ قبر سے نکل نہیں رہا تھا۔ چیونٹے اس کے بدن پر رینگ رہے تھے۔ اسے یقیناً کاٹ رہے تھے لیکن وہ بڑی لذت سے آہ، آہ کرتا جا رہا تھا اور منہ کھولے، دیدے پھیلائے قبر کے باہر کھڑے ہوئے ضمیر کو تک رہا تھا۔ ضمیر نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "صمدو بھائی! باہر آؤ۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

صمدو نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں، یہاں بڑا مزہ آ رہا ہے۔ میں یہیں مر جاؤں گا۔ اس کے بعد تم اس قبر کو ڈھانپ کر چلے جانا۔ میری عزت رہ جائے گی۔"

"بکواس مت کرو۔ میرا ہاتھ پکڑو اور باہر آؤ۔"

"میں نہیں آؤں گا۔"

ضمیر نے جھک کر ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس کے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ پھر اپنی طرف کھینچا۔ صمدو اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر جھٹکنے لگا۔ ضمیر نے ٹارچ کو ایک طرف پھینکا پھر صمدو کے ہاتھوں کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ بڑی محنت کرنی پڑی وہ بھاری بھرکم تھا اسے کسی طرح کھینچتا ہوا وہ قبر کے باہر نکال لایا پھر اس کے بدن سے چیونٹوں کو جھٹکنے لگا۔

صمدو اب ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ نہ کچھ بول رہا تھا نہ حرکت کر رہا تھا۔ ضمیر ٹارچ کی روشنی میں اس کے بدن سے کبھی چیونٹوں کو الگ کرتا تھا۔ پھر اسے گھسیٹ کر دور لے جاتا تھا تاکہ جو چیونٹے اس کے بدن سے الگ ہو گئے ہیں، وہ دوبارہ اس پر حملہ نہ کریں۔

جب اسے یقین ہو گیا کہ چیونٹے اب صمدو تک نہیں پہنچ سکیں گے تو وہ ٹارچ لے کر تیزی سے چلتا ہوا قبر کے پاس پہنچا۔ روشنی کو قبر کی تہہ میں پہنچایا۔ اب چیونٹے اس لاش پر منتشر ہو گئے تھے۔ ان کا کالا کفن ہٹ گیا تھا۔ اس لئے وہ نظر آ رہی تھی، مگر وہ رانی نہیں تھی۔ وہ کوئی انسانی لاش بھی نہیں تھی۔ کپڑے کا ایک قد آور پتلا تھا۔ چیونٹوں نے اسے جگہ جگہ سے نوچ کر، کاٹ کر ادھیڑ ڈالا تھا، اور اس کے اندر سے روئی اور پتھر کے ٹکڑے جھانک رہے تھے۔

وہ چند لمحوں تک گم صم کھڑا قبر کی تہہ میں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ٹارچ کی روشنی دور زمین پر پڑے ہوئے صمدو پر پھینکی۔ وہ اسی طرح زمین پر چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ ضمیر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے قریب جانے لگا۔ رات کے سناٹے میں سسکیوں کی آواز اُبھر رہی تھی۔ صمدو آہستہ آہستہ رو رہا تھا۔ پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے سر اٹھا کر ایک بار ضمیر کو دیکھا۔ پھر دونوں گھٹنوں میں منہ چھپا کر ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔

وہ رو رہا تھا اور منہ چھپا رہا تھا۔ ضمیر نے ٹارچ بجھا دی اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ مگر صمدو کا منہ چھپ گیا۔ اب وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ضمیر اس کے قریب آیا۔ پھر اس کے رو برو دو زانو ہو کر بیٹھتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ پھر آہستگی سے پوچھا۔

"رانی کہاں ہے؟"

وہ انکار میں سرہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے نہیں معلوم۔ میں نہیں جانتا۔ جب بہن جوان ہو' کنواری ہو اور مصیبت یہ کہ بے حد حسین بھی ہو تو بھائی کی غیرت کو اس کا حسن للکارتا رہتا ہے۔ میں کبھی پوری نیند نہیں سوتا تھا۔ رات کو چونک چونک کر اٹھ بیٹھتا تھا۔ ہر لمحے یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کوئی چور میرے گھر میں گھس آ رہا ہے۔ میں نے رانی کو نو جماعت کے بعد گھر میں بٹھا دیا۔ ہمیشہ یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ میری بہن اتنی حسین ہے۔ اگر کسی نے اغوا کر لیا اور وہ گھر لوٹ کر نہ آئی تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ سب جانتے ہیں کہ میں کتنا ضدی آدمی ہوں' اپنی عزت اور غیرت کے لئے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں اور دشمن کی جان لے بھی سکتا ہوں۔"

"میں پوچھتا ہوں' رانی کہاں ہے۔ وہ تمہارے ساتھ شہر گئی تھی؟"

"ہاں گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ تمہاری امانت ہے تم سے ایک بار اسے ملاؤں گا' پھر شادی کی تاریخ مقرر کروں گا۔ میں اسے بیل گاڑی میں بٹھا کر لے گیا۔ تم جانتے ہو کہ بیل گاڑی میں ایک دن' ایک رات کا سفر ہے۔ جب میں شہر میں پہنچا تو پولیس والے بیل گاڑی کو روکنے لگے۔ وہاں کتنی ہی سڑکیں ایسی ہیں جہاں بیل گاڑی' گھوڑا گاڑی اور دوسرے ٹھیلے والوں کو سڑک پر چلنے کی اجازت نہیں ملتی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کس راستے پر بیل گاڑی کو چلاتے ہوئے تمہارے پتے پر پہنچنا ہو گا۔ دن بھر پولیس والوں سے دھکے کھانے کے بعد شام ہو چلی تھی۔ میں شہر کی ایک مضافاتی بستی میں رات گزارنے کے لئے ٹھہر گیا۔"

ضمیر نے کہا۔ "یہاں سے جاتے وقت شہر کی جو پہلی آبادی آتی ہے اس کا نام چمن گوٹھ ہے۔"

صمدو نے اثبات میں سرہلا کر کہا۔ "ہاں' ہم چمن گوٹھ میں ٹھہر گئے تھے مگر وہاں میں نے دیکھا کہ لوگ آتے جاتے میری بہن کو دیکھ رہے تھے۔ وہ گاڑی کے پچھلے حصے میں گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر گھونگھٹ کے باوجود خوبصورتی چھپتی نہیں ہے۔ کچھ بدمعاش بھی اِدھر اُدھر بیٹھ کر اڈے بازی کرنے لگے۔ طرح طرح کی آوازیں کسنے لگے۔ میں ہر ایک کے منہ نہیں لگ سکتا تھا۔ بیل گاڑی کو وہاں سے ہانکتے ہوئے تھانے کے سامنے لے آیا۔" وہ ذرا توقف کے بعد ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "میرے پاس اس وقت لاکھوں روپے ہوتے تو میں کسی بینک میں رکھ دیتا۔ دولت محفوظ ہو جاتی ہے لیکن جوان

بہنوں اور بیٹیوں کو کسی بینک میں نہیں رکھا جا سکتا۔ پولیس' تھانے والے ہی ان کی حفاظت کر سکتے ہیں۔" یہ کہتے ہی صمدو نے پھر دونوں ہاتھوں سے مُنہ کو چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ضمیر نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "صمدو بھائی رونے سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے ساری باتیں سچ سچ بتا دو۔ شاید میں رانی کو کہیں سے تلاش کر کے لے آؤں۔"

وہ انکار میں سرہلا کر بولا۔ "نہیں' اب رانی زندہ ہو گی تب بھی وہ یہاں نہیں آ سکتی۔ میں یہاں اسے نہیں آنے دوں گا۔ میں نے اسے مار ڈالا ہے۔ اس کی قبر بنا دی ہے۔ اب وہ گاؤں والوں کے لئے' میرے لئے مر چکی ہے۔ اگر کسی کو بھی یہ ذرا سا علم ہوا کہ وہ زندہ ہے تو میری غیرت مر جائے گی۔ جب تک اس کی یہ قبر یہاں رہے گی اس وقت تک میری غیرت زندہ اور قائم رہے گی۔"

ضمیر نے کہا۔ "مگر رانی کو ہوا کیا۔ وہ کہاں چلی گئی؟"

وہ انکار میں سرہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ وہ بڑی شرمیلی' بڑی حیا والی تھی۔ ایک بھائی کی شرم کو بھی سمجھتی تھی۔ وہ خود کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ تھانیدار اکرم علی نے کہا تھا کہ ہم تھانے کے احاطے میں بیل گاڑی کو رکھ کر وہیں رات گزار لیں۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ جو محافظ ہوتے ہیں وہی لٹیرے ہوتے ہیں یا جہاں حفاظتی انتظامات کئے جاتے ہیں وہاں پر بھی لٹیرے اپنا کام دکھا جاتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ کوئی باہر سے آ کر میری بہن کو اٹھا لے گیا تھا یا خود تھانے کے محافظوں نے ایسا کیا تھا۔ آدھی رات کے بعد اچانک ہی میری آنکھ کھلی' تو یوں لگا جیسے کتنے ہی لوگ مجھ پر پل پڑے ہوں اور میرے منہ پر ایک ایسا کپڑا رکھے ہوئے ہیں جس کے باعث میرا سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ عجیب سی بو تھی۔ ذرا سی دیر میں میں ہوش سے بے گانہ ہو گیا۔ پھر جیسے میں مر گیا۔"

ضمیر نے کہا۔ "ہوں' تو رانی کو اغوا کیا گیا ہے۔ تم نے تھانیدار سے فریاد کی ہو گی؟"

"ہاں' جب مجھے ہوش آیا تو میں چیخنے چلانے لگا۔ اِدھر سے اُدھر دوڑتے ہوئے رانی کو پوچھنے لگا مگر تھانے والے لاعلمی ظاہر کر رہے تھے۔ دو سپاہی پکڑ کر مجھے تھانیدار اکرم علی کے سامنے لے گئے۔ اس نے پوچھا۔ "کیوں شور مچا رہے ہو۔ کیا ہمیں بدنام کرنا چاہتے ہو کہ یہاں تھانے کے احاطے میں رہ کر لٹ گئے؟"

میں نے کہا۔ "تھانیدار صاحب! بدنام کرنے کی بات نہیں' میں تو سچ مچ لٹ گیا

ہوں۔"

"دیکھو، تم یہاں رپورٹ لکھوا دو۔ رپورٹ یہ ہونی چاہئے کہ تم اپنے گاؤں سے یہاں شہر آئے تھے۔ راستے میں تمہاری بہن کو چند بدمعاش اٹھا کر لے گئے اور تم یہاں تھانے میں آکر رپورٹ درج کرا رہے ہو۔"

"تھانیدار صاحب! یہ تو سراسر جھوٹ ہے۔ مجھے راستے میں کسی نے نہیں لوٹا۔ آپ کے دروازے پر لوٹا گیا ہوں۔"

تھانیدار اکرم علی نے غصے سے اپنی چھڑی کو میز پر زور سے مارا۔ ایک تڑاخ کی آواز اُبھری۔ اس کے ساتھ ہی وہ گرج کر بولا۔ "ابے گدھے کے بچے! کیا تو مجھے بدنام کرنا چاہتا ہے کہ یہاں سے تیری بہن اٹھالی گئی ہے اور ہم سب تماشا دیکھتے رہے ہیں۔ تجھے نہیں معلوم کہ میں رات کو ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ یہاں چھوٹی سی بستی ہے۔ صرف دو سپاہی تھے اور دونوں ہی غلطی سے سو گئے تھے۔ اب ہم ان کے خلاف رپورٹ لکھ سکتے ہیں؟ ان کو سزا دلا سکتے ہیں، مگر ان کو سزا دلانے سے تیری بہن تو واپس نہیں مل جائے گی۔ تو ہمارے ساتھ تعاون کرے گا، ہماری بات مانے گا، ہمارے کہنے کے مطابق رپورٹ لکھائے گا تو ہم تن من دھن سے تیری بہن کو تلاش کریں گے۔ تمام بدمعاشوں کو پکڑ پکڑ کر معلوم کریں گے کہ کس نے یہ بدمعاشی کی ہے۔ اگر تو نہیں چاہتا تو جا تیری مرضی۔ جہاں چاہے رپورٹ لکھوا لے۔ میں ابھی بستی والوں کو بلا کر گواہی دیتا ہوں کہ تو رات کو یہاں تھانے کے احاطے میں اپنی بہن کے ساتھ نہیں آیا۔ جب تو یہاں آیا تو اکیلا بیل گاڑی میں تھا اور تیری بہن پہلے ہی اٹھالی گئی تھی۔ دیکھ میں تھانیدار ہوں۔ اس بستی کا کوئی شخص میرے خلاف گواہی نہیں دے گا۔ جو میں کہوں گا، وہی یہ کہیں گے۔"

ضمیر نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "صمدو بھائی! ایسے وقت تمہیں میرے پاس آنا چاہئے تھا۔"

وہ ضمیر کو ایک طرف دھکا دیتے ہوئے بولا۔ "کیسے تمہارے پاس آتا۔ تم سے بہن کا رشتہ کر رہا تھا۔ میں تمہیں یہ بتانے آتا کہ وہ اٹھالی گئی ہے۔ تم میں ذرا بھی غیرت ہے تو میرے دل سے سوچو۔ میں کس طرح تم سے آنکھیں ملا سکتا ہوں۔"

"اوہ، صمدو بھائی!" ضمیر نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ "تمہاری غیرت نے رانی کو جیتے جی مار ڈالا۔ پتہ نہیں، وہ کہاں ہوگی۔ کس حال میں ہوگی، کن ظالموں کے پنجے میں پھنسی ہوگی۔ لوگ اس کا کیا حال کر رہے ہوں گے۔ تم کس دل سے صبر کر کے یہاں اب

تک بیٹھے رہے؟"

"مجھے الزام نہ دو۔ میں صبر نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے صبر نہیں آ رہا تھا۔ میں تین مہینے تک اس شہر کی گلی گلی، کوچے کوچے گھومتا رہا۔ ایک ایک سے پوچھتا رہا مگر رانی کا نام نہیں لیتا تھا۔ میں کہتا تھا کہ میری بستی کی ایک لڑکی میرے ساتھ یہاں آئی تھی۔ اس کا حلیہ بتاتا تھا۔ میں پوچھتا تھا۔ بولو، کسی نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ سب انکار میں سر ہلاتے تھے۔ میں اسے چھوڑ کر نہیں آیا۔ تقدیر کے ظالم ہاتھوں نے اسے مجھ سے چھین لیا۔ میں نے تین ماہ تک اسے تلاش کیا۔ میں تین ہزار سال تک اسے تلاش کر سکتا تھا۔ اپنی زندگی کی آخری سانس بھی اسے ڈھونڈنے میں خرچ کر دیتا مگر رہ رہ کر یہ بات میرے دل میں آتی تھی کہ میں اسے شہر میں تلاش کر رہا ہوں، اگر وہ ظالموں کے پنجے سے نکل کر بھٹکتی ہوئی اس بستی میں آجائے گی یا کسی طرح تمہارے پاس پہنچ جائے گی تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ میں شہر میں کئی بار تمہاری کوٹھی کے آس پاس چکر لگاتا رہا۔ اپنے طور پر معلوم کرتا رہا کہ رانی اِدھر آئی ہے یا نہیں۔ مجھے اطمینان ہوتا تھا کہ وہ اُدھر نہیں پہنچی۔ پھر تھانیدار اکرم علی نے سمجھایا۔ تین مہینے گزر گئے ہیں۔ کب تک شہر میں بھوکے پیاسے بھٹکتے رہو گے۔ تمہیں زبردستی کھلایا پلایا جاتا ہے تو کچھ کھاتے ہو نہیں تو بھوکے سوتے ہو اور رات کو اٹھ کر بیٹھ جاتے ہو۔ ایسا کب تک کرو گے؟ اپنی بستی میں جاؤ۔ شاید تمہاری بہن وہاں پہنچ گئی ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے ذرا دیر خاموش رہ کر جیسے سانس لی، جیسے ابھی تک اپنی بہن کو تلاش کرتے ہوئے بھاگ دوڑ میں مصروف تھا۔ پھر وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ "تب میں یہاں واپس آگیا لیکن اس طرح کہ اپنی عزت برقرار رہے۔ لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل رہوں۔ میں نے کپڑے کا ایک بڑا سا پتلا بنایا۔ اس میں روئی اور پتھر کے ٹکڑے بھر دیئے۔ وہاں سے شہد کی ایک بوتل خریدی۔ پھر اس پتلے کو گاڑی پر رکھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ یہ منصوبہ میرے دماغ میں بہت دنوں سے پک رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کبھی بستی واپس جاؤں گا تو کس انداز سے جاؤں گا۔ جب بستی قریب آنے لگی تب میں نے شہد کی بوتل کو کھولا اور تمام شہد سر سے پاؤں تک پتلے پر انڈیل دیا۔ اس کے بعد میں نے چادر لپیٹ دی اور جگہ جگہ سے پن لگا دی تاکہ وہ چادر ہوا سے اڑنے نہ پائے۔ اس کے بعد میں بستی کے قریب پہنچنے لگا تو اس وقت تک اس پتلے پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ میں نے لوگوں کو بتایا کہ اسے کوڑھ کا مرض ہو گیا ہے۔ میں اپنی بستی والوں کو جانتا ہوں، کوڑھ

ایسی بیماری ہے جس سے گھن آتی ہے اور یہ اندیشہ ہے کہ یہ چھوت کی بیماری ہے۔ دوسروں کو لگ جائے گی اس لئے وہ قریب نہیں آئے۔ میرا یہ منصوبہ بڑا کامیاب رہا اور میں نے بستی والوں کی آنکھوں کے سامنے اس پتلے کو رانی بنا کر یہاں دفن کر دیا۔ یہاں رانی نہیں یہاں میری غیرت دفن ہے۔ جب تک یہ دفن رہے گی' بستی والوں میں اور اپنوں میں میرا بھرم قائم رہے گا۔"

ضمیر اس کے سامنے سر جھکائے سن رہا تھا اور اس کے دل کی اور دماغ کی باتیں وہ سمجھ رہا تھا۔ اس کی عزت اور غیرت کس طرح سلامت رہ سکتی ہے۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ پھر وہ وہاں سے اٹھ کر آہستہ آہستہ قبر کے پاس گیا پھر اس کے اندر پہنچ کر اس نے کپڑے کے پھٹے ہوئے پتلے کو اٹھایا۔ اسے قبر کے باہر لا کر اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگا۔ اس میں سے پتھر نکال کر پھینکنے لگا۔ روئی ہوا میں اڑنے لگی۔

صمدو نے جب یہ دیکھا تو قریب آ کر پوچھا۔ "کیا تم میری غیرت کا بھرم نہیں رکھو گے؟"

"ہاں' رکھوں گا' لیکن اس پتلے کے کپڑے میں کہیں کہیں شہد کی چاشنی رہ گئی ہے۔ مکوڑے اس طرف آتے ہیں۔ اسے یہاں نہیں رہنا چاہئے۔ تم اطمینان رکھو' قبر یہاں موجود رہے گی۔"

اس پتلے کے چیتھڑے کر کے اسے ختم کر دینے کے بعد وہ دونوں نئے سرے سے ایک قبر تیار کرنے لگے۔ زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہی لکڑی کے تختے وہاں رکھ دیئے گئے۔ اس پر مٹی جما دی گئی۔ دونوں خاموش تھے۔ قبر اندر سے خالی تھی مگر دونوں کے دل رانی کی یادوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اندر تڑپ اور بے چینی تھی۔ ضمیر سوچ رہا تھا کہ کسی طرح جلدی شہر پہنچے اور رانی کو کہاں کہاں تلاش کرے۔ وہ دونوں دریا کے کنارے آ کر منہ ہاتھ دھونے کے بعد گاڑی کی طرف واپس جانے لگے۔ ضمیر نے کہا۔ "صمدو بھائی! تم گھر جاؤ۔ اب میں شہر جاؤں گا اور اسے تلاش کر کے رہوں گا۔"

یک بیک صمدو نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر جلدی سے اس کا گریبان پکڑ کر کہا۔ "دیکھ' ضمیر! پاگلوں جیسی حرکت نہ کرنا۔ رانی اب مر چکی ہے۔ اسے تلاش نہ کرنا۔ کہیں نظر آئے تو اندھے بن جانا۔ وہ اب اس بستی میں نہیں آ سکتی۔ میں نے اسے دنیا والوں کے لئے مار ڈالا ہے۔ کس منہ سے اسے دوبارہ زندہ کروں گا۔ کس منہ سے کہوں گا کہ میں نے اپنی غیرت کا بھرم رکھنے کے لئے اپنی جوان بہن کی یہ قبر تیار کی تھی۔ اب رانی

آئے گی۔ ہزار پارسائی قائم رکھنے کے باوجود آئے گی تب بھی کوئی یقین نہیں کرے گا۔ یہ دنیا والے قبروں پر پھول چڑھاتے ہیں۔ مردوں کی عزت کرتے ہیں اور زندوں پر تھوکتے ہیں۔ کیا تم چاہو گے کہ ہماری رانی پر کوئی تھوکے؟"

ضمیر نے ایک گہری سانس لے کر اس کی تائید کی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ رانی کو ادھر نہیں آنا چاہئے اور میں بھی سوچتا ہوں کہ رانی کو تلاش کر کے اس کے یہاں آنے کا راستہ روک دوں۔ اس کی بس ایک ہی صورت ہے۔ وہ جب بھی مجھے ملے گی' میں اسے اپنی شریک حیات بنا لوں گا۔"

صمدو نے پھر چونک کر اسے دیکھا' پھر پوچھا۔ "کیا تم میری بہن کو قبول کر لو گے۔ وہ تو پتہ نہیں اب تک..........."

وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ شرم نے زبان روک لی۔ ضمیر نے اس کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "صمدو بھائی! وہ جیسی بھی ہے میرا سپنا تھی' میری آرزو تھی۔ میں ایسے برے وقت اسے سہارا نہیں دوں گا تو کوئی غیر اسے اپنانے نہیں آئے گا۔ یہ ہمارا تمہارا ہی فرض ہے۔ تم مجبور ہو کہ اسے بستی میں واپس نہیں لا سکتے۔ میں تو مجبور نہیں ہوں۔ میں اسے اتنی عزت دوں گا کہ اس کے دامن کا دھبہ مٹ جائے گا۔ میں اسے یہاں نہیں آنے دوں گا۔ ہاں' تمہاری مرضی ہو تو کبھی شہر آ کر اپنی بہن سے مل لیا کرنا۔ میں جلد ہی تمہیں خوشخبری سناؤں گا۔" اس نے ٹارچ کی روشنی میں رسٹ واچ کو دیکھا۔ چار بجنے والے تھے۔

صمدو نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کار کے پاس آ کر کہا۔ "ابھی تم گھر چل کر آرام کرو۔ تھوڑی سی نیند پوری کر لو' اس کے بعد چلے جانا۔"

ضمیر نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں' میں آرام نہیں کر سکتا۔ مجھے راستے میں کہیں نیند آئے گی تو گاڑی روک کر تھوڑی دیر سو جاؤں گا مگر اب میرا سفر جاری رہے گا۔ میری تلاش صرف رانی کی بازیابی پر ہی ختم ہو گی۔ میرا مشورہ ہے کہ تم بھی اپنے مکان کو مقفل کرو اور میرے ساتھ چلو۔ مجھے بتاؤ کہ تم کہاں گئے تھے اور کن لوگوں سے مدد حاصل کی تھی؟"

صمدو نے کہا۔ "نہیں' میں تمہارے ساتھ شہر نہیں جاؤں گا۔ اب ادھر کا رخ بھی نہیں کروں گا۔"

"کیوں نہیں جاؤ گے' کیا حرج ہے؟"

وہ چپ رہا۔ تھوڑی دیر تک دونوں ہی خاموش ایک دوسرے کو اندھیرے میں تکتے رہے۔ چہرے نظر نہیں آ رہے تھے مگر سائے سائے سے لگ رہے تھے۔ پھر صمدو نے بڑے گہرے دکھ سے کہا۔ ”میں نہیں جاؤں گا۔ جاؤں گا تو شاید کہیں نہ کہیں رانی سے سامنا ہو جائے گا۔ اب میں اس بہن کے سامنے کیسے جاؤں۔ وہ تو شرم کی ماری ہے۔ مجھے دیکھتے ہی مرجائے گی۔ مجھ سے نظریں نہیں ملا سکے گی۔ ضمیر! تم نہیں جانتے کہ رانی کیا ہے۔ جتنی مجھ میں غیرت ہے' اس سے زیادہ اس کے اندر حیا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ اب تک اپنی جان پر کھیل گئی ہو گی اور زندہ ہو گی تو موت کا بہانہ ڈھونڈ رہی ہو گی۔“

ضمیر نے کار کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”اللہ کرے وہ زندہ ہو۔ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔“

اس نے دروازے کو بند کیا۔ گاڑی اسٹارٹ کی' پھر صمدو کو خدا حافظ کہتے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

☆======☆======☆

وہ شہر پہنچنے تک نہیں سو سکا۔ بھوک بھی نہیں لگی۔ سب سے پہلے وہ اپنی کوٹھی پہنچا۔ وہاں اس کی غیر موجودگی میں ایک بوڑھی آیا رہتی تھی جو پورے گھر کی نگرانی کرتی تھی۔ اس نے جاتے ہی رانی کی پوری داستان سنائی۔ پھر اسے کہا۔ ”ماں جی! اگر تم چاہو تو کسی طرح رانی تک پہنچ سکتی ہو۔“

”مجھے کوئی راستہ بتاؤ بیٹے میں ضرور یہ کام کروں گی۔“

”میں راستے بھر سوچتا آیا ہوں۔ پہلے اس تھانیدار اکرم علی کے گھر میں گھس کر جاسوسی کرنی ہو گی۔ وہاں کے حالات معلوم کرنے ہوں گے کہ اس کے گھر میں کتنی عورتیں ہیں یا تھانیدار اپنی ڈیوٹی کے بعد کہاں وقت گزارنے جاتا ہے۔ یہ معلومات اسی وقت حاصل ہو سکتی ہیں جب کوئی اس کے گھر میں دن رات رہے۔ تم وہاں ملازمہ کی حیثیت سے جا سکتی ہو۔ یہ کہہ سکتی ہو کہ تمہیں صرف تین وقت کی روٹی چاہئے اور تم تنخواہ نہیں لو گی۔ اس سے زیادہ کھانا کپڑا نہیں مانگو گی۔ میرا خیال ہے کہ اتنی سستی ملازمہ ملنے پر وہ انکار نہیں کرے گا۔ اپنے گھر میں رکھ لے گا۔“

”بیٹا! میں تمہارے لئے جان دینے کے لئے بھی تیار ہوں مگر تمہاری ملازمت چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی۔“

”ماں جی! میرے یہاں کی ملازمت بحال رہے گی۔ جب یہ کام پورا ہو جائے گا تو تم میرے پاس آ جاؤ گی اور جب تک تم تھانیدار کے ہاں ملازمت کرتی رہو گی تمہاری تنخواہ یہاں بھی جاری رہے گی۔“

”اچھی بات ہے بیٹے! مجھے اس کے گھر کا پتہ بتاؤ۔“

ضمیر نے ریسیور اٹھا کر انکوائری کا نمبر ڈائل کیا۔ وہاں سے چمن گوٹھ کے پولیس سٹیشن کا فون نمبر معلوم کیا۔ اس معلومات کے مطابق چمن گوٹھ کے تھانیدار سے رابطہ قائم ہو گیا۔ ضمیر نے کہا۔ ”ہیلو میں انسپکٹر اکرم علی سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں اکرم علی بول رہا ہوں۔ آپ کون ہیں؟“

ضمیر نے کہا۔ ”اتفاق سے میرا نام بھی اکرم علی ہے' میں اس شہر کے چند گنے چنے رئیسوں میں شمار کیا جاتا ہوں۔ میرا ایک کام اٹکا ہوا ہے۔ وہ آپ ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔“

”کیسا کام؟“

”میں فون پر نہیں کہہ سکتا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کام کیا ہو سکتا ہے۔ میں ذاتی طور پر آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں اور آپ کے گھر پر ملنا چاہتا ہوں۔ آپ یقین کریں کہ آپ کی بات سے مجھے فائدہ ہو گا تو میری بات سے بھی آپ کو اتنا فائدہ ہو گا کہ آپ سوچ نہیں سکیں گے۔ آپ مجھے اپنے گھر کا پتہ بتا دیں۔“

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر اکرم علی نے اپنے گھر کا پتہ بتا دیا۔ ضمیر نے ریسیور رکھ کر بوڑھی آیا کو اس کے گھر کا پتہ بتایا۔ وہ بوڑھی وہاں سے رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد اب ضمیر کو سو جانا چاہئے تھا مگر نیند آنکھوں سے اڑی ہوئی تھی۔ پچھلی رات جاگنے کے باوجود وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ رہ رہ کر رانی کا خیال ستا رہا تھا کہ پتہ نہیں وہ کس حال میں ہو گی' کہاں ہو گی؟ ظالم اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہوں گے؟ وہ سگریٹ سلگا کر سوچنے لگا' کبھی ٹہلنے لگا' کبھی بیٹھنے لگا' کبھی اٹھنے لگا'' کبھی بستر پر اوندھے منہ گر کر سوچنے لگا۔

دنیا کے کسی حصے میں قانون کیسا ہی ہو' کتنا ہی سخت ہو' وہ قانون صرف دو آدمیوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ ایک پولیس دوسرا مجرم۔ وکیل' بیرسٹر اور جج وغیرہ بعد میں آتے ہیں لیکن پہلے یہ دو بندے قانون سے کھیلتے ہیں۔ اسے اچھی یا بری صورت میں وکیلوں اور ججوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ لہٰذا ضمیر سوچ رہا تھا کہ پہلے ان دو آدمیوں کے

متعلق سوچنا چاہئے۔ پولیس کے متعلق اور بدمعاش کے متعلق۔

ان دونوں کے گٹھ جوڑ سے رانی کو اغوا کیا گیا تھا اور صمد و کو بے وقوف بنایا گیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان پھوٹ ڈال کر کام نکالا جا سکتا تھا' رانی تک پہنچا جا سکتا تھا۔ وہ سگریٹ کا کش لگا کر اٹھ بیٹھا۔ پھر اس کے دماغ میں بات آئی کہ کیوں نہ چمن گوٹھ کے کسی بڑے بدمعاش کو اپنے ہاتھ میں لیا جائے اور اسے تھانیدار اکرم علی کے خلاف استعمال کیا جائے۔

وہ بستر سے اتر کر تیزی سے چلتا ہوا ایک آہنی الماری کے پاس آیا۔ اس کے پٹ کھول کر دراز کو کھولا۔ وہاں سے ایک ریوالور نکال کر اپنی جیب میں رکھا۔ پھر اس کے آہنی سیف کو کھول کر نوٹوں کی گڈیاں نکال نکال کر ایک تھیلے میں بھرنے لگا۔ ایسی جگہ صرف دو ہی نسخے کام آتے ہیں' ایک نوٹوں سے بھرا ہوا تھیلا' دوسرا ریوالور۔ یا تو دولت کا لالچ کام آتا ہے یا پھر ریوالور سے نکلی ہوئی گولی۔ وہ جن بدمعاشوں سے ملنے جا رہا تھا وہ یہی دو باتیں جانتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کار میں بیٹھ کر چمن گوٹھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ شہر کے سینما گھروں میں میٹنی شو کا وقت تھا۔ چمن گوٹھ کے سینما گھر کے سامنے بھی بڑی بھیڑ تھی۔ ضمیر نے ایک طرف گاڑی روک دی۔ ٹکٹ کاؤنٹر کے پاس لوگوں کا ہجوم تھا۔ ایک موٹا سا ناٹے قد کا آدمی ہاتھ میں چھوٹا سا ڈنڈا لیے لوگوں کو مار مار کر کاؤنٹر کے پاس سے بھگا رہا تھا اور انہیں قطار میں کھڑے ہونے پر مجبور کر رہا تھا۔ جو لوگ اس سے سہم کر بھاگ رہے تھے وہ اس کے مقابلے میں زیادہ تندرست اور طاقتور نظر آتے تھے' لیکن یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس ڈنڈے والے ناٹے آدمی کا رعب طاری ہے اور سبھی اس سے سہم جاتے ہیں۔ ضمیر ایک سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔

آدھے گھنٹے کے بعد بکنگ کاؤنٹر بند ہو گیا۔ بھیڑ چھٹنے لگی۔ تب ضمیر نے کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے اس بدمعاش کی طرف چٹکی بجاتے ہوئے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اس نے ضمیر کی طرف دیکھا' کچھ سوچا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "کیا بات ہے بابو صاحب! یہ چٹکی بجا کر مجھے کیوں بلا رہے ہو۔ کیا مجھے کوئی جانور سمجھا ہے؟"

ضمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہارا باپ زندہ ہو تو جا کر پوچھ لینا' جب تم بالشت بھر کے بچے تھے تو وہ چٹکی بجا کر تمہیں بہلایا کرتا تھا۔ چٹکی ایک ساز ہے جو موسیقی میں استعمال ہوتا ہے اور بچوں کو سنایا جاتا ہے۔ جو کتے ہوتے ہیں وہ چٹکی بجانے کے اشارتی

علم پر عمل کرتے ہیں اور جو انسان ہوتے ہیں وہ چٹکی کو محبت اور موسیقی سمجھتے ہیں۔ اب تم کیا سمجھ رہے ہو' یہ بتا دو۔"

اس نے گھور کر دیکھا۔ پھر ڈنڈے کا رُخ اس کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ "اے' تم باتوں کی ہیرا پھیری سے میری بے عزتی کر رہے ہو۔"

ضمیر نے اس کے ڈنڈے کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ "جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہوتا ہے اس کی عزت ہوتی ہے۔ میں کام کی بات کرنے آیا ہوں۔ مجھ سے فضول باتیں نہ کرو۔ سنا ہے کہ جس علاقے میں جو سب سے بڑا بدمعاش ہوتا ہے اسے دادا کہا جاتا ہے۔ میں اس علاقے کے دادا سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا تم اس سے میری ملاقات کرا سکتے ہو؟"

"دادا سے تمہیں کیا کام ہے؟"

"پانچ منٹ میں بیس ہزار کا دھندا ہے۔ اس دھندے کی بات میں اسی سے کر سکتا ہوں۔"

"تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟"

"یہ بھی میں اسی کو بتا سکتا ہوں۔"

"وہ تھوڑی دیر تک ضمیر کو سر سے پاؤں تک دیکھتا رہا پھر بولا۔ "اچھی بات ہے۔ یہاں ٹھہرو' میں دادا کو خبر کرتا ہوں۔"

وہ وہاں سے چلا گیا۔ بیس منٹ کے بعد جب واپس آیا تو اس کے ساتھ تقریباً چھ آدمی تھے۔ ان چھ آدمیوں کے درمیان ایک لانبا تڑنگا سا آدمی شلوار قمیض میں ملبوس ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں اور آنکھیں بھی ایسی بڑی اور سرخ تھیں جیسے ابھی ابھی نشہ کر کے اٹھا ہو۔ اس نے قریب آ کر ضمیر کو گھورا پھر بولا۔ "کیا بات ہے سائیں! کیوں مجھ کو تلاش کرتے ہو؟"

ضمیر نے کار کا اگلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "یہاں بیٹھ جاؤ' میں اطمینان سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے کار کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔ بات کرنا ہے تو یہیں کرو۔"

"میں یہیں بات کروں گا مگر آرام سے بیٹھ کر۔ آؤ بیٹھو تو سہی۔"

وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ضمیر دوسری طرف سے گھوم کر اسٹیئرنگ سیٹ پر آیا۔ پھر کار کے دروازے کو بند کر دیا۔ اس بدمعاش دادا کے حواریوں نے کار کو چاروں طرف سے

گھیر لیا تھا۔ ضمیر نے کار کے شیشے چڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں ایسی باتیں کرنا چاہتا ہوں جسے تمہارے آدمی بھی نہ سن سکیں، اس لئے میں نے شیشے چڑھا دیئے ہیں۔" پھر وہ اس کی طرف گھوم کر بولا۔ "میرا نام ضمیر حسن ہے اور تمہارا؟"

"میرے کو گلو بادشاہ بولتے ہیں۔ کام کی بات کرو۔"

"ابھی کرتا ہوں۔ یہ جو تمہارے سامنے ڈیش بورڈ ہے ذرا اس کو کھولو۔"

"اے سائیں! کیا تم مجھے یہاں حکم دینے آئے ہو؟ کیا میں تمہارا نوکر لگتا ہوں؟"

"نہیں، گلو بادشاہ! میں حکم نہیں دے رہا ہوں۔ تمہارے دھندے کی بات کر رہا ہوں۔ ذرا اسے کھولو تو سہی۔"

گلو بادشاہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر ایک جھٹکے سے ڈیش بورڈ کے اس حصے کو کھولا تو اس کی آنکھیں بھی کھلی رہ گئیں۔ وہاں نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ ضمیر نے کہا۔

"یہ بیس بیس ہزار کی گڈیاں ہیں۔ کام سے پہلے بیس ہزار دوں گا۔ کام ہو جائے گا تو پھر بیس ہزار ملیں گے۔"

خوشی کے مارے دادا کی بتیسی نکل آئی، اس نے پوچھا۔ "کیا تم ابھی میرے کو بیس ہزار دو گے اور کام کے بعد بیس ہزار۔ مطلب یہ کہ چالیس ہزار دو گے؟"

"ہاں، ابھی بیس ہزار دوں گا، بعد میں بیس ہزار دوں گا۔ کل رقم چالیس ہزار۔"

"ارے تو بولو نا سائیں! کام کیا ہے جان نکال کر دے گا تم کو؟"

"کام یہی کوئی معمولی سا ہے۔ وہ پانچ منٹ میں ہو سکتا ہے۔ دیکھو آج سے پانچ مہینے پہلے مئی کی چھ تاریخ کو ایک دیہاتی سانگھڑ بستی سے اپنی بہن کو بیل گاڑی میں بٹھا کر تمہارے علاقے میں آیا اور پولیس سٹیشن کے احاطے میں رات گزاری۔ رات کو اس کی بہن اٹھالی گئی۔ اس لڑکی کا نام رانی ہے اور یہ تم سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا کہ رانی کو کہاں لے جایا گیا ہے، کہاں چھپایا گیا ہے۔ اس کا پتہ بتا دو۔ بیس ہزار لے لو۔ اس پتے پر میں رانی کو حاصل کر لوں گا تو باقی بیس ہزار دے دوں گا۔"

دادا نے اسے غور سے دیکھا۔ پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم کو کسی نے غلط راستہ دکھا دیا ہے۔ میں کسی رانی کو اور صمدو کو نہیں جانتا ہوں۔"

"دادا تم جانتے ہو۔ ابھی میں نے جو مختصر سا قصہ بتایا ہے اس میں صرف رانی کا نام لیا تھا اور کہا تھا کہ ایک دیہاتی اپنی بہن کو یہاں لایا۔ میں نے اس کا نام نہیں بتایا۔ ابھی تم کہتے ہو کہ تم رانی اور صمدو کو نہیں جانتے۔ جب نہیں جانتے تو صمدو کا نام کیسے جانتے

ہو؟"

"دیکھو سائیں! تم ہمارے علاقے میں آئے ہو۔ ہم سے جھگڑا کرنے والی بحث شروع نہ کرو گے تو یہاں سے واپس نہیں جا سکو گے۔"

"میں جھگڑا کرنے نہیں، اپنا کام نکالنے آیا ہوں۔ وہ میری منگیتر ہے۔ میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔ اگر انسانیت کا واسطہ دینے سے، خدا اور رسول کا واسطہ دینے سے تم میرا کام کر سکتے ہو تو چالیس ہزار روپے لے کر کر دو۔"

"سائیں! تم بچوں جیسی بات کرتے ہو۔ تھانے سے کوئی لڑکی اٹھالی جائے گی، اس بات کو کوئی جج بیرسٹر بھی نہیں مانے گا، اور تم کچھ ثابت نہیں کر سکو گے اور میں بولتا ہوں کہ یہ سب بات جھوٹ ہے۔ تم کوئی دوسرے علاقے میں معلوم کرو۔ ادھر کوئی رانی نہیں آئی تھی۔"

ضمیر نے مایوسی سے کہا۔ "دیکھو دادا! تمہارے آگے بھی جوان بہنیں اور بیٹیاں ہوں گی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہارے دل کو کیسے موم کروں۔ میں جانتا ہوں کہ ایک علاقے کا دادا بننے کے لئے تھانے والوں سے دوستی رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ تھانیدار اور علاقے کا دادا ایک دوسرے سے گٹھ جوڑ کے بعد ہی اپنے اپنے علاقے میں راج کرتے ہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ تم تھانیدار کے خلاف کچھ نہیں کرو گے۔"

"جب تم سمجھتے ہو تو آگے مت بولو۔ چالیس ہزار کی رقم معمولی نہیں ہوتی۔ اس کے لئے بولو تو میں تمہارے چالیس دشمنوں کو قتل کر دوں۔ تھانیدار کے بتیس دانت ہوتے ہیں، اور میں بتیس دانتوں کے بیچ میں ایک زبان ہوں۔ سوچ سمجھ کے ہلتا ہوں۔ اپنی حد سے آگے بڑھوں گا تو دانتوں کے بیچ میں آجاؤں گا۔ مجھ کو تو معاف کرو سائیں!"

یہ کہہ کر وہ دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل گیا۔ دوسری طرف سے ضمیر بھی باہر نکلتے ہوئے بولا۔ "دیکھو دادا! میں نے چالیس ہزار کی پیشکش کی ہے۔ میں اس سے زیادہ بھی رقم دے سکتا ہوں۔ میرا نام ضمیر حسن ہے۔ میں گلبرگ کی بارہ نمبر کی کوٹھی میں، بارہ نمبر کی گلی میں رہتا ہوں۔ آج رات تک تمہارا اگر دل چاہے کہ مجھ سے چالیس ہزار روپے وصول کرو تو میرے اس پتے پر چلے آنا۔ پانچ منٹ میں بیس ہزار روپے ملیں گے اور میرا کام ہونے کے بعد مزید بیس ہزار۔ یہ میری زبان پکی رہی۔ اگر خوش ہوا تو اس سے زیادہ بھی دے دوں گا۔"

یہ کہہ کر ضمیر حسن کار میں بیٹھ گیا۔ پھر اسے اسٹارٹ کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ اس علاقے کے دادا کو خریدنے میں جو ناکامی ہوئی تھی۔ اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ رانی تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔ یہی دو ہتھیار رہ گئے تھے۔ ایک دولت کہ وہ لالچ میں آ جائے۔ دوسرا ریوالور کہ دشمنوں کو گولیوں سے اڑا دیا جائے مگر گولی چلانے کی بات بہت بعد میں آنے والی تھی۔ اس وقت جب یہ یقین ہو جاتا کہ رانی اس دنیا میں نہیں ہے۔ ظالموں نے اسے مار ڈالا ہے تو وہ ریوالور کو استعمال کر سکتا تھا۔ ابھی ریوالور کو درمیان میں لانے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ رانی کہیں زندہ ہوتی تو وہاں تک پہنچنے کے راستے ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتے۔

وہ ڈرائیو کرتے ہوئے اور گہری سانس لیتے ہوئے سوچنے لگا کہ یہ بدمعاش انسان نہیں ہوتے؟ کیا ان کے گھروں میں جوان بیٹیاں اور بہنیں نہیں ہوتیں؟ انہیں بہنوں اور بیٹیوں کا حوالہ دینے سے ان کے دل کیوں نہیں پگھلتے۔ جب یہ کسی کی بہن کو اپنے کاندھے پر ڈال کر لے جاتے ہیں تو دماغ کے کسی گوشے میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ وہ اپنے کاندھے پر ایک بہن کی عزت کا جنازہ لے جا رہے ہیں اور وہ بہن ان کی بھی ہو سکتی ہے۔

فضول ہے۔ جانور کو سدھایا جائے تو وہ آدمی کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر سیدھے راستے پر لے جاتا ہے۔ آدمی کو لاکھ سدھایا جائے۔ وہ آدمی کو اٹھا کر گڑھے میں گرا دیتا ہے۔ ہم سب بھوکے اور ذلتوں کے مارے ہیں۔ ایک دوسرے کے گھر سے عزت کا راشن چراتے ہیں اور اپنی ہوس کا پیٹ بھرتے ہیں۔ ہم اشرف المخلوقات ہیں۔

اس نے اپنی کوٹھی کے پورچ میں گاڑی روکی۔ پھر اپنے ملازم سے کہا۔ "دیکھو' اس وقت پانچ بجے ہیں۔ میں جا کر سو رہا ہوں۔ کوئی بھی مجھ سے ملنے آئے تو اسے ڈرائنگ روم میں بٹھانا اور مجھے نیند سے جگا دینا اور جب تک کوئی نہ آئے اس وقت تک تم باہر والے مین گیٹ پر بیٹھے رہنا۔ آنے والوں میں کوئی معمولی قسم کا آدمی بھی ہو گا۔ شاید چہرے سے غنڈہ بدمعاش بھی نظر آئے تو اسے نہ روکنا۔ جیسا بھی آدمی ہو' مجھے ضرور خبر کرنا اور اگر تم اپنی ڈیوٹی کی جگہ سے کہیں جانا چاہو تو اپنی جگہ کسی دوسرے کو بٹھا دینا لیکن یہ جگہ خالی نہ رہے اور آنے والا واپس نہ جائے۔ اگر کوتاہی کرو گے تو میں بری طرح پیش آؤں گا۔"

"نہیں صاحب! آپ اطمینان سے جا کر سو جائیں۔ میں یہاں موجود رہوں گا۔ کوئی

بھی آئے گا تو آپ کو خبر کروں گا۔"

ضمیر اپنے بیڈ روم میں آ کر لیٹ گیا۔ اس نے پچھلی رات سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اب بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے بستر سے اٹھ کر فریج سے مکھن اور جیلی نکالی۔ کچن سے آ کر ڈبل روٹی کے ساتھ اسے کھایا۔ پانی پیا' چائے بنا کر پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس لئے ایک سگریٹ سلگا کر اس کے کش لگاتا ہوا پھر بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ چمن گوٹھ کا دادا آج رات تک اس سے تعاون نہیں کرے گا تو کل وہ اس شہر کے ڈی ایس پی کے پاس جائے گا۔ اس سے ایسی ہی سرسری سی ملاقات تھی۔ وہ اس کے ذریعے رانی تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔

ضمیر نے آج تک یہی دیکھا تھا اور یہی سنتا آیا تھا کہ دنیا کا کوئی بھی کام رکتا ہو تو دولت سے وہ رکاوٹ ختم ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی بڑی رکاوٹ ہو۔ آج تعجب ہو رہا تھا کہ چالیس ہزار کی اتنی بڑی رقم دینے کے باوجود چمن گوٹھ کے غریب دادا نے اس کے آگے گھٹنے کیوں نہیں ٹیکے۔ صرف اس لئے کہ وہ وہاں کا بدمعاش رہنا چاہتا تھا اور تھانیدار کے تعاون سے اپنا رعب اور دبدبہ اس علاقے پر طاری رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اس نے یکمشت آنے والی چالیس ہزار کی رقم کو ٹھکرا دیا تھا۔ یہ بات' دل نہیں مانتا تھا۔ اس کا دل اور دماغ سمجھا رہا تھا کہ یہ بازی ہاری نہیں جا سکتی۔ بہت بڑی رقم لگائی گئی ہے۔

اس نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھا دیا۔ پھر کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ نیند آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر سو لینے کے بعد ہی وہ تازہ دم ہو کر رانی کے سلسلے میں کچھ نئے منصوبے بنانا چاہتا تھا۔ رفتہ رفتہ نیند اس پر غالب آنے لگی۔ وہ سو رہا تھا۔ گہری نیند میں ڈوب رہا تھا۔ پھر اچانک ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوا دروازے کے پاس آیا۔ پھر اسے کھول کر دیکھا۔ ملازم کہہ رہا تھا۔ "صاحب ایک آدمی آپ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم کچن میں جاؤ اور ہمارے لئے چائے بنا کر لے آؤ۔"

وہ کچن کی طرف چلا گیا۔ ضمیر نے ڈرائنگ روم میں آ کر دیکھا وہاں شلوار قمیض میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ گھبرایا ہوا سا تھا۔ ضمیر کو دیکھتے ہی اس نے اٹھ کر سلام کیا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "صاحب جی! میں بہا

چھپ کر آیا ہوں۔ جانتا ہوں کہ دادا کے کسی آدمی نے مجھے دیکھ لیا تو جان سے مار ڈالے گا۔ میرے پورے خاندان کو تباہ کر دے گا۔"

ضمیر نے کہا۔ "بیٹھو گھبراؤ نہیں' میں تمہاری حفاظت کروں گا۔"

"نہیں صاحب جی! یہاں رہ کر اب میں حفاظت سے نہیں رہوں گا۔ آپ کا کام کروں گا اور یہ شہر چھوڑ کر اپنے گاؤں چلا جاؤں گا۔ وہاں آپ کے پیسوں سے زمین خریدوں گا۔ کھیتی باڑی کروں گا اور عزت سے زندگی گزاروں گا۔ تبھی میں اپنی بہن کی شادی کر سکوں گا۔ میں بدمعاش ہوں۔ میری بہن کا کوئی اچھا رشتہ نہیں آتا ہے۔ میری گھر والی مجھے طعنے دیتی ہے۔ میری ماں مجھے بددعائیں دیتی ہے کہ میری وجہ سے میری بہن کنواری بیٹھی ہوئی ہے۔ میں آج ایک نیک کام کر کے یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ رانی زندہ ہے؟"

"زندہ ہے۔"

"وہ کہاں ہے؟"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "صاحب جی! آپ سچ مچ چالیس ہزار روپے دیں گے نا؟ میرے کو یقین نہیں آتا۔ میں نے کبھی چالیس ہزار تک گنتی بھی نہیں سیکھی ہے۔"

"تم یقین رکھو۔ اچھا لو۔ میں تمہیں ابھی یقین دلاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے کار کی چابی نکالی' پھر کہا۔ "جاؤ' کار کا دروازہ کھولو۔ سامنے ڈیش بورڈ کے اندر جتنی بھی نوٹوں کی گڈیاں ہیں وہ سب اٹھا کر یہاں لے آؤ۔"

اس آدمی نے کار کی چابی لی۔ پھر باہر جانے لگا۔ ضمیر دوسری طرف کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ پھر وہاں سے اس کھڑکی کے پاس آیا جہاں سے وہ باہر کھڑی ہوئی کار کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ خیال تھا کہ وہ بے ایمان ہو گا اور دھوکا دینے آیا ہو گا تو وہ سارے نوٹوں کی گڈیاں لے کر فرار ہونے کی کوشش کرے گا تو اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا اور اگر ایمانداری سے ڈرائنگ روم کے اندر وہ سارے نوٹ لے آیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ سچ مچ رانی تک اس کی رہنمائی کرے گا اور اسے دھوکا نہیں دے گا۔

وہ آدمی کار کے دروازے کو کھول کر نوٹوں کی گڈیاں نکال رہا تھا اور اپنی چادر میں ان نوٹوں کو ڈال کر پھر دروازہ بند کرنے کے بعد برآمدے کا زینہ طے کرتے ہوئے کوٹھی کے اندر آ رہا تھا۔ ضمیر مطمئن ہو کر پھر وہاں سے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اس آدمی نے

نوٹوں کی تمام گڈیاں صوفوں کے درمیان بڑی سی میز پر رکھ دی تھیں اور اتنی دولت کو دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ ضمیر نے مسکرا کر پوچھا۔ "تم چاہتے تو یہ سمیٹ کر وہیں سے فرار ہو جاتے؟"

"نہیں صاحب! مجھ کو جتنا ایمانداری سے ملے گا اتنی ہی میری بھلائی ہو گی۔ ماں کہتی ہے کہ میں بے ایمانی کے پیسوں سے اپنی بہن کو سہاگن نہیں بنا سکوں گا۔ جب ایمانداری سے چالیس ہزار مل رہے ہیں تو بے ایمانی کی ضرورت کیا ہے؟"

"اچھی بات ہے۔ اس میں سے ایک گڈی اٹھا لو۔"

اس نے حکم کے مطابق ایک گڈی اٹھا لی اور اسے اپنی قمیض کے اندر چھپانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کہہ رہا تھا۔ "صاحب جس سینما ہال کے پیچھے آپ کھڑے ہوئے تھے' اس ہال کے پیچھے ایک دارو کی بھٹی ہے۔ دارو کی بھٹی کے پیچھے بہت ناجائز کاروبار ہوتا ہے۔ وہاں جوا کھیلا جاتا ہے اور چوری کا مال رکھا جاتا ہے۔ تھانیدار کو یہ ساری بات معلوم ہے وہیں ایک کمرے میں اس چھوکری کو قید کر رکھا ہے۔ مگر صاحب! آپ اپنے ساتھ دس آدمیوں کو لے کر جائیں گے تب بھی وہاں سے واپس نہیں آ سکیں گے۔"

"تم اس بات کی فکر نہ کرو۔ میں بہت بڑے پولیس آفیسر سے مدد حاصل کروں گا اور وہاں پولیس والے چھاپہ ماریں گے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے' لوہے کو لوہا کاٹتا ہے مگر بدمعاش کو بدمعاش نہیں مارتا اور پولیس والے کا نقصان کوئی دوسرا پولیس والا نہیں کرتا۔ آگے آپ سمجھدار ہیں۔ سوچ سمجھ کر قدم اٹھائیے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ لڑکی آپ کو واپس مل جائے اور باقی جو بیس ہزار ہیں وہ مجھے مل جائیں۔"

"تمہارے دماغ میں کوئی تدبیر ہے تو بتاؤ کہ میں رانی کو وہاں سے کیسے لا سکتا ہوں؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "بہت مشکل ہے جی! میں اگر کوئی تدبیر جانتا تو آپ کو ضرور بتاتا۔ میں باقی بیس ہزار چھوڑنا نہیں چاہتا مگر ابھی تو میں مجبور ہوں۔"

آدھے گھنٹے کے بعد ضمیر ڈی ایس پی ظفر محمود کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "میری ایک منگیتر رابعہ عرف رانی پانچ مہینے سے لاپتہ ہے۔ آج صبح ٹھکانہ معلوم ہو گیا ہے کہ اسے بدمعاشوں نے کہاں قید کر کے رکھا ہے۔ اب آپ ہی کی مدد سے میں اسے حاصل کر سکتا ہوں۔"

ظفر محمود نے کہا۔ "ضمیر صاحب! میں تو قانون کا پابند ہوں' اور عوام کا خدمت گار

ہوں۔ جو بدمعاش ہوتے ہیں انہیں ان کی سزا تک پہنچانا میرا فرض ہے۔ پھر یہ کہ آپ سے لندن میں خصوصی ملاقات رہی۔ بھلا میں آپ کے کام نہیں آؤں گا تو اور کون آئے گا۔ میں ابھی حکم صادر کرتا ہوں۔ پولیس کی ایک جماعت آپ کے ساتھ جائے گی اور اس جگہ چھاپہ مارے گی جہاں لڑکی کو قید کیا گیا ہے مگر اسے کہاں قید کیا گیا ہے؟"

"چمن گوٹھ کے ایک سینما ہال کے پیچھے ایک دارو کی بھٹی ہے' وہاں بہت سے ناجائز کاروبار ہوتے ہیں۔ وہیں ایک کمرے میں رانی کو قید کیا گیا ہے۔"

ظفر محمود کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ پھر اس نے ٹیلیفون کو اپنی طرف کھینچ کر اس کا ریسیور اٹھاتے ہوئے نمبر ڈائل کئے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ "ہیلو' انسپکٹر اکرم علی کو فون پر بھیجو۔"

یہ سمجھ میں آگیا کہ ظفر محمود اس وقت چمن گوٹھ کے انسپکٹر اکرم علی سے فون پر باتیں کر رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ "ہیلو' اکرم! تم اسی وقت یہاں کوٹھی میں آ جاؤ۔"

اس نے کچھ سنا' پھر اس کے بعد کہا۔ "میں کوئی بکواس سننا نہیں چاہتا۔ یہاں فوراً پہنچنے کی کوشش کرو۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

ضمیر نے پریشان ہو کر کہا۔ "جناب! آپ نے یہ کیا کیا؟ تھانیدار اکرم علی تو اس جرم میں ملوث ہے۔ وہ لڑکی اور اس کا بھائی پانچ مہینے پہلے پولیس سٹیشن کے احاطے میں پناہ لینے کے لئے آئے تھے۔ وہیں سے اس بے چارے کی بہن کو اٹھا لیا گیا اور یہ سب اکرم علی کے اشارے پر ہوا ہے۔ اکرم علی اس کے بھائی کو تین مہینے تک ٹرخاتا رہا۔ بہانے کرتا رہا کہ اس کی بہن کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ پھر اس کا بھائی روتا دھوتا یہاں سے واپس چلا گیا' اس کے پیچھے بھی ایک لمبی داستان ہے کہ اس بھائی نے اپنی غیرت کو کس طرح بستی میں پہنچ کر زندہ رکھا ہے؟"

ضمیر اسے بتانے لگا کہ کس طرح صمدو نے ایک قبر تیار کی اور اسے وہ بستی والوں کو بتاتا ہے کہ یہ اس کی بہن کی قبر ہے جو عزت آبرو سے مر گئی۔ اب اس کی بہن زندہ سلامت بستی میں واپس جائے گی تو بھائی اسے قبول نہیں کرے گا۔ صرف ضمیر ہی شریک حیات کی حیثیت سے قبول کرنے کے لئے اسے تلاش کرنے کے لئے آیا ہے۔

ضمیر کی ساری باتیں سننے کے بعد ظفر محمود نے کہا۔ "مسٹر ضمیر! میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ آپ کے ساتھ پولیس کی جماعت نہ جائے۔ آپ تنہا

وہاں جائیں گے انسپکٹر اکرم علی آپ کے ساتھ جائے گا اور آپ کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہو گا۔ آپ چپ چاپ رانی کو وہاں سے اپنے گھر لے آئیں۔"

ضمیر نے حیرانی سے پوچھا۔ "آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس سلسلے میں کوئی کیس نہ بنے اور بدمعاشوں' ظالموں کو سزا نہ دی جائے؟"

"سزا تو ضرور ملنی چاہئے لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ تمہاری منگیتر بدنام ہو گی۔ بات آگے بڑھے گی۔ عدالت تک جائے گی' پھر وہ بھائی جو وہاں بہن کی قبر بنائے بیٹھا ہوا ہے وہ بھی بدنام ہو گا۔ اس مقدمے کی روداد کسی نہ کسی طرح بستی والوں تک پہنچ سکتی ہے۔ اگر تم ایک بھائی کی غیرت کا بھرم رکھنا چاہتے ہو تو اس معاملے کو بالکل دبا دو اور چپ چاپ اسے اپنی شریک حیات قبول کر لو۔"

ضمیر نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔ "آپ کا مشورہ بالکل درست ہے لیکن مجھے آپ کے منہ میں ایک پولیس افسر کی زبان معلوم نہیں ہوتی۔ آپ تو قانون کے محافظ ہیں۔ مجرموں کو ان کی سزا تک پہنچانا جانتے ہیں اور کسی مصلحت کو سامنے نہیں رکھتے بلکہ مجرموں کو سزا دے کر دوسروں کو عبرت کا موقع فراہم کرتے ہیں مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہے۔"

ان کی باتوں کے دوران انسپکٹر اکرم علی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ادب سے ظفر محمود کو سلام کیا۔

ظفر محمود نے کہا۔ "ان سے ملو۔ یہ مسٹر ضمیر حسن ہیں۔"

ضمیر نے اٹھ کر بے دلی سے اس کے ساتھ مصافحہ کیا۔ ظفر محمود نے کہا۔ "مسٹر ضمیر! یہ میرے داماد اکرم علی ہیں۔"

یہ سنتے ہی ضمیر پر جیسے بجلی گر پڑی۔ اس نے ایک دم سے چونک کر ایک بار ظفر محمود کو دیکھا۔ پھر اکرم علی کو دیکھا۔ اِس کے بعد جھاگ کی طرح صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں آگیا کہ ایک سسر اپنے داماد کو سزا تک پہنچنے نہیں دے گا۔

ظفر محمود نے کہا۔ "مسٹر ضمیر! دیکھئے' چھوٹے موٹے دھندے تو سبھی کرتے ہیں۔ پھر پولیس والوں کی تنخواہ ہی کیا ہوتی ہے' جب تک اُوپری آمدنی نہ ہو تو گزارہ نہیں ہوتا۔ میرے داماد اکرم علی نے جو کچھ کیا اس کے لئے میں شرمندہ ہوں۔ میں ابھی اس سے کہتا ہوں' وہ لڑکی آپ کو واپس مل جائے گی۔"

اکرم علی نے انجان بن کر پوچھا۔ "ماموں جان! آپ کس لڑکی کی بات کر رہے

ہیں؟"

ظفر محمود نے ڈانٹ کر کہا۔ "بکواس مت کرو۔ اس کا نام رانی ہے اور پچھلے پانچ ماہ سے وہ تمہاری قید میں ہے۔"

یہ سنتے ہی وہ ایک دم سے ساکت ہو گیا۔ پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "آپ کو غلط رپورٹ ملی ہے۔ میرے خلاف بھڑکایا گیا ہے۔"

ظفر محمود نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ اندر آؤ۔ تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا اندرونی کمرے میں چلا گیا۔ اس کے پیچھے اکرم علی بھی جانے لگا۔ ضمیر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا۔ خدایا! کیا ہو گا؟ میں کہاں آ کر پھنس گیا ہوں۔ یہ لوگ تو میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی رانی کو وہاں سے بھی غائب کر سکتے ہیں۔ میں ان کا کیا بگاڑ لوں گا۔ قانون اور طاقت سب کچھ ان کے ہاتھ میں ہے۔

ظفر محمود نے اندر ایک کمرے میں پہنچ کر کہا۔ "دیکھو اکرم! تم میرے داماد بھی ہو اور بھانجے بھی۔ رشتے کے لحاظ سے میں تمہاری کھال ادھیڑ دوں گا اور عہدے کے اعتبار سے تمہاری ملازمت چھین لوں گا۔ تم مجھ سے زیادہ اڑنے کی کوشش مت کرو۔ صاف صاف بیان دو کہ تم نے اس لڑکی کے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ تم نے میری بیٹی کی توہین کی ہے۔ میری بیٹی سے ناانصافی کی ہے۔ میں تمہارے تمام جرائم کو جانتا ہوں جو وہاں چمن گوٹھ میں بیٹھ کر تم کرتے رہتے ہو' لیکن آنکھیں اس لئے بند کر لیتا ہوں کہ تم میرے داماد ہو' لیکن جب میری بیٹی کے ساتھ ناانصافی ہو گی تو میں تمہارا دشمن بن جاؤں گا۔"

بات اپنی بیٹی اور اپنی بہن کی ہوتی ہے' جب اپنے تک بات آتی ہے تو آدمی تھوڑا سا انسان بن کر سوچتا ہے کہ دوسرے کا دکھ درد محسوس کرے۔ اس وقت ظفر محمود اپنے داماد کے خلاف کچھ کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اپنی بیٹی سے ہونے والی ناانصافی کو ختم کرنے کے لئے جلد سے جلد رانی کو .... ضمیر کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ رانی کہیں اس کی بیٹی کی سوکن نہ بن جائے۔

ظفر محمود نے غصے اور ناگواری سے کہا۔ "اس دیہاتی لڑکی کے ساتھ گنہگار بنتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی۔ تمہیں اپنی پوزیشن اور میرے مرتبے کا خیال نہیں آیا؟"

اکرم علی نے کہا۔ "ماموں جان! آپ ناحق ناراض ہوتے ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں

کہ میں نے پانچ مہینے سے ایک لڑکی کو قید میں رکھا ہے لیکن قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں گنہگار نہیں بنا۔ وہ لڑکی عجب مصیبت بن گئی ہے۔ میں اسے دیہات کی ایک معمولی' کمزور سی لڑکی سمجھتا تھا مگر وہ شیرنی ہے۔ میں اب تک اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔"

"تو اسے قید میں کیوں رکھا ہے؟"

"میں کیا کروں۔ مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اسے قید سے چھوڑتا ہوں تو باہر جا کر وہ میرے لئے بدنامی کا باعث بن جائے گی۔ پھر یہ کہ جہاں میں نے اسے رکھا ہے وہاں سے وہ نکلنا نہیں چاہتی۔ کہتی ہے اس کا بھائی آئے گا تب ہی وہ باہر آئے گی۔"

ظفر محمود نے ڈانٹ کر کہا۔ "کیا بکواس کرتے ہو۔ ایک معمولی لڑکی جو کہتی ہے' اس پر عمل کر رہے ہو۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر دھکا دے دو۔ وہ کہیں بھی جائے' تمہارے سر سے تو الزام ہٹ جائے گا۔"

"ماموں جان! یہی تو آپ سمجھتے نہیں ہیں۔ ہم اس کے سامنے نہیں جا سکتے۔ اس کے ہاتھ کوئی پستول لگ گیا ہے۔"

ظفر محمود نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا؟ اس کے ہاتھ پستول کیسے لگ گیا ہے؟"

"بس کیا بتاؤں' ہماری غلطی سے وہ پستول تک پہنچ گئی۔ اب جس کمرے میں ہے وہاں کسی کو آنے نہیں دیتی۔ ہمارا جو آدمی پہلے پہل گیا تھا وہ اس کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ ہم نے بڑی مشکل سے اس کی لاش چھپائی۔ اب وہاں کوئی بھی نہیں جاتا۔ دروازہ بند رہتا ہے اور دروازے کے نچلے حصے سے ہم اسے کھانا پہنچاتے ہیں۔"

ظفر محمود نے دانت پیس کر کہا۔ "اوہ' بے وقوف گدھے کہیں کے' تم نے اب تک اسے زندہ رکھا ہے۔ اسے کھانا پہنچا رہے ہو۔ تمہیں اتنی عقل نہیں ہے کہ جس مجرم سے ہمیں پیچھا چھڑانا ہوتا ہے تو ہم پولیس مقابلے کی رپورٹ تیار کر کے اسے گولی مار دیتے ہیں۔ تمہارے پاس بہت اچھا موقع ہے کیا تم اسے کھانے میں زہر ملا کر مار نہیں سکتے تھے۔ کیا اس کی لاش کہیں پھنکوا نہیں سکتے تھے؟"

"میں نے یہ بھی کیا۔ اسے زہر دینے کی بھی کوشش کی۔ ایک رات ہم نے ایک پیالے میں دودھ میں زہر ملا کر اسے پینے کے لئے دیا۔ صبح جب ہمارا آدمی دروازے پر جا کر دستک دینے لگا تو ہم سب سمجھ رہے تھے کہ وہ مر چکی ہو گی۔ دروازہ نہیں کھول سکے گی۔ یہ دروازہ توڑنا ہو گا' مگر دروازے کے نیچے سے اس نے ایک بلی کی لاش کھسکا دی۔"

ظفر محمود دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا اور پریشان ہو کر اپنے داماد کو دیکھنے لگا جسے ایک بلا نے گھیر لیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اس کے بعد سے وہ لڑکی ہوشیار ہو گئی۔ اب جب بھی اس کے سامنے کھانا پہنچایا جاتا ہے تو وہ دروازہ کھول دیتی ہے اور پستول کا نشانہ لے کر کھانا لانے والے آدمی سے کہتی ہے کہ سامنے بیٹھ کر کھانا کھائے۔ جب وہ آدھا کھانا کھا لیتا ہے تو وہ اسے دیکھتی ہے۔ تھوڑی دیر تک روکے رکھتی ہے۔ جب وہ زندہ رہتا ہے تو اسے رخصت کر دیتی ہے۔ دروازے کو اندر سے بند کر دیتی ہے' پھر اس کا جھوٹا بچا ہوا کھانا کھا لیتی ہے۔"

ظفر محمود نے جھنجلا کر کہا۔ "تم نے کس بلا کو اپنے سر پر چڑھا لیا ہے۔ اب یہ مصیبت کیسے دور ہو گی؟"

"ماموں جان! آپ فکر نہ کریں۔ ہم نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ کسی طرح یہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑ رہی ہے تو میں نے اسے سلو پوائزن دینا شروع کیا ہے۔ اب جو کھانا جاتا ہے اس میں اتنی کم مقدار میں زہر ہوتا ہے کہ کھانے والا آدمی فوراً نہیں مر سکتا۔ یہ چار پانچ دن تک زندہ رہے گی اور جو آدمی اس کے سامنے بیٹھ کر کھاتا ہے اسے بھی اس بات کا علم نہیں ہے۔ وہ بے چارہ آدھا کھانا کھا کر اس کے کمرے سے رخصت ہو جاتا ہے پھر آدھا کھانا وہ خود کھاتی ہے۔ یعنی ہمارے حساب سے ایک ہفتے بعد وہ دونوں کھانا کھانے والے مر جائیں گے۔"

"انہیں کب سے زہر دیا جا رہا ہے؟"

"آج تیسرا دن ہے۔"

ظفر محمود اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ تین دن کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس لڑکی کے نصیب میں زندہ رہنا ہو گا تو رہے گی نہیں تو مر جائے گی۔ فی الحال اس سے نجات پانے کا راستہ یہی ہے کہ وہ شخص اسے لینے آیا ہے' ہم چپ چاپ اس کے حوالے کر دیں۔ ہم اس پر ظاہر نہیں کریں گے کہ ہم اپنی عزت اور اپنے عہدوں کا بھرم رکھنے کے لئے ایسا کر رہے ہیں۔ میں نے اس لڑکی کے بھائی کا حوالہ دیا ہے کہ اس کی غیرت کا بھرم رکھنے کے لئے ضمیر کو یہ کیس آگے نہیں بڑھانا چاہئے۔ بات پر مٹی ڈال دیں اور لڑکی کو عزت و آبرو سے چپ چاپ وہ اپنے پاس رکھ لیں اس کے لئے وہ راضی ہے۔ ابھی تم اس کے ساتھ جاؤ اور لڑکی کو اس کے حوالے کر دو۔"

"ماموں جان! کہیں یہ مسٹر ضمیر بعد میں ہمارے لئے مصیبت نہ بن جائے۔ کیوں نہ

انہیں بھی راستے سے............"

ظفر محمود نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں نہیں' میں مسٹر ضمیر کو لندن سے جانتا ہوں۔ یہ بہت ہی مصلحت شناس آدمی ہیں اور یہ رانی کی عزت رکھنے کے لئے اور اس کے بھائی کی غیرت کا بھرم رکھنے کے لئے بات آگے نہیں بڑھائیں گے۔ جب بات آگے نہیں بڑھے گی تو ہمیں کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہے۔ جو میں کہتا ہوں' اس پر عمل کرو اور ابھی جا کر لڑکی ان کے حوالے کر دو۔"

☆======☆======☆

وہ چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا۔ کمرے میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی لیکن وہ اندھیرے میں یہ سمجھ سکتی تھی کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہوئی ہے۔ وہ ایک لانبا سا کمرہ تھا۔ پچھلی دیوار کی طرف ایک کھڑکی تھی جس پر آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ سامنے ایک دروازہ تھا اور باقی چار دیواری اتنی مضبوط تھی کہ وہ وہاں سے نکل کر بھاگ نہیں سکتی تھی۔

اس کمرے کا دروازہ چوبیس گھنٹے میں دو بار کھلتا تھا ایک دن کے دس بجے' دوسرا رات کے دس بجے۔ دونوں وقت دروازے پر دستک ہوتی تھی۔ پھر دروازے کے نچلے حصے میں اتنی جگہ تھی کہ ایک پیالہ اور ایک پلیٹ کھسکا کر کھانا اندر پہنچایا جا سکتا تھا۔ وہ ہر روز انتظار کرتی تھی کہ کبھی دروازے پر دستک کے ساتھ اس کے بھیا کی آواز سنائی دے' پھر وہ دوڑ کر دروازہ کھولے اور اپنے بھیا کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر اتنا روئے' اتنا روئے کہ روتے روتے مر جائے۔

مگر اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی تھی۔ پتہ نہیں کتنے دن اور کتنی راتیں گزر چکی تھیں۔ بھیا کی آواز سنائی نہیں دی تھی اور نہ ہی بھائی کا چہرہ نظر آیا تھا' وہ سوچنے لگی۔ کتنے دن گزرے ہیں اور کتنی راتیں بیتی ہیں۔ وہ حساب لگانے لگی۔ اسے یاد آیا۔

مئی کی پانچ تاریخ کو وہ اپنے بھائی کے ساتھ بیل گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئی تھی اور چھ تاریخ کو شہر کے اس علاقے میں پہنچی تھی۔ یہیں سے اس کی بدنصیبی کا آغاز ہوا تھا۔ رات کو سونے کے بعد جب اچانک ہی اس کی آنکھ کھلی تو کوئی اس کے منہ پر کپڑا رکھ کر اسے اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ کسی دوا کے اثر سے بے ہوش کیا گیا تھا۔ جب آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو کسی دوسرے مکان کے اندر پایا۔ وہ ایک چارپائی پر پڑی ہوئی تھی۔ ہوش آتے ہی وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

تب اسے کمرے کے دروازے پر دو بدمعاش نظر آئے۔ ان میں سے ایک نے اس کے اٹھتے ہی ایک لمبا سا چاقو کھول لیا۔ پھر اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "شور نہ مچانا ورنہ تمہارے ٹکڑے کر کے رکھ دوں گا۔"

وہ سہم کر بولی۔ "میں کہاں ہوں؟ تم لوگ کون ہو؟ میرے بھیا کہاں ہیں؟"

"تمہارا بھائی تمہیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اب تم ہمارے پاس رہو گی اور جیسا ہم کہیں گے ویسے ہی کرو گی۔"

"نہیں' میں اپنے بھیا کے پاس جاؤں گی۔ مجھے میرے بھیا کے پاس پہنچا دو۔"

"دیکھو' چیخنے چلانے کی کوشش نہ کرو۔ اپنی زندگی چاہتی ہو تو خاموش رہو۔ تمہارا بھائی تو بڑا غیرت مند بنتا ہے۔ تم چیخ چیخ کر کیا اس کی عزت کا جنازہ نکالنا چاہتی ہو؟"

وہ چپ ہو گئی۔ اسے یاد آیا کہ اس کا بھائی کیسا غیرتمند ہے۔ اگر اسے معلوم ہو گا کہ اس کی بہن دو بدمعاشوں کے ساتھ ایک کمرے میں تھی تو وہ شرم سے مرجائے گا۔ لہٰذا اسے چیخ چیخ کر لوگوں کو جمع نہیں کرنا چاہئے۔ وہ بدنام ہو گی تو اس کی بدنامی اس کے بھائی کو کھا جائے گی۔

شرم نے اس کی زبان بند کر دی تھی۔ یوں بھی وہ بدمعاش اسے ہاتھ نہیں لگ رہے تھے۔ ابھی اس کی عزت محفوظ تھی کیونکہ وہ تھانیدار کی امانت سمجھی جارہی تھی۔ تھانیدار کے مال کو کوئی دوسرا ہاتھ نہیں لگاتا۔ اس لئے وہ حالات سے سمجھوتہ کر رہی تھی

دو دن بعد تھانیدار آیا۔ وہ اس کے سائے سے دور بھاگنے لگی۔ اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "کب تک مجھ سے بھاگو گی؟ اس چاردیواری کے اندر ہی بھاگتی رہو گی۔ میری بات مان لو آرام سے میرے بازوؤں میں آجاؤ۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں' تمہاری عزت کرتا ہوں۔ تم پر ظلم نہیں کروں گا۔"

"اگر تم ظلم نہیں کرنا چاہتے تو مجھے میرے بھائی کے پاس پہنچا دو۔"

"تمہارا بھائی تو بالکل بے وقوف ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ تھانے میں رپورٹ لکھا دو لیکن اس نے انکار کر دیا اس کا نام تو مجھے معلوم ہو گیا ہے لیکن یہ نہیں پتہ چلا کہ تم لوگ کس گاؤں سے آئے ہو اور تمہارا وہاں کا پتہ کیا ہے؟"

رانی نے پوچھا۔ "کیا میرے بھائی نے یہ سب نہیں بتایا؟"

"ہاں' اس نے نہیں بتایا' کہتا ہے کہ میری غیرت کا معاملہ ہے۔ میری بہن کو اغوا کیا گیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ بات میری بستی والوں تک پہنچے۔ میں کسی کو منہ دکھانے

کے قابل نہیں رہوں گا۔ میں اپنی بہن کو تلاش کرتا رہوں گا۔ جب وہ مل جائے گی تو میں اسے ساتھ لے جاؤں گا' نہیں تو واپس نہیں جاؤں گا۔"

"خدا کے لئے مجھے میرے بھیا کے پاس پہنچا دو۔"

"ضرور پہنچا دوں گا' پہلے مجھے خوش کر دو۔"

"تمہیں ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ کیا تمہاری کوئی بہن نہیں ہے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "بہن تو ہے' تمہاری جیسی کوئی پھلجھڑی نہیں ہے۔ دیکھو میں تمہیں عقل کی بات سمجھاتا ہوں۔ اگر میری بات مان لو گی تو میں تمہیں کل تک تمہارے بھائی کے پاس پہنچا دوں گا۔ اگر بات نہیں مانو گی تو کبھی اپنے بھائی کا منہ نہیں دیکھ سکو گی۔"

"میں اپنی جان دے دوں گی لیکن تمہیں اپنے پاس آنے نہیں دوں گی۔"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا۔ "میں بھی زبردستی کا سودا نہیں کرتا۔ ابھی میں تمہیں سوچنے سمجھنے کا موقع دوں گا۔ دیکھو' تم اتنی حسین ہو کہ میرے دل میں سما گئی ہو۔ میں تمہیں ساری زندگی کے لئے اپنا بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے لئے کھانے' کپڑے اور زندگی گزارنے کا سارا سامان مہیا کر دوں گا۔ تم آرام سے ایک مکان میں رہو گی اور میں تمہارے پاس آیا کروں گا۔ تمہیں کسی بات کی تکلیف نہیں ہو گی۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہو گی۔ اگر تم ساری زندگی میرے پاس گزارنا چاہتی ہو تو اپنے بھائی کو بھول جاؤ اور اگر اپنے بھیا کے پاس واپس جانا چاہتی ہو تو دو چار روز تک مجھے خوش کرتی رہو۔ اس کے بعد میں تمہیں تمہارے بھائی کے پاس واپس پہنچا دوں گا۔ ابھی وقت ہے' خوب اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ میں کل پھر آؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ پھر روز آنے لگا اور روز سمجھانے لگا' اس نے کہا۔ "ایک بات مانتا ہوں تم سمجھدار ہو۔ چیختی چلاتی نہیں ہو۔ لوگوں کو مدد کے لئے نہیں بلاتی ہو۔ اس بات سے مجھے اُمید ہو چلی ہے کہ تم مجھے دل ہی دل میں پسند کرنے لگی ہو۔ مجھے چاہتی ہو مگر......."

رانی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "تم خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ میں اپنے بھیا کے سوا کسی سے محبت نہیں کر سکتی اور میں بھیا کی وجہ سے خاموش رہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ چیخنا چلانا شروع کروں گی' لوگ میری مدد کے لئے آئیں گے' بات بڑھے گی' اس طرح میں کسی نہ کسی طور اپنے بھیا کے پاس پہنچا دی جاؤں گی لیکن جس بدنامی کے ساتھ پہنچائی

جاؤں گی وہ نہ تو مجھے قبول ہے اور نہ میرے بھیا اسے برداشت کریں گے۔ اس لئے میں چپ رہتی ہوں۔ سوچتی ہوں کہ کس مصیبت میں آ پھنسی ہوں اور کس طرح عزت آبرو سے نکل کر جا سکتی ہوں؟ تم نے تو مجھے جیتے جی مار ڈالا ہے۔ سوچتی ہوں' عزت آبرو سے بھی جاؤں گی تو بھیا اسے تسلیم کریں گے نہ دنیا والے مانیں گے۔ میں تو ہر حال میں بدنام ہوں گی۔"

"یہ ہوئی نا عقلمندی کی بات۔ جب بدنامی کا الزام اٹھانا ہے تو کیوں نہ بدنامی کا اہتمام بھی کر لیا جائے۔"

وہ آگے بڑھا' رانی پیچھے ہٹ کر بولی۔ "مجھ سے دور رہو۔ مجھے مجبور نہ کرو کہ میں چپ رہنا چھوڑ دوں اور چلانا شروع کر دوں۔ بدنامی اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ چیخ کر' چلا کر یہاں آس پاس کے لوگوں کو جمع کر لوں۔ جب بات آگے بڑھے گی تو میں کہہ دوں گی کہ میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ میں کسی کی بہن نہیں ہوں۔ تب کوئی نہ کوئی مجھے دارالامان تک پہنچا دے گا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "دارالامان تک پولیس والے ہی پہنچاتے ہیں۔ نادان نہ بنو' اپنے حالات کو سمجھو۔ میں اس علاقے کا تھانیدار ہوں۔ کوئی تمہیں میری مرضی کے خلاف یہاں سے نکال کر نہیں لے جا سکے گا۔ جو لوگ تمہاری آواز سنیں گے وہ سن کر بہرے بن جائیں گے۔ تمہیں سمجھاتے سمجھاتے تو تین ہفتے گزر چکے ہیں۔ اس عرصے میں تمہیں اتنی عقل تو آئی ہے کہ پارسا رہنے کے باوجود تم بدنام ہو چکی ہو۔ اپنے چہرے سے بدنامی کی سیاہی باہر جا کر نہیں مٹا سکو گی۔ اب تمہیں رفتہ رفتہ یہ عقل بھی آ جائے گی کہ دنیا میں ایک ہی آدمی تمہاری عزت کرتا ہے اور کرتا رہے گا اور وہ میں ہوں۔ اگر اپنی عزت کرانا چاہتی ہو تو میرے بازوؤں میں آ جانا۔ میں ابھی تمہیں ڈھیل دے رہا ہوں۔ مجھے اطمینان ہے کہ تم یہاں سے کہیں جا نہیں سکو گی۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جانے لگا۔ باہر کھڑے ہوئے دو بدمعاشوں میں سے ایک نے کہا۔ "جناب عالی! اتنے دن ہو گئے یہ مانتی نہیں ہے۔ آپ حکم دیں' ہم اس کی ایسی پٹائی کریں گے کہ یہ آپ کے قدموں میں گر جائے گی۔"

انسپکٹر اکرم علی نے کہا۔ "نہیں' یہ بہت ہی پیاری چیز ہے۔ میں اسے پیار سے حاصل کروں گا۔ یہ آخر جائے گی کہاں؟ پیار کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ بس ذرا صبر کی ضرورت ہے اور میں بڑا صابر ہوں۔"

اسے جس کمرے میں قید کیا گیا تھا اس کے وہ دروازے کھول دیئے گئے جو دوسرے کمرے میں کھلتے تھے۔ وہ ایک بڑا سا مکان تھا۔ اس میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت نظر آئی۔ اس نے رانی کو بیٹی کہہ کر مخاطب کیا۔ ایک ماں کی طرح اس کی دلجوئی کی۔ پھر رفتہ رفتہ وہ رانی کے دل میں جگہ بنانے لگی۔ جب سے وہ عورت نظر آئی تھی تب سے تھانیدار اکرم علی نے وہاں آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔

رانی سہمے ہوئے انداز میں تھانیدار کا انتظار کرتی تھی۔ سوچتی تھی' وہ آئے گا تو اسے منہ توڑ جواب دیا کرے گی لیکن اس نے آنا ترک کر دیا تھا۔ چار دن بعد رانی نے پوچھا۔ "ماں جی! وہ تھانیدار کہاں چلا گیا۔ اب کیوں نہیں آتا؟"

"چھوڑو بیٹی! اس کی باتیں نہ کرو۔ میں بھی تمہاری طرح مجبور عورت ہوں اور یہاں مجھے بھی قید کیا گیا ہے۔ یہ تو میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ ہم یہاں کسی طرح گزارہ کریں گے۔ کبھی یہاں سے نکل بھاگنے کا موقع ملا تو بھاگ جائیں گے۔ بہرحال جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں' تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔"

دو مہینے گزر گئے۔ وہ اس عورت کے ساتھ فرار نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ آگے پیچھے والے دروازے پر بدمعاشوں کا سخت پہرہ رہتا تھا۔ دن رات کوئی نہ کوئی وہاں دکھائی دیتا تھا۔ پھر تیسرے مہینے رانی نے محسوس کیا کہ وہ بوڑھی عورت اسے آہستہ آہستہ ایک مرد کی اہمیت کا احساس دلا رہی ہے۔ وہ اس سے کہتی تھی۔ "بیٹی! تم جوان ہو' خوبصورت ہو۔ کسی مرد کے سہارے کے بغیر تنہا زندگی نہیں گزار سکتیں۔ تمہارا بھائی اس شہر میں ہوتا تو شاید تلاش کرتا ہوا یہاں پہنچ جاتا۔ وہ جا چکا ہے۔ اب تم بھائی کا آسرا چھوڑ دو۔"

"کیسے چھوڑ دوں۔ وہی تو اتنی بڑی دنیا میں میرا آسرا ہے۔"

"نہیں بیٹی! بھائی' باپ یہ سب عارضی سہارے ہوتے ہیں۔ زندگی بھر تو کسی ایک مرد کو اپنا بنا کر رہنا پڑتا ہے تو تم اپنے آپ کو اس بات کے لئے آمادہ کرو کہ اب تم کسی کی ہو کر رہو گی۔"

"یعنی آپ چاہتی ہیں کہ میں کسی سے شادی کر لوں؟"

"شادی کی بات تو نہ کرو۔ اس لئے کہ تم بدنام ہو چکی ہو۔ کوئی بھی مرد تم سے شادی نہیں کرے گا۔ ہاں تمہیں زندگی بھر سہارا دے سکتا ہے۔ تمہارے رہنے کے لئے ٹھکانہ بنا سکتا ہے' تمہیں تین وقت کی روٹی کھلا سکتا ہے مگر شادی نہیں کر سکتا۔"

"ایسی بات نہ کریں ماں جی! یہ تو گناہ ہو گا۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔"

رفتہ رفتہ دن گزرنے لگے۔ وہ عورت بہت چالاک تھی۔ بہت ٹھہر کر اور معاملے کو ٹالنے کے بعد پھر نئے سرے سے ذکر چھیڑ کر اسے آمادہ کرنے کی کوشش کرتی تھی کہ وہ کسی مرد کی ہو جائے۔ تین مہینے گزر گئے۔ چوتھے مہینے رانی نے عاجز آ کر پوچھا۔ "آخر ہم یہاں کب تک قید رہیں گے؟"

"بیٹی! یہ تو تم پر ہے۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچی ہو کہ تھانیدار سے سمجھوتہ کرنا ہو گا۔ اگر تم اسے اپنا سمجھ لو تو پھر مجھے بھی یہاں سے آزادی مل جائے گی اور تم بھی عیش و آرام سے رہو گی۔"

رانی یہ سن کر اس عورت سے ناراض ہو گئی۔ اس سے بات کرنا چھوڑ دیا مگر اس عورت نے پھر اسے سمجھا منا لیا۔ رانی کرتی بھی کیا۔ وہی ایک عورت اس کا سہارا تھی اور تنہائی میں اس کے ساتھ وقت گزارنا تھا۔

چار مہینے گزر گئے۔ اب اس عورت کے تیور بدل رہے تھے۔ اس نے کہا۔ "رانی کل رات تم سو رہی تھیں کہ تھانیدار آیا تھا اور تمہارے کمرے میں جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ وہ بھی سمجھدار ہے۔ کہتا ہے کہ لڑکی راضی ہو تو بڑی اچھی بات ہوتی ہے۔ زبردستی کا سودا اچھا نہیں ہوتا اور عیش و آرام حرام ہو جاتا ہے۔ وہ تمہیں حرام سمجھ کر قبول نہیں کرنا چاہتا' حلال کرنا چاہتا ہے۔"

رانی نے غصے سے کہا۔ "تو میں کیا کروں۔ میں اس کے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔"

"ایسا مت کہو۔ ساری زندگی اس طرح تو نہیں رہ سکو گی۔ جب تک وہ شرافت سے ڈھیل دے رہا ہے تمہارا دیوانہ بنا ہوا ہے اس وقت تک تم یہاں سکون سے ہو۔ جب وہ بدمعاشی پر اتر آئے گا تو تمہارے سارے نخرے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔"

چار ماہ دو ہفتے گزر گئے۔ تب ایک رات اس عورت نے کہا۔ "میں نے یہاں پچھلے دروازے پر پہرہ دینے والے ایک بدمعاش کو اپنے ساتھ لگا لیا ہے اور ہم آج آدھی رات کے بعد یہاں سے فرار ہو جائیں گے' وہ ہمیں ایک جگہ لے جائے گا اور وہاں ہم چھپ کر رہیں گے۔"

رانی خوش ہو گئی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کی عزت سے کھیلنے کے لئے یہ سب چالیں چلی جا رہی ہیں۔ آدھی رات کے بعد وہ اس عورت کے ساتھ اس مکان سے نکلی۔

پھر سینما ہال کے پیچھے والے حصے میں جہاں دارو کی بھٹی تھی اور دارو کی بھٹی کے پیچھے جوئے اور شراب خانے کا اڈہ تھا' وہیں ایک کمرے میں اس عورت نے رانی کو پہنچا دیا۔

اور وہ یہی کمرہ تھا جہاں وہ اب بیٹھی ہوئی تھی۔ چاروں طرف گہری تاریکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا اور وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ جب وہ کمرے میں اس عورت کے ساتھ آئی تو نہتی تھی۔ یہاں چھ ہٹے کٹے پہلوان قسم کے لوگ موجود تھے۔ تھانیدار اکرم علی اس چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس عورت نے رانی کو کمرے میں پہنچاتے ہوئے کہا۔ "تھانیدار جی! مجھ جیسی تجربہ کار عورت بھی اس چھوکری کے سامنے ہار گئی۔ نہ تو یہ محبت سے مانتی ہے اور نہ غصے سے دبتی ہے۔ اس کے ساتھ زبردستی کرنی ہو گی۔ ٹیڑھی انگلی سے گھی نکلے گا۔ یہ سیدھی طرح ماننے والی نہیں ہے۔ لو' اب میں چلی ہوں۔"

وہ چلی گئی۔ بدمعاش نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ تھانیدار نے کہا۔ "دیکھو' اب تک میں ڈھیل دیتا رہا۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ تم سے زبردستی کرنی ہو گی۔ جہاں تمہیں اب تک رکھا گیا تھا وہ شریفوں کا محلہ تھا۔ میں وہاں تمہاری چیخ و پکار برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بدنامی کا اندیشہ تھا اس لئے یہاں تمہیں بلوایا ہے۔ یہاں جتنا بھی چیخنا چلانا چاہو' اپنی حسرت پوری کر لینا۔ کوئی تمہاری مدد کے لئے نہیں آئے گا۔ ا رہا سوال یہ کہ تم سیدھی طرح راضی ہو گی یا ان چھ درندوں کے حوالے کر کے یہاں سے میں چلا جاؤں۔ یہ تمہیں صبح تک نوچ کھسوٹ کر رکھ دیں گے اور اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں ان درندوں کے حوالے نہ کروں تو سیدھی طرح یہاں میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ تھانیدار اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آیا۔ پھر اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے کر اسے چارپائی پر لا کر بٹھا دیا۔ اس کے بعد اپنے چمچوں سے بولا۔ "تم سب باہر جا کر دروازے کے پاس ہی کھڑے رہو۔ اگر یہ انکار کرے گی اور مجھ سے نفرت کرے گی تو میں دروازہ کھول کر باہر آ جاؤں گا' اور تم سب اندر چلے آنا۔"

اس کی بات سن کر وہ لوگ باہر جانے لگے۔ تھانیدار نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پھر اس کے پاس آ کر پیار و محبت سے سمجھانے لگا۔ وہ روتی جا رہی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ پھر اس نے تھوڑی دیر بعد اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر دیکھا تو آنسوؤں کے دھندلکے میں اسے تھانیدار نظر آیا۔ اس وقت وہ وردی میں نہیں تھا اور نہ

ہی اس کی کمر سے ہولسٹر لٹک رہا تھا لیکن سادے لباس میں بھی اس نے ایک پستول چھپا رکھا تھا۔ وہ پستول اس نے پلنگ کے سرہانے تکیے کے نیچے رکھا۔ اس کے بعد اپنے کپڑے اتارنے لگا۔ ایسا کرتے وقت اس کی پیٹھ رانی کی طرف ہو گئی تھی۔ تبھی رانی کے دماغ میں ایک بجلی سی کوندی' اس نے پیچھے سے ایک زور کا دھکا اسے مارا۔ وہ لڑکھڑا کر آگے چلا گیا۔ پھر جتنی دیر میں وہ پلٹ کر آتا اتنی دیر میں رانی کے ہاتھ وہ پستول لگ گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پستول کو تھام کر کہا۔ "بس اب میرے نزدیک نہ آنا۔ تمہاری یا میری لاش ضرور گرے گی۔ زندگی چاہتے ہو تو دروازہ کھول کر باہر چلے جاؤ۔"

وہ بوکھلا گیا۔ اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ پستول کو تکیے کے نیچے رکھ کر وہ ذرا سا لاپرواہ اس لئے ہو گیا تھا کہ رانی کو محض ایک دیہاتی لڑکی سمجھ رہا تھا۔ اسے رانی کی طرف سے اتنی پھرتی اور حاضر دماغی کی توقع نہیں تھی۔ دراصل وہ عیاشی کے نشے میں احتیاط کو بھول چکا تھا اور اب پچھتا رہا تھا۔ اس نے سہم کر کہا۔ "یہ کیا کر رہی ہو۔ دیکھو' ٹریگر پر تمہاری انگلی ہے۔ اگر انگلی دب گئی تو گولی چل جائے گی۔"

"گولی چلنے سے پہلے باہر نکلو اور اپنے ساتھیوں سے کہو کہ میرے لئے راستہ چھوڑ دیں۔ نہیں تو جو بھی سامنے آئے گا میں اس پر گولی چلا دوں گی۔"

وہ پیچھے ہٹتے ہوئے دروازے کے پاس گیا۔ پھر اسے کھول کر باہر نکلتے ہی دروازے کو ایک جھٹکے سے بند کر دیا۔ اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔ "مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ میرا پستول اس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ اندر جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

ایک کی آواز سنائی دی۔ "جناب عالی! آپ پرواہ نہ کریں۔ اس چھوکری کی کیا مجال ہے کہ وہ گولی چلائے۔ میں اس سے نمٹ لوں گا۔"

اندر سے رانی نے کہا۔ "جو بھی دروازہ کھول کر آئے گا میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ میں کہتی ہوں۔ دروازے کو کھولو اور مجھے باہر نکلنے دو۔"

باہر سے کہا گیا۔ "دروازہ نہیں کھلے گا۔"

رانی تیزی سے چلتی ہوئی دروازے کے پاس آئی۔ وہ دروازے کو کھولنا چاہتی تھی مگر اس کے نچلے حصے سے ایک شخص نے دیکھ لیا تھا کہ وہ دروازے کے قریب آ گئی ہے۔ اسی وقت ان میں سے ایک نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا تاکہ رانی کو دروازے کے پٹ سے چوٹ لگے تو وہ لڑکھڑا کر پیچھے جائے اور اس کے پستول پر قبضہ جما لیا جائے لیکن

دروازہ کھلتے ہی عین وقت پر وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی گولی چلا دی تھی۔ ایک شخص کی چیخ سنائی دی۔ پھر وہ لڑکھڑا کر دروازے کے باہر ہی گر پڑا تھا۔ باقی ادھر ادھر بکھر گئے اور چھپ کر اپنے طور پر محاذ بنانے لگے تاکہ وہ وہاں سے نکل کر جانے نہ پائے۔ رانی نے باہر کی طرف دیکھا تو اسے خطرہ محسوس ہوا۔ اس نے دروازے کو دوبارہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں رہوں گی۔ میرے بھیا کو میرے پاس بھیج دو تو میں ان کے ساتھ بھاگ نکلوں گی یا پھر جب مجھے یقین ہو گا کہ تم میں سے کوئی باہر موجود نہیں ہے تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

لیکن وہ تاحال باہر نہ جا سکی اور نہ ہی اس کا بھیا اسے لینے آیا۔ اس کمرے میں قید ہونے کے بعد اب یہ دوسرا ہفتہ گزر رہا تھا۔ اس دوران اسے ہلاک کرنے کے لئے دودھ میں زہر گھول کر دیا گیا تھا۔ وہ دودھ پینے جا رہی تھی۔ پھر اچانک ہی اس نے سوچا کہ اسے سوکھی روٹی' چٹنی اور بھاجی دینے والے آج دودھ پینے کے لئے کیوں دے رہے ہیں۔ اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ دودھ پیئے۔ اسی وقت پچھلی کھڑکی کی سلاخوں سے گزرتی ہوئی ایک بلی آئی تھی۔ اس نے بلی کو دودھ پلایا۔ جس کے نتیجے میں اس نے دوسری صبح اس بلی کی لاش کو دروازے سے باہر پہنچا دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اور محتاط ہو گئی تھی اور اب جو بھی کھانا لے کر آتا تھا پہلے اسے آدھا کھانا کھلاتی تھی' پھر بچا ہوا آدھا کھانا خود کھتی تھی۔

اتنی احتیاط کے باوجود بے چاری یہ نہیں جانتی تھی کہ پچھلے تین دنوں سے وہ کھانے میں ایسا زہر بھی نگل رہی ہے جو محسوس نہیں ہوتا اور جس کا اثر دیر سے ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کھا رہی تھی اس کا اثر رفتہ رفتہ ہونے والا تھا۔ فی الحال تو وہ زندہ سلامت بیٹھی ہوئی تھی۔

رات کے دس بجنے والے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اب اس کے لئے پھر ایک شخص کھانا لے کر آنے والا ہے۔ کمرے میں دور دور تک اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ بدبو ایسی تھی کہ دوسروں کے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ شروع شروع میں وہ بھی اس غلاظت اور بدبو کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ پھر ان دو ہفتوں میں مجبوراً عادی ہو رہی تھی۔ اس نے اسی کمرے کے ایک گوشے کو ٹوائلٹ بنا دیا تھا اور مجبوری کی حالت میں وہاں زندگی کی سانسیں لے رہی تھی۔

ایک طویل انتظار کے بعد دور کہیں سے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پستول پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

دروازے کے باہر روشنی نظر آ رہی تھی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس کا کمرہ بھی روشن ہو گیا۔ وہاں اس کمرے میں جو بلب تھا وہ بجھا ہوا رہتا تھا۔ ان لوگوں نے بجلی کا تار وہاں سے کاٹ دیا تھا اور اب شاید اسے دوبارہ جوڑ دیا تھا جس کی وجہ سے وہ تاریک کمرہ ایکبارگی روشن ہو گیا تھا اور اس کی آنکھیں چندھیانے لگی تھیں۔

دروازے پر دستک ہوئی' پھر آواز سنائی دی۔ "رانی دروازہ اندر سے کھولو اور گولی نہ چلاؤ۔ میں ضمیر ہوں۔ تمہارا ضمیر حسن اور تمہیں لینے آیا ہوں۔"

رانی نے کہا۔ "اب میں تم لوگوں کی کسی چال میں نہیں آؤں گی۔ میں دروازہ کھول رہی ہوں۔ جو آدمی کھانا لے کر آیا ہے اسے اندر بھیج دو۔"

ضمیر نے کہا۔ "رانی! کوئی کھانا لے کر نہیں آیا ہے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ گھر میں تمہیں اچھے سے اچھا کھلاؤں گا' پہناؤں گا۔ پھر تمہارے بھیا کو یہاں بلا کر لاؤں گا اور تمہیں ان سے ملاؤں گا۔"

"اگر تم سچ بول رہے ہو تو جاؤ پہلے میرے بھیا کو بلا کر لاؤ۔ پھر میں اس کمرے سے نکلوں گی۔"

وہ تھوڑی دیر تک اسے سمجھاتا رہا مگر وہ دروازہ کھولنے کے لئے راضی نہیں ہوئی' تب باہر خاموشی چھا گئی۔ جانے والے قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر وہی سناٹا۔ تھوڑی دیر بعد پھر آتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس بار کھانے کی پلیٹ اور سالن کا ایک پیالہ دروازے کے نیچے سے کھسک کر کمرے کے اندر آیا۔ تب رانی نے وہ پلیٹ اٹھا کر ایک طرف رکھی۔ پھر دروازے کو کھول دیا۔ بہت محتاط تھی پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ دروازہ کھولتے ہی اسے نیا چہرہ نظر آیا۔ وہ آدمی نہیں تھا جو پچھلے تین دنوں سے آ کر اس کے کھانے کا آدھا حصہ پہلے کھا لیا کرتا تھا۔ آنے والے نے کہا۔ "رانی! میں تمہارا ضمیر ہوں۔ کیا مجھ پر بھروسہ نہیں کرو گی؟"

وہ فوراً ہی پیچھے ہٹ گئی پستول کا رُخ اس کی طرف کرتے ہوئے بولی۔ "میری طرف نہ بڑھنا۔ نہیں تو گولی چلا دوں گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں تمہارے ہاتھوں سے مرنے کو تیار ہوں۔ تم مجھے مار ڈالو یا پھر میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم سمجھتی تو ہو کہ تمہارے بھیا کتنے غیرت مند ہیں۔ وہ بستی میں جا کر یہ مشہور کر چکے ہیں کہ تم مر چکی ہو۔ وہ یہاں سے کپڑے کا ایک پتلا بنا کر لے گئے تھے۔ اسے چادر میں لپیٹ دیا تھا۔ بستی والوں کے سامنے یہ کہا کہ تمہیں

کوڑھ ہو گیا تھا۔ اسی مرض میں مر گئیں۔ یہ سن کر کوئی اس پتلے کے قریب نہیں آیا اور تمہارے بھیا نے دور سے تماشا دیکھنے والے بستی کے لوگوں کی موجودگی میں اس پتلے کو دفن کر دیا۔ وہاں تمہاری قبر بنا دی۔"

"یقیناً میرے بھیا غیرت مند ہیں لیکن میں کیسے یقین کروں کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ سچ ہے۔"

"اس کا ثبوت تو اس وقت ملے گا جب میں تمہارے بھیا کو سمجھا منا کر یہاں شہر لاؤں گا۔ تم دونوں بھائی بہن ضدی اور غیرت مند ہو۔ تم لوگوں کو سمجھانا بہت مشکل ہے۔ میں تمہارے گھر گیا تھا۔ تمہارے کمرے میں' میں نے تمہارے بستر پر اپنی نیند پوری کی ہے اور تمہاری لکھی ہوئی ڈائری بھی پڑھی ہے۔"

تب رانی نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "بتاؤ' میری ڈائری میں کیا لکھا تھا؟"

"میں نے ڈائری کا آخری صفحہ پڑھا۔ جب تم وہاں سے روانہ ہو رہی تھیں تو اس صفحے پر لکھا تھا اور وہ تحریر ادھوری رہ گئی تھی۔ شاید تم نے سوچا ہو کہ اسے بعد میں مکمل کروں گی لیکن اس کے بعد وہاں جانا تمہیں نصیب نہیں ہوا۔"

"ہاں' تمہاری یہ بات درست ہے لیکن میں پوری طرح یقین کرنا چاہتی ہوں۔ اس ڈائری کی کچھ باتیں سناؤ۔"

"دیکھو' مجھے اچھی طرح یاد تو نہیں ہے لیکن تم نے اس آخری صفحے میں لکھا تھا کہ تمہیں آبی پرندوں سے بڑی محبت ہے اور تم دریا کے کنارے جا کر انہیں دیکھتی ہو۔ ان کی پرواز سے تمہیں دلچسپی ہے۔ ایک جگہ تم نے لکھا ہے کہ جس طرح آبی پرندے پرواز کے دوران دریا کی سطح کو چھوتے ہوئے گزرتے ہیں اسی طرح میری یاد تمہارے دل کو چھو کر گزرتی ہے۔"

یہ سنتے ہی رانی کی نظریں جھک گئیں۔ چہرے پر شرم کی لالی بکھرنے لگی۔ ان کی نگاہوں کے سامنے آبی پرندے پرواز کر رہے تھے اور دریا کی سطح کو چھو کر گزر رہے تھے۔ وہ اس منظر میں گم ہو رہی تھی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس کی ڈائری چوری بھی ہو سکتی ہے۔ کسی دوسرے کے ہاتھ لگ سکتی ہے۔ کوئی دوسرا پڑھ کر اسے بے وقوف بنا سکتا ہے۔ یہ سوچتے ہی وہ پھر پستول کا رخ اس کی طرف کرنا چاہتی تھی لیکن دیر ہو گئی۔ ضمیر نے ایک چھلانگ لگائی۔ پھر اس کے قریب پہنچتے ہی پستول والے ہاتھ کو اوپر اٹھا دیا۔

رات کے سناٹے میں فائرنگ کی آواز دور تک گونجتی چلی گئی لیکن ضمیر محفوظ تھا۔ رانی کی کلائی اس کی گرفت میں تھی۔ اس نے اس کلائی کو ایک جھٹکا دیا تو پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ رانی تڑپنے لگی۔ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ دوسرے ہاتھ سے وہ ضمیر کو مار رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "مجھے چھوڑ دو' میں تمہیں اپنی عزت تک پہنچنے نہیں دوں گی۔ اپنی اور تمہاری جان ایک کر دوں گی۔"

"رانی! سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تمہاری عزت کا دشمن نہیں' تمہارا محافظ ہوں۔ تمہارا ضمیر ہوں۔ تمہیں لینے آیا ہوں۔ آرام سے چلو' اب یہاں تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔ کوئی قید نہیں کرے گا۔ کوئی تم پر بری نظر نہیں ڈالے گا۔"

لیکن وہ یقین نہیں کر سکتی تھی۔ پچھلے پانچ مہینے سے دھوکے کھا رہی تھی۔ تھانیدار گرگٹ کی طرح رنگ بدل بدل کر آتا تھا۔ کبھی عاشق دیوانہ بن جاتا تھا۔ کبھی ظالم' عیاش بن کر اسے پریشان کرتا تھا۔ پھر ایک عورت کو ماں بنا کر بھیجا۔ ایسے ماحول میں وہ کسی پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے وہ تڑپ رہی تھی اور ضمیر کو مار رہی تھی۔ پھر کسی طرح جدوجہد کرتے کرتے وہ ایک دم سے نڈھال ہو کر گرنے لگی۔ ضمیر نے اسے دونوں بازوؤں میں سنبھال کر اٹھا لیا۔ وہ شاید بے ہوش ہو گئی تھی' یا اس پر نیم بیہوشی طاری تھی۔ اس میں اب اتنی سکت نہیں تھی کہ جدوجہد کر سکتی۔ ضمیر اسے اٹھا کر باہر لے آیا۔ باہر تھانیدار اکرم علی حسرت سے رانی کو اپنی نگاہوں کے سامنے دوسرے کے بازوؤں میں جاتے دیکھ رہا تھا مگر اب کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

دوسری صبح رانی کو یقین آ گیا کہ وہ ضمیر کی پناہ میں پہنچ گئی ہے۔ ضمیر نے اسے ایک البم نکال کر دکھائی تھی۔ اس میں دونوں کے بچپن کی تصویریں تھیں۔ اس کے بھیا کی بھی تصویر تھی۔ بہت سی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں' اور اسے یقین ہو گیا کہ وہ کسی دشمن کے پاس نہیں ہے لیکن اب اس کی طبیعت بگڑ رہی تھی۔ وہ اندر سے خود کو کمزور محسوس کر رہی تھی۔ غسل وغیرہ کرنے اور اچھی طرح کھانے کے باوجود اپنے آپ کو بیمار محسوس کر رہی تھی۔ ضمیر نے ڈاکٹر کو بلا کر اس کا معائنہ کرایا۔ ڈاکٹر نے دیکھا۔ دوائیں دیں۔ پھر چلا گیا۔

مگر وہ مرض اندر ہی اندر بڑھ رہا تھا۔ مرض کیا تھا۔ یہ ضمیر اور رانی کو معلوم نہیں تھا۔ یہ بات تھانیدار اکرم علی اور اس کا سسر ہی جانتا تھا کہ یہ سب زہر کا اثر ہے جو اب اپنا اثر ظاہر کر رہا ہے۔ چار دنوں میں ہی رانی آدھی ہو کر رہ گئی۔ ضمیر نے علاج میں کوئی

کسر اٹھا نہ رکھی۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں کے پاس لے جاتا تھا مگر کوئی اس کے اندر ڈوب کر نہیں معلوم کر سکتا تھا کہ آخر اندرونی خرابی کیا ہے۔ طرح طرح کی رائے قائم ہوتی تھیں۔ پھر مرض کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا جاتا تھا۔ نسخے لکھے جاتے تھے مگر کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔

ضمیر نے ایک دن اسے بستر سے اٹھا کر دوا پلائی۔ تسلیاں دیں۔ رانی نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "اب مجھے جھوٹی تسلیاں نہ دو۔ میرا ایک کام کرو گے؟"

"ایک نہیں' ہزار کام کروں گا۔ بولو' کیا چاہتی ہو؟"

اس نے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا۔ پھر اسے ضمیر کو دیتے ہوئے کہا۔ "جب میں مر جاؤں تو فوراً اسے کھول کر پڑھنا اور میں نے جو کچھ لکھا ہے اس پر عمل کرنا۔ اگر عمل نہیں کرو گے تو میری روح بے چین رہے گی۔"

"رانی! ایسی باتیں نہ کرو۔ میں نے بڑی تلاش کے بعد تمہیں پایا ہے۔ میں سوچتا تھا کہ بچپن میں تمہیں دیکھا ہے۔ جوانی میں تم کتنی حسین ہو گی۔ میں نے تصور میں تمہیں دیکھا ہے لیکن جب تمہیں پایا تو اپنے تصور سے زیادہ حسین پایا۔ میں تم سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ اگر یہاں علاج نہ ہوا تو میں تمہیں لندن لے جاؤں گا۔ وہاں بڑے بڑے ڈاکٹروں سے علاج کراؤں گا۔"

رانی نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ مایوس ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں' جیسے تھک گئی ہو۔ ضمیر نے اس کے سر کو اپنے شانے پر رکھ دیا۔ پھر اسے آہستہ آہستہ تھپکنے لگا۔

وہ شرمیلی لڑکی کبھی کسی کے اتنے قریب نہیں جاتی تھی مگر ضمیر کے شانے پر سر رکھ کر وہ جیسے اپنی شرم و حیا کو بھول گئی تھی۔ اس کے چہرے سے کسی جذبے کا اظہار نہیں تھا۔ دل میں کوئی آرزو باقی رہے تو چہرہ اس کی چغلی کھاتا ہے مگر چہرہ تو جیسے مردہ ہو گیا تھا۔ وہ بالکل ساکت ہو گئی تھی۔ جیسے بھائی کی غیرت کا بھرم رکھنے کے لئے کپڑے کا پتلا بن گئی ہو۔

☆======☆======☆

زمیندار تحصیل کے ڈاک خانے میں پہنچا تو ڈاکیے نے اسے دور سے دیکھتے ہی سلام کیا۔ پھر تیزی سے قریب آتے ہوئے بولا۔ "لیجئے' میں آپ ہی کو یاد کر رہا تھا' ادھر ایک ہفتے سے آپ کی بستی کی کوئی ڈاک میرے پاس نہیں آئی۔ اسی لئے میں آپ کی طرف

نہیں گیا، مگر بہت ضروری خبر آپ کو سنانے کے لئے بے چین ہو رہا ہوں۔ اس بار دس روپے والی خبر ہے۔"

زمیندار نے کہا۔ "پہلے سناؤ' میں اگر سمجھوں گا کہ دس روپے دینے چاہئیں تو ضرور دوں گا۔"

ڈاکیے نے آہستگی سے کہا۔ "حضور! وہ رانی اور صمدو کے بارے میں خبر ہے۔"

"کیا خبر ہے؟"

"یہی کہ صمدو نے بستی والوں سے جھوٹ کہا ہے۔ رانی کو کوڑھ کا مرض نہیں ہوا تھا۔"

"پھر کیا ہوا تھا؟"

"یہی تو پتہ نہیں' مجھے تو شبہ ہے کہ رانی مری نہیں ہے۔ یا تو مار دی گئی ہے' اسے قتل کیا گیا ہے یا پھر وہ شہر میں کہیں بھاگ گئی ہے اور صمدو نے وہاں بستی والوں کو بے وقوف بنایا ہے۔"

زمیندار نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ بات تمہیں کیسے معلوم ہوئی' مجھے بتاؤ۔ یقین آجائے گا تو میں صمدو سے سمجھ لوں گا۔"

"آپ میرے ساتھ آئیں۔ یہاں جو ڈاک خانے کے ساتھ وہ ٹیلیفون ایکسچینج ہے نا' وہاں کے ایک آدمی سے میں بات کراتا ہوں۔"

وہ دونوں چلتے ہوئے ٹیلیفون ایکسچینج کے پاس پہنچے وہاں سے ایک شخص باہر نکل رہا تھا۔ ڈاکیے نے اس سے کہا۔ "بیٹے! ذرا ادھر آنا۔ جو بات تم نے مجھے بتائی ہے وہ زمیندار صاحب کو بتا دو۔"

وہ ٹیلیفون آپریٹر تھا۔ زمیندار کو دیکھ کر ہچکچانے لگا۔ ڈاکیے نے کہا۔ "بیٹا! ہچکچانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اپنے ہی آدمی ہیں۔ جو سچ ہے وہ بیان کرنا چاہئے۔"

اس ٹیلیفون آپریٹر نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ یہاں ایک آدمی کار میں بیٹھ کر آیا تھا اور اس نے شہر کے ایک ڈاکٹر سے یہاں ٹیلیفون پر بات کی تھی۔ میں نے ہی لائن ملائی تھی لیکن ہم کبھی کبھی شرارت سے دوسرے کی باتیں سن لیتے ہیں۔ میں نے بھی ان کی باتیں سن لیں۔ وہاں وہ شہر کا ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ وہ اتنے بڑے شہر میں صرف ایک ہی کوڑھ کا ڈاکٹر ہے اور ایک ہی ہسپتال ہے اور اس ہسپتال میں رابعہ عرف رانی نام کی کوئی مریضہ داخل نہیں ہوئی تھی۔"

ڈاکیے نے کہا۔ "حضور! یہی سوچنے کی بات ہے۔ جب وہ اس ہسپتال میں داخل نہیں ہوئی تھی تو اسے کوڑھ کا مرض نہیں تھا۔ اگر وہ مرض نہیں تھا تو پھر وہ اپنی بہن کے ساتھ تین مہینے تک شہر میں کیا کرتا رہا۔ اگر اپنی بہن کے منگیتر کے پاس گیا تھا تو صمدو کا وہ خط ثبوت کے طور پر آپ کے پاس موجود ہے کہ صمدو اور اس کی بہن شہر میں جا کر اس کے منگیتر سے نہیں ملے تھے۔ یہ کچھ گھپلا نظر آ رہا ہے۔"

زمیندار نے کہا۔ "کچھ نہیں۔ بلکہ بہت زیادہ گھپلا ہے۔ میں جا کر ابھی لوگوں کو جمع کرتا ہوں اور صمدو سے جواب طلب کرتا ہوں۔"

وہ اپنا سب کام چھوڑ کر بستی کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک رکشہ میں بیٹھ کر شام تک بستی میں پہنچ گیا۔ اپنے حواریوں کے ذریعے ساری بستی میں یہ خبر پھیلا دی کہ رانی کو کوڑھ کا مرض نہیں ہوا تھا۔ صمدو نے ساری بستی کو دھوکا دیا ہے لہٰذا صمدو کو بلا کر جواب طلب کیا جائے۔

اندھیرا ہونے سے پہلے صمدو کو پنچائت میں طلب کیا گیا۔ پھر اس سے زمیندار نے سوال کیا۔ "وہاں تم نے جو دریا کے کنارے قبر بنائی ہے وہ کس کی قبر ہے؟"

صمدو نے کہا۔ "وہ میری بہن کی قبر ہے اور ساری بستی والوں نے دیکھا ہے کہ میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے دفن کیا تھا۔"

"یہ جھوٹ بھی ہو سکتا ہے۔ کسی نے قریب جا کر تمہاری بہن کی لاش کو نہیں دیکھا تھا۔ تم نے ہمیں دور ہی سے یہ کہہ کر ڈرا دیا تھا کہ اسے کوڑھ کا مرض ہے۔ ہم میں سے کسی نے قریب جانے کی جرأت نہیں کی اور تم نے ہمارے اس ڈر سے فائدہ اٹھایا۔"

صمدو نے پوچھا۔ "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ کیا میں نے اپنی بہن کو وہاں دفن نہیں کیا ہے؟"

"نہیں کیا ہے۔ تم نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ اس قبر میں اگر تمہاری بہن کی لاش ہے تو اسے تم نے قتل کیا ہے یا پھر وہاں کوئی لاش نہیں ہے۔ وہ قبر خالی ہے یا پھر کسی چیز کو چادر میں لپیٹ کر دفنا دیا گیا ہے۔ ہم اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔ میں ساری بستی والوں سے کہتا ہوں کہ ہمیں ابھی اس قبر کو کھود کر دیکھنا چاہئے۔"

کچھ بوڑھوں نے اعتراض کیا کہ قبر کو دوبارہ نہیں کھولنا چاہئے لیکن بستی کے زیادہ لوگ زمیندار کی تائید کر رہے تھے۔ سب کے دل میں تجسس پیدا ہو گیا تھا کہ قصہ کیا

ہے۔ صمدو نے ساری بستی والوں کو دھوکا کیا دیا تھا۔

صمدو نے کہا۔ "میں اس قبر کو دوبارہ کھولنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ وہ میری بہن کی قبر ہے اور اسے دیکھنے کی کسی کو اجازت نہیں مل سکتی۔"

زمیندار نے کہا۔ "تم اجازت دینے والے کون ہوتے ہو۔ ہم یہ ثابت کر دیں گے کہ تم نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ جھوٹ کہا ہے اور جرم یہاں چھپا رہے ہو۔ ہم یہ بات پولیس والوں تک پہنچائیں گے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ معاملہ آگے نہ بڑھے تو ہم ابھی جا کر اسے کھودیں گے۔"

ان کی باتوں کے دوران ہی زمیندار کے ایک چمچے نے کہا۔ "جناب! میں کدال اور بیلچہ لے آیا ہوں۔ نیک کام میں دیر کس بات کی۔ ابھی ہم وہاں دریا کے کنارے چلیں گے۔"

"چلو' چلو۔" سب نے کہا اور یہ مشورہ بھی دیا کہ صمدو کو پکڑ لیا جائے۔ اسے بھاگنے کا موقع نہ ملے کتنے ہی لوگوں نے اسے گھیر لیا اور اسے بھی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانے لگے۔ صمدو خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "مجھے چھوڑ دو۔ میں کسی کو اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ قبر کھودی جائے۔ وہاں میری غیرت دفن ہے۔ تم لوگ میری غیرت کا مذاق اڑا رہے ہو۔"

وہ ان کے ساتھ پاگلوں کی طرح چیختا جا رہا تھا مگر کوئی اس کی نہیں سن رہا تھا۔ جب وہ لوگ دریا کے کنارے پہنچے تو وہاں قبر سے ذرا دور ایک کار کھڑی ہوئی نظر آئی۔ دریا کے کنارے ضمیر حسن سر جھکائے ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے تو لوگ اسے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ پھر اسے نظرانداز کرتے ہوئے قبر کے پاس آئے۔ صمدو نے اپنے آپ کو چھڑا کر دوڑتا ہوا ضمیر کے پاس آیا۔ پھر اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ "دیکھو ضمیر! کیا ہو رہا ہے۔ یہ لوگ قبر کو کھود رہے ہیں۔ میری غیرت کا ابھی مذاق اڑانے والے ہیں۔"

ضمیر نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "نہیں صمدو بھائی! کوئی تمہاری غیرت کا مذاق نہیں اڑائے گا۔ جتنے غیرت مند تم ہو' تمہاری بہن اس سے بھی زیادہ شرم والی ہے۔ یہ میں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔"

اس نے اپنی جیب سے تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا۔ پھر صمدو سے کہا۔ "میں نے رانی کو تلاش کر لیا تھا مگر افسوس وہ اس کا آخری وقت تھا۔ اس نے مجھے یہ کاغذ دیتے ہوئے کہا تھا کہ موت کے بعد اس کی اس وصیت پر عمل کریں۔ وہ لوگ قبر کھود رہے ہیں۔ انہیں

اپنے کام میں مصروف رہنے ہی دو۔ سنو کیا لکھا ہے۔"

وہ کاغذ کھول کر آہستہ آہستہ پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔ "میرے پیارے بھیا! افسوس کہ آخری وقت آپ کو نہ دیکھ سکی۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو جیتے جی میری قبر بنا دی۔ سچ پوچھئے تو میں اسی وقت مر گئی تھی جب تھانے کے احاطے سے مجھے غیر ہاتھوں نے اٹھا لیا تھا۔ میں ضمیر صاحب سے التجا کرتی ہوں کہ میری موت کے بعد مجھے چپ چاپ اس طرح اسی خالی قبر میں لے جا کر سلا دیں کہ بستی والوں کو پتہ نہ چلے اور اس طرح آپ کی غیرت کا جو بھرم قائم تھا وہ ثبوت کے ساتھ قائم رہے۔ انشاء اللہ قائم رہے گا۔ آپ کی بدنصیب بہن رانی۔"

اس خط کو پڑھنے کے بعد ضمیر نے اسے تہہ کیا۔ پھر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ صمدو اس کے قریب چپ چاپ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ آبی پرندے کہیں سے اڑتے ہوئے آ رہے تھے اور درختوں پر اور کہیں کہیں جھاڑیوں میں جا کر بیٹھ رہے تھے۔ ان آبی پرندوں کو دیکھ کر رانی بری طرح یاد آ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دور قبر کی طرف آواز آئی۔ "بھئی' یہاں تو رانی موجود ہے۔ دیکھو اسے تو ہم ہزاروں میں پہچان سکتے ہیں۔"

لوگ شاید قبر میں جھک جھک کر دیکھ رہے تھے' اور یقین کر رہے تھے۔ پھر کسی نے کہا۔ "تعجب ہے۔ صمدو تین مہینے بعد شہر سے بہن کی لاش لے کر آیا اور اب اسے دفنائے دو ماہ سے زائد عرصہ گزر گیا ہے لیکن لاش جوں کی توں ہے۔"

کسی بوڑھے نے کہا۔ "ارے تم آج کل کے چھوکرے کیا جانو کہ یہ نیک روحیں ہیں۔ انہیں کچھ نہیں ہوتا۔ انہیں مٹی نہیں کھاتی۔ چلو اسے جوں کا توں قبر میں بند کر دو۔ عذاب سے بچو' خدا سے ڈرو کمبختو!"

صمدو ہونٹوں کو سختی سے بھینچے اپنی آہ کو روک رہا تھا۔ آنکھوں کو بند کئے آنسوؤں کے راستے بند کر رہا تھا۔ کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ لئے تھے۔ وہ کوئی آواز سننا نہیں چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ضمیر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ صمدو نے پیچھے کی طرف پلٹ کر رانی کی قبر کی جانب دیکھا۔ اب وہاں وہ قبر دوبارہ تیار ہو گئی تھی اور بستی کے لوگ دور دور تک کھڑے ہوئے ہاتھ اٹھائے دعائیں مانگ رہے تھے۔ صمدو سے رہا نہ گیا۔ دوڑتا ہوا قبر کے پاس آیا۔ پھر اوندھے منہ گر کر قبر سے لپٹ گیا' اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

ضمیر دور ایک پتھر پر بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ ضمیر جب دیکھتا ہے تو وہ دعائیں مانگنے والوں

اور فاتحہ پڑھنے والوں کو نہیں دیکھتا۔

ضمیر جب دیکھتا ہے تو وہ نوحہ کرنے اور رونے' گڑگڑانے والے کسی بھائی کو نہیں دیکھتا۔

ضمیر کی آنکھ باہر نہیں ہوتی۔ اندر ہوتی ہے اور وہ اندر سے دیکھ رہا تھا کہ وہ قبر زمین کے سینے پر تہذیب کے پھوڑے کی طرح اُبھری ہوئی تھی۔

☆======☆======☆

سلور جوبلی

فرائض منصبی کی ادائیگی ہمیشہ انسان سے قربانیوں کی طالب رہتی ہے۔ فرض کی ادائیگی میں کبھی نہایت کٹھن امتحان سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔
ایک پولیس افسر کی فرض شناسی کا قصہ۔
وہ ایک خطرناک دوراہے پر آ کھڑا ہوا تھا۔
ایک جانب اس کا فرض تھا اور دوسری جانب اس کی عزیز از جان بیوی اور بیٹا۔

اگر .... پچیس کے عدد کے دو اور پانچ کو جمع کیا جائے تو عدد سات ہوتا ہے۔ ہماری دنیا میں سات کے عدد کو متفقہ طور پر خوش بختی کا ہندسہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اگر کسی کارکردگی کی مسلسل کامیابی کے پچیس ہفتے یا پچیس مہینے یا پچیس برس گزر جائیں تو سلور جوبلی یعنی چاندی جیسی چمکتی ہوئی مسرت کا دن منایا جاتا ہے۔

انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے چیف افسر فرمان علی کی کوٹھی کے بڑے ہال کو بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ ایک دیوار پر 25 کے بہت بڑے ہندسے کا کٹ آؤٹ چاندی کے تاروں سے جگمگا رہا تھا۔ اس جگمگاتے ہوئے 25 کے اوپر......... لکھا ہوا تھا۔ "فرمان علی اور بیگم اسماء فرمان کو کامیاب ازدواجی زندگی کے 25 برس مبارک تم شاد رہو اور سدا آباد رہو۔"

اس ہندسے کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ "شادی خانہ آبادی کی بہترین مثال جو پچیس برس سے قائم ہے۔"

بڑی بڑی امیر و کبیر شخصیات کا ہجوم تھا۔ بڑی بڑی بیگمات اور حسین دوشیزائیں اپنی مترنم گفتگو اور چاندی جیسی کھنکتی ہوئی ہنسی سے ماحول کو رومانٹک بنا رہی تھیں پھر سب نے زینے کی بلندی پر دیکھا' فرمان علی اپنی بیگم اسماء کے ساتھ زینے سے اُترتا آ رہا تھا۔ تمام مہمان انہیں دیکھ کر تالیاں بجانے لگے۔ وہ دونوں زینے سے اُتر کر مہمانوں سے مصافحہ کرنے اور مبارک باد وصول کرنے لگے۔

کوئی ہاتھ ملاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "ہیپی لانگ لانگ میرج سرینی........."

کوئی کہہ رہا تھا۔ "ہماری دعا ہے کہ آپ دونوں مسرتوں بھری ازدواجی زندگی کی صرف سلور جوبلی نہیں بلکہ گولڈن جوبلی بھی منائیں۔"

ایک شخص نے کہا۔ "صرف گولڈن جوبلی ہی نہیں آپ پلاٹینم جوبلی بھی منائیں۔"

ایک خاتون نے اپنے شوہر کی پسلی پر اپنی کہنی سے ٹھوکا دے کر کہا۔ "ذرا دیکھو اور شرم کرو۔ کیا تم خود کو فرمان صاحب جیسا شوہر ثابت نہیں کر سکتے؟"

شوہر نے دبی سرگوشی میں کہا۔ "خدا کے لئے یہاں تو خاموش رہو' جب تم بولتی ہو تو تمہارے سامنے پاپ میوزک کا بے ہنگم شور سنائی نہیں دیتا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں ہی بولتی ہوں۔ میں ہی جھگڑتی ہوں۔ تم تو بڑی بڑی تقریبات میں جھگڑا شروع کر دیتے ہو۔"

وہ ذرا قریب آ کر اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "مجھے معاف کر دو۔ ابھی میں نے ہی جھگڑا شروع کیا ہے۔ اب نہیں کروں گا۔ تم جو کہو گی' مان لوں گا۔ پلیز خاموش ہو جاؤ۔ اس تقریب کا تقاضا ہے کہ مسکراؤ۔"

وہ اونہہ کہہ کر پلٹ گئی اور دوسری خواتین کی طرف جانے لگی۔ ایک بڑی سی میز پر شادی کی سالگرہ کا بڑا سا کیک رکھا ہوا تھا۔ ایک خوش لباس ملازمہ کیک کے اطراف پچیس عدد موم بتیاں لگا رہی تھی۔ ایک جانب کھڑا ہوا مرد اپنی بیوی کو گھور کر کہہ رہا تھا۔ "یہ مجھ جیسا حوصلے والا شوہر ہے جو تمہارے ساتھ بائیس برس سے زندگی گزار رہا ہے۔ اگر بچے جوان نہ ہوتے تو تمہیں اِس سلور جوبلی کی تقریب میں طلاق دے دیتا۔"

وہ عاجزی سے بولی۔ "آپ گھر میں گالیاں بھی دیتے ہیں۔ مجھے مارتے بھی ہیں۔ آج اس سلور جوبلی میں تو غصہ نہ کریں۔ تین برس بعد میں بھی لات اور گالیاں کھانے کی سلور جوبلی مناؤں گی۔"

"دیکھو' تم طعنے دے رہی ہو۔ کیا یہاں اپنی بے عزتی کراؤ گی؟"

"یہاں تو آپ مجھ پر ایک انگلی نہیں اُٹھا سکتے۔ یہ شرفا کی محفل ہے۔ یہاں آپ جیسے شوہر خود کو مہذب ثابت کرنے کے لئے مسکرا کر بیوی سے گفتگو کرتے ہیں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی دو حضرات اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ وہاں آئے۔ ان کے قریب آتے ہی غصہ دکھانے والا شوہر جبراً مسکرانے لگا۔ آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔ "واقعی فرمان صاحب اور اسماء بھابی کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی کامیابی میں خاندانی منصوبہ بندی کا بھی دخل ہے۔ بچے دو ہی اچھے........."

دوسرے نے کہا۔ "مگر دو کہاں ہیں۔ ان کا تو ایک ہی بیٹا ہے۔"

ان سب نے ایک دیوار کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک نوجوان لڑکے کی بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی۔ ایک خاتون نے کہا۔ "کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ہم میں سے کسی نے فرمان بھائی کے اس بیٹے کو کبھی نہیں دیکھا۔"

"کیسے دیکھیں گے؟ وہ تو لندن میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن والدین کی پچیسویں سالگرہ بہت اہم ہے۔ آج تو اسے آنا ہی چاہئے۔"

"فرمان بھائی اور بھابی نے اسے ضرور بلایا ہو گا۔ شاید اسی کا انتظار ہے اس لئے کیک کاٹنے میں دیر ہو رہی ہے۔"

اسی وقت فرمان علی کی اونچی اور گونجتی ہوئی آواز سنائی دی' وہ کہہ رہا تھا۔ "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! ہم نے اپنے بیٹے کے انتظار میں آپ لوگوں کو انتظار کی زحمت دی۔ بہتر ہے کہ اب وقت ضائع نہ کیا جائے۔"

ملازمہ موم بتیاں جلانے لگی۔ ایک شخص نے کہا۔ "میرے ذہن میں سوال پیدا ہو رہا ہے کہ یہ کیک کیسے کاٹا جائے؟"

فرمان نے کہا۔ "یہ بھی کوئی مسئلہ ہے؟ جیسے عام طور پر چھری سے کاٹا جاتا ہے اسی طرح میں اور اسماء ایک ساتھ ایک چھری کو پکڑیں گے پھر اس کیک کو ایک ساتھ کاٹیں گے۔"

اس شخص نے کہا۔ "ہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا تم نے شادی سے پہلے اسماء بھابی کو دیکھا تھا؟"

فرمان نے کہا۔ "نہیں۔ پچیس برس پہلے ہم اتنے آزاد خیال نہیں تھے۔"

"اور بھابی آپ نے شادی سے پہلے چھپ کر اپنے میاں کو دیکھا تھا؟"

اسماء بیگم نے کہا۔ "بالکل نہیں لیکن آپ پولیس والوں کی طرح انکوائری کیوں کر رہے ہیں؟"

"اس لئے کہ آج سلور جوبلی کا کیک بھی آپ اس طرح کاٹیں کہ کاٹتے وقت ایک دوسرے کو نہیں دیکھیں۔ یوں سمجھیں کہ پچیس برس کے بعد پھر سے نئی شادی ہو رہی ہے۔"

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ فرمان اور اسماء نے ایک دوسرے کو چور نظروں سے ایسے دیکھا جیسے اس بات نے ان کی ڈھکی چھپی کسی پریشانی کو تازہ کیا ہو۔ دوسرے شخص نے کہا۔ "فرمان صاحب! آپ ایسا کریں کہ کیک کاٹتے وقت بھابی کی طرف نہ دیکھیں اور بھابی آپ اپنے میاں کو نہ دیکھیں گی۔"

ایک خاتون نے کہا۔ "ایک دوسرے سے نظریں چُرا کر کیک کاٹنے کا مطلب یہی ہوگا کہ میاں بیوی راضی نہیں ہیں۔"

ایک شخص نے فرمان کی آنکھوں پر پٹی باندھتے ہوئے کہا۔ "یہ سلور جوبلی کی آنکھ مچولی ہے۔"

ایک خاتون نے اسماء کے دوپٹے کو گھونگھٹ کی طرح پورے چہرے پر ڈال دیا۔ اب وہ بھی اپنے میاں کو تو کیا' کیک کو بھی نہیں دیکھ سکتی تھی پھر دونوں کے ہاتھوں میں چھری کا دستہ پکڑا دیا گیا۔ وہ دونوں ذرا جھک جھک کر پھونکیں مار کر موم بتیاں بجھانے لگے۔ کچھ بجھ رہی تھیں' کچھ بجھ نہیں پا رہی تھیں۔ تمام مہمان قہقہے لگا رہے تھے اور ان کی رہنمائی کر رہے تھے کہ کون کون سی موم بتی بجھنے کو رہ گئی ہے۔

ان کی رہنمائی کے مطابق انہوں نے باقی موم بتیاں بجھا دیں۔ صرف ایک موم بتی کو جلتے رہنے دیا پھر وہ چھری ان میاں بیوی کی گرفت میں آگے بڑھی پھر کیک کے اوپر تک پہنچی۔ ایک شخص نے کہا۔ "بس۔ اب یہاں سے کیک کاٹو۔"

انہوں نے کاٹنے کے لئے چھری کو ذرا جھکایا۔ اسی لمحے میں ایک جوان کی کھلی ہوئی ہتھیلی کیک اور چھری کے درمیان آگئی۔ کیک کاٹنے کا دستور یہ ہے کہ اسے تکون یعنی ۸ کے ہندسے کی شکل میں کاٹا جاتا ہے۔

چھری کی نوک اس جوان کی ہتھیلی کی کھال اور گوشت کو اسی طرح چیرتی گئی۔ تمام مہمانوں نے شدید حیرانی سے دیکھا۔ حیرت کی شدت سے پہلے تو وہ کچھ بول نہ سکے پھر کئی خواتین کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ چیخوں کی آواز پر فرمان اور اسماء نے اپنی آنکھوں سے پٹی اور گھونگھٹ کو ہٹا کر دیکھا۔ ان کے بیٹے کامران نے اپنی ہتھیلی اُلٹ دی تھی۔ اس میں سے لہو کیک پر ٹپکنے لگا۔ اسماء نے چیخ مار کر بیٹے کی کلائی پکڑی۔ بیٹے نے ایک جھٹکے سے کلائی چھڑائی۔ پھر تمام مہمانوں کو سیدھی کلائی دکھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھیں' آپ سب دیکھیں مگر یہ نہ سمجھیں کہ ایک بیٹے نے والدین کی شادی کی سلور جوبلی اس (V) سے منائی ہے۔ وی (V) کے معنی ہیں وکٹری' نصرت' فتح' جیت۔ آج میاں بیوی نے ازدواجی زندگی کے پچیس برس جیت لئے ہیں اور بیٹے نے اس جیت کو اپنے لہو سے لکھوایا ہے۔"

فرمان اور اسماء کچھ گھبرائے ہوئے سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ بیٹا کہہ رہا تھا۔ "میں نے سنا ہے کہ میرے بزرگ والدین نے یہ خبر پھیلائی ہے کہ میں لندن میں تعلیم حاصل کر رہا ہوں............" پھر اُس نے ماں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "کیا میں لندن میں تھا؟"

وہ بھیگی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کامران میرے بیٹے! چپ رہو۔"

"میں چپ رہوں گا۔ یہ ہتھیلی بولے گی کہ میں لندن سے نہیں‘ سیدھا جیل سے آ رہا ہوں۔"

"ہائیں؟" مہمانوں کے منہ سے حیرت بھری آوازیں نکلنے لگیں‘ وہ بولا۔ "ہاں چیف آف انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ فرمان علی کا بیٹا کامران لندن کی نہیں‘ جیل کی یونیورسٹی سے پاس ہو کر آ رہا ہے۔"

اسماء نے ڈانٹ کر کہا۔ "میں کہتی ہوں‘ بکواس مت کرو۔"

فرمان علی نے اسماء کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اسے بولنے دو۔"

بیٹے نے کہا۔ "ہاں‘ مجھے آج بولنا چاہئے۔ آج سے پہلے مجھے کچھ کہتے ہوئے شرم آتی تھی۔ یہاں تک کہ آپ کو ماں باپ کہتے ہوئے آج بھی شرم آ رہی ہے لیکن نہیں .... آپ نے باپ ہو کر مجھے ہتھکڑی پہنائی تھی۔ میں بیٹا ہو کر آج آپ کو ہتھکڑی پہناؤں گا۔"

وہ جیب سے ایک ہتھکڑی نکال کر اسے بلند کرتے ہوئے بولا۔ "اگرچہ میں ہتھکڑی پہنانے کی قانونی حیثیت نہیں رکھتا ہوں لیکن یہاں کے تمام معزز مہمان آپ دونوں کو یہ زیور پہنائیں گے۔ کیونکہ میں قانون کا مجرم تھا تو آپ دونوں اخلاقی مجرم ہیں۔ شریعت محمدیؐ کے خلاف گناہگاروں کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر آپ میں جراءت ہے تو بتائیں کہ یہ شادی کی سلور جوبلی نہیں‘ آپ دونوں کی طلاق کی سالگرہ ہے۔"

دھائیں دھائیں جسے تمام مہمانوں کے دماغوں میں دھماکے ہونے لگے۔ کتنی ہی خواتین اور مرد بے یقینی سے کہنے لگے۔ "طلاق؟ طلاق؟ طلاق؟ نہیں .... نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

ایک بزرگ نے کامران سے کہا۔ "بیٹے! کیا تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ نئی نسل اپنے والدین پر کیچڑ اُچھالتی ہے؟"

وہ ہتھکڑی اٹھائے میز کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "آپ اس ہتھیلی پر وی کا نشان دیکھ رہے ہیں۔ اب اسی نشان کو پھر دیکھیں .... میں نے ہتھیلی اُلٹ دی ہے۔ جو پہلے V نظر آتا ہے اب ۸ کا عدد نظر آ رہا ہے۔ جب میں آٹھ برس کا تھا تب میں نے کانوں سے سنا تھا اور آنکھوں سے ان صاحب کو دیکھا تھا۔ یہ اپنی بیگم کو تین طلاقیں دے رہے تھے۔ ایک آٹھ برس کے بچے کی گواہی شاید قابل قبول نہ ہو لیکن میری زبان سے ماں کا دودھ جھوٹ نہیں بولے گا اور باپ کا لہو اگر کم ظرف نہ ہوا تو یہ ہتھکڑی خود اٹھا کر پہن لے

گا۔"

اس نے فرمان کے سامنے میز پر ہتھکڑی پھینک دی۔ پورے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ تمام مہمان فرمان اور اسماء کو دیکھ رہے تھے۔ بیٹے نے کہا۔

"کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں سب کے سامنے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میں چاہتا ہوں یہاں کی تمام لائیٹیں بجھا دی جائیں تاکہ طلاق کے بعد ازدواجی زندگی گزارنے والے یہ گناہ گار‘ سلور جوبلی کے اندھیرے میں اپنی صفائی پیش کر سکیں۔"

تمام لائٹس ایک ایک کر کے بجھنے لگیں۔ فرمان علی اور اسماء بیگم کے چہروں پر ایک ایک لائٹ کے بجھنے سے یوں اندھیرا چھانے لگا جیسے دونوں کے منہ پر کالک پھر رہی ہو۔

پھر وہ بدنامی کی تاریکی میں ڈوب گئے۔

☆======☆======☆

ایک سینٹر ٹیبل کی سطح شیشے کی تھی۔ اس کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھا ہوا شخص ایک پلاسٹک کی تھیلی سے سفید پاؤڈر ایک ایک چٹکی سے نکال کر شیشے کی سطح پر الگ الگ رکھتا جا رہا تھا۔ اس کے سامنے ذرا فاصلے پر ایک بڑی سی دفتری میز تھی۔ میز کے دوسری طرف ایک ریوالونگ چیئر پر کوئی سوٹ پہنے بیٹھا تھا۔ صورت نظر نہیں آ رہی تھی کیونکہ ریوالونگ چیئر کا رُخ دوسری طرف تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی طرف سائیڈ میز پر ٹیبل فین رکھا ہوا تھا اور دائیں طرف فرمان علی اپنی کمر سے بلٹ کی پیٹی اور ہولسٹر میں ریوالور رکھے ایک باڈی گارڈ کی طرح الرٹ کھڑا ہوا تھا۔

شیشے کی میز پر ایک ایک چٹکی پاؤڈر رکھنے والے نے اپنی ناک کے ایک نتھنے سے چھوٹی سی نلکی لگائی۔ وہ اس نلکی کے ذریعے سانس کھینچ کر نشیلے پاؤڈر کو اپنے وجود کے اندر پہنچانا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی ریوالونگ چیئر پر بیٹھے ہوئے شخص نے ٹیبل فین کا بٹن دبا دیا۔

وہ پنکھا پوری رفتار سے گردش کرنے لگا۔ تیز آندھی کی طرح ہوا کے جھونکے ان چٹکی چٹکی پاؤڈر کو اُڑا کر فضا میں بکھیرنے لگے۔ اس نشہ کرنے والے نے اِدھر سے اُدھر فضا میں منہ اٹھا کر نلکی کے ذریعے پاؤڈر کو اپنی طرف کھینچنا چاہا لیکن اس کی سانسیں پنکھے کی رفتار سے تیز نہیں تھیں۔ پنکھے کی رفتار اِتنی تیز تھی کہ پلاسٹک میں رکھا ہوا پاؤڈر بھی فضا میں اڑنے لگا تھا۔ اس نے پلاسٹک کی تھیلی کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ کر کہا۔ "باس! یہ کیا؟ آپ نشہ دے کر چھین رہے ہیں؟"

ریوالونگ چیئر نے حرکت کی۔ باس کرسی پر گھومتا ہوا اس کی طرف رُخ کر کے بولا۔ "مجھے چھیننے میں مزہ آتا ہے۔ جب کسی کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو میں اسے کچھ دے کر چھین لیتا ہوں۔ کیوں فرمان سچ کہتا ہوں نا؟"

فرمان نے اسی طرح مستعد کھڑے ہو کر کہا۔ "یس باس! آپ سچ سے بھی زیادہ سچ کہتے ہیں۔"

باس نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ "کمال کے باڈی گارڈ ہو۔ ہماری بات سے آگے جا کر بولتے ہو۔"

"میری گولی بھی آپ کے ریوالور کی گولی سے آگے جاتی ہے۔"

باس پھر میز پر ہاتھ مار کر کہتا ہے۔ "ہیئرائٹ از' اسی لئے تو ہم نے تمہیں باڈی گارڈ بنا کر رکھا ہے۔"

نشہ کرنے والے نے کہا۔ "باس! وہ باڈی گارڈ ہے اور آپ مجھے آنکھوں کا تارا کہتے ہیں۔ پلیز انعام دے کر نہ چھینیں۔"

"پہلے کام پھر انعام۔"

"میں حاضر ہوں' کام بتائیں؟"

"بندر کی طرح غصے میں خوخیانے کی آواز نکالو۔"

تارا اُچھل کر صوفے پر اکڑوں بیٹھ کر بندر کی سی حرکتیں کرنے اور غصے میں خوخیانے کی آوازیں نکالنے لگا۔ باس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مصطفیٰ قریشی مکالمے کس طرح بولتا ہے۔"

تارا صوفے سے اُٹھ کر مصطفیٰ قریشی کے انداز' آواز اور لہجے میں مکالمے ادا کرنے لگا۔ باس نے خوش ہو کر کہا۔ "تم واقعی باکمال فنکار ہو۔ ہر شخص کی آواز کی نقالی کر لیتے ہو۔"

"باس! میں آپ کی بھی نقل کر سکتا ہوں لیکن آپ کی آواز میں بولنا شروع کروں گا تو آپ کے بچے مجھے اپنا باپ سمجھ لیں گے اور آپ کی بیوی مجھے اپنا ہی ہی ہی......"

وہ ڈانٹ کر بولا۔ "یو شٹ اپ۔ کام کی بات کرو۔ کیا ڈی آئی جی حشمت کی نقل کر سکتے ہو؟"

"میں نے اس کی آواز نہیں سنی ہے۔"

باس نے ایک ٹیپ ریکارڈر آن کر کے کہا۔ "لو سنو۔"

اس ریکارڈر سے ڈی آئی جی حشمت کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ اپنے کسی ماتحت سے کسی کیس کے سلسلے میں گفتگو کر رہا تھا پھر باس نے ریکارڈر بند کر کے کہا۔ "تم میرے ملک مراد خان کو جانتے ہو؟"

"جی ہاں! اسمگلنگ کے دھندے سے بڑی مرادیں پالیتا ہے۔"

"تم مراد خان کو فون کرو۔ ڈی آئی جی حشمت کی آواز میں بولو کہ بیدار بخت کا مال آج آدھی رات کو بلیک پورٹ پر آ رہا ہے۔ مراد خان چاہے تو بیدار بخت کے کارندوں پر حملہ کر کے تمام مال پر قبضہ جما سکتا ہے۔"

"باس! کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ بیدار بخت آپ کا نام ہے۔ اگر آپ کا مال آ رہا ہے تو دشمن کو اطلاع کیوں دے رہے ہیں۔"

"میرا کوئی مال نہیں آ رہا ہے۔ میں بلیک پورٹ میں اسے گھیر کر ختم کر دینا چاہتا ہوں۔"

تارا نے فون کے پاس آ کر ریسیور اٹھایا پھر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "آپ کون ہیں؟"

تارا نے ڈی آئی جی حشمت کی آواز اور لہجے میں کہا۔ "میں حشمت بول رہا ہوں۔ مراد خان کو فون دو۔"

دوسری طرف سے پھر پوچھا گیا۔ "ہنس مت۔ یہ ہنس مت کیا ہوتا ہے؟"

"گدھے کے بچے! تجھے ہنسنے سے منع نہیں کر رہا ہوں۔ کان کا میل صاف کر۔ ہنس نہیں' حشمت۔ ڈی آئی جی حشمت بول رہا ہوں۔"

چند لمحوں کے بعد مراد خان کی آواز آئی۔ "جناب عالی! معافی چاہتا ہوں۔ میرے ایک بہرے ملازم نے ریسیور اٹھا لیا تھا۔ حکم کریں' بندہ پرور کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"خدمت تو میں کر رہا ہوں۔ تم میرا حصہ دیا کرتے ہو اس لئے بہت ہی خفیہ طور سے ملنے والی خبر سنا رہا ہوں۔ آج بلیک پورٹ پر بیدار بخت کا مال آ رہا ہے۔ اگر اچانک گھیر کر حملہ کرو گے تو مال بھی ہاتھ آئے گا اور وہ کمینہ بیدار بخت بھی مارا جائے گا۔"

"شکریہ جناب عالی! آج میں دشمن کا کام تمام کر دوں گا۔ کل صبح تک آپ کا حصہ پہنچ جائے گا۔"

تارا نے ریسیور رکھ دیا۔ باس بیدار بخت اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ تارا نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا میں نے کوئی غلطی کی ہے؟"

"غلطی کے بچے! تُو نے فون پر مجھے کمینہ کیوں کہا؟"

"باس! میں آپ کا دشمن بن کر فون کر رہا تھا۔ میں تو اور دو چار گالیاں دینا چاہتا تھا۔ اس طرح دشمن کو کسی طرح شبہ نہیں ہوتا ہے۔"

باس نے فرمان کی طرف دیکھا۔ فرمان نے کہا۔ "یہ درست ہے باس! دشمن بن کر آپ کا نام عزت سے لیا جاتا تو وہ آپ کی چال سمجھ سکتا تھا۔ اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے صرف گالیاں ہی نہیں' لات جوتے بھی کھانا چاہئیں۔"

"ہوں!" اس نے غصے سے فرمان کو دیکھا پھر بے بسی سے تائید میں سرہلا کر رہ گیا۔

ایک مسلح کارندے نے آکر کہا۔ "باس! اس غدار کی بیوی اور جوان بیٹا آگیا ہے۔"

بیدار بخت کرسی سے اٹھ گیا۔ تارا نے کہا۔ "باس! میرا انعام؟"

"ابھی مل جائے گا۔ میرے ساتھ آؤ اور تماشا دیکھو۔"

وہ اور فرمان علی اپنے باس کے پیچھے چلتے ہوئے عمارت کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ایک ٹارچر سیل میں پہنچے۔ وہاں ایک عورت اور اس کے جوان بیٹے کو الگ الگ ستونوں سے رسیوں کے ذریعے باندھا گیا تھا۔ آس پاس اور دور تک مسلح کارندے کھڑے ہوئے تھے۔ ایک شخص بیدار بخت کو دیکھتے ہی دوڑتا ہوا آکر اس کے قدموں میں گر گیا اور گڑگڑا کر کہنے لگا۔ "باس! میں تین برس سے آپ کا وفادار ملازم رہا ہوں۔ آپ کے لئے جان کی بازی لگاتا رہا ہوں پھر آپ نے میری بیوی اور جوان بیٹے کو قیدی کیوں بنایا ہے؟"

باس بیدار بخت نے ایک چٹکی بجائی۔ چند لمحوں بعد ہی اس ٹارچر سیل میں آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہاں دو مختلف دیواروں پر بڑے بڑے سپیکر لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے پہلے پر ڈی آئی جی حشمت کی آواز اُبھری' وہ کہہ رہا تھا۔ "جانی! تم بڑی کامیابی سے مخبری کر رہے ہو۔"

بیدار بخت نے قدموں میں بیٹھے ہوئے شخص سے کہا۔ "جانی تمہارا نام ہے نا؟"

سپیکر سے جانی کی آواز اُبھری۔ وہ ڈی آئی جی حشمت سے کہہ رہا تھا۔ "سر! ہمارے ملک میں منشیات کی لعنت بڑھتی اور پھیلتی جا رہی ہے۔ اس لعنت کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔"

ڈی آئی جی کی آواز آئی۔ "شاباش! تمہاری صحیح اطلاعات کی بدولت ہم نے کئی بار منشیات کی سمگلنگ کو ناکام بنایا ہے۔ تم اسی طرح بیدار بخت کے وفادار اور جاں نثار بن کر

رہو۔ اوپر سے آرڈر آیا ہے کہ تمہیں ترقی دی جائے اور تمہاری تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔"

"سر! یہ آپ کی حوصلہ افزائی ہے۔ میں جلد ہی بیدار بخت کے اس خفیہ اڈے تک پہنچ جاؤں گا جہاں سے مال سپلائی ہوتا ہے اور ڈرگ مافیا کے گاڈ فادر کا نام' پتہ اور اس کے خلاف ثبوت بھی حاصل کروں گا۔ ہمارے ملک میں نشے کا زہر پھیلانے والا کسی دوسرے ملک میں ہے۔ بیدار بخت اس کا محض پاکستانی ایجنٹ ہے۔"

بیدار بخت نے چٹکی بجائی۔ سپیکر سے آنے والی آوازیں بند ہو گئیں۔ جانی سہما ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بیدار بخت نے مسکرا کر کہا۔ "تعجب ہے۔ تم محب وطن ہو کر مجھ سے خوف زدہ نظر آرہے ہو۔"

"میں اپنے لئے نہیں' اپنی بیوی اور بیٹے کے لئے پریشان ہوں۔ آپ نے انہیں کیوں یہاں قید کیا ہے۔ میں آپ کا مجرم ہوں۔ آپ مجھے سزا دیں۔"

وہ انکار میں سرہلا کر ایک طرف چلتے ہوئے بولا۔ "نہیں .... نہیں۔ تمہیں ایک گولی ماری جائے گی' تم مرجاؤ گے۔ میں تمہیں زندہ رکھ کر دن رات مرتے اور جیتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ سنا ہے تم اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے ہو؟"

فرمان علی باڈی گارڈ کی حیثیت سے وہاں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے تصور میں اپنی بیوی کو دیکھا۔ وہ مسکراتی ہوئی اس کی گردن میں بانہیں ڈال رہی تھی۔

وہ تصور سے چونک گیا۔ جانی کہہ رہا تھا۔ "ہاں میں صائمہ سے بہت محبت کرتا ہوں۔ یہ ایک بے قصور گھریلو عورت ہے۔ یہ نہ مجرموں کو جانتی ہے اور نہ مخبروں کو۔ ہم اپنے بیوی بچوں سے بھی یہ سرکاری راز چھپاتے ہیں۔"

"تمہارے جیسے مخبروں اور سراغ رسانوں جیسا احمق اور کوئی نہیں ہوتا۔ تم لوگ فرض شناس ہوتے ہو مگر تمہارے چند افسران ہمارے بھتہ خور اور نمک خوار ہیں۔ اس کا ثبوت تم نے دیکھ لیا۔ سپیکر کے ذریعے تمہیں اس گفتگو کا ٹیپ سنایا گیا ہے جو کہ بند کمرے میں تمہارے اور ڈی آئی جی کے درمیان ہوئی تھی اور اتنی رازداری سے ہونے والی باتیں یہاں تک پہنچ گئیں۔"

جانی نے کہا۔ "آپ درست کہتے ہیں۔ ہمیں ہمارے ہی ڈیپارٹمنٹ کے لوگ سانپ بن کر ڈس لیتے ہیں لیکن میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ مجھے ڈس لیں۔ میری بیوی اور بیٹا بے قصور ہیں۔"

"سنا ہے تمہارا یہ بیٹا بہت ذہین ہے۔ وظیفے پر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے بیرونِ ملک جانے والا ہے۔ یہ تمہارے لئے کتنے فخر کی بات ہے کہ یہ ملک کا نام روشن کرنے کے لئے بڑی بڑی ڈگریاں لے کر آئے گا لیکن اس سے پہلے موت آجائے گی تو کیا ہو گا؟ کیا آج تک کسی نے موت کا کچھ بگاڑا ہے؟"

جانی دوڑتا ہوا ستون سے بندھے ہوئے جوان بیٹے کے پاس گیا۔ پھر بیدار بخت کی طرف پلٹ کر بیٹے کے آگے ڈھال بن کر بولا۔ "یہ ہمارے ملک کے مستقبل کا روشن چراغ ہے۔ اسے نہ بجھاؤ۔ تم مجھے ایک گولی سے نہ مارو۔ مجھے ہر طرح سے ٹارچر کرو۔ اذیتیں دو مجھے تڑپا تڑپا کر مار ڈالو مگر اسے میرا نہیں' اپنا ہی بیٹا سمجھ کر جانے دو۔"

"تمہیں بیٹے کی موت سے پہلے کتنی تکلیف ہو رہی ہے۔ یہ مرے گا تو اس کی میت قبرستان جائے گی لیکن اس کی قبر تمہارے دل میں بنے گی۔ تم اپنے اندر اس کی قبر میں رات کو دیا جلاؤ گے اور دن کو اگربتی پھر دوسری قبر بیوی کی ہو گی۔ تم اس کے لئے آہیں بھرو گے' فریاد کرو گے لیکن تمہاری سرکار انہیں تمہارے لئے واپس نہیں لا سکے گی۔ صرف تمہارے سینے پر ایک تمغہ سجا دے گی۔ جب تم آئینے میں اس تمغے کو دیکھو گے تو وہ تمہاری بیوی اور بیٹے کی قبروں کا کتبہ نظر آئے گا۔"

جانی کے تیور بدل گئے۔ اس نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ وہاں سے رہائی ممکن نہیں ہے۔ وہ گرج کر بولا۔ "تیرا نام بیدار بخت نہیں خوابیدہ بخت ہونا چاہئے۔ خدا نے چاہا تو تیری آنکھ ایسے بند ہو گی کہ تو کبھی بیدار نہیں ہو گا۔ اگر مرد کا بچہ ہے تو میرے ہاتھ میں ایک گن دے پھر دیکھ تیرے یہ تمام گن مین' تجھے زندہ نہیں ملیں گے۔"

"یہ ہتھیار تو طاقت ہیں۔ ہتھیاروں کے زور پر ہی حکومت کی جاتی ہے۔ ہمارا خودکشی کا ارادہ ہوتا تو تمہیں ضرور ہتھیار دیتے۔ فی الحال تو گولیاں ہی دے سکتے ہیں۔"

اس نے اپنے مسلح ماتحتوں سے کہا۔ "جانی نے ہماری بڑی خدمت کی ہے۔ اسے کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اسے وہاں سے لات مار کر ہٹاؤ اور اس کے خاندان کو نابود کر دو۔"

حکم سنتے ہی ایک نے جانی کو زور کی لات ماری۔ وہ دور جا کر گرا۔ دوسرے نے ایک گن سے اس کے جوان بیٹے کا نشانہ لیا۔ فرمان علی نے چونک کر دیکھا۔ تصور میں جانی کے بیٹے کی جگہ اپنا آٹھ برس کا کامران دکھائی دیا۔ وہ باپ کو پکار رہا تھا۔ "پاپا! مجھے بچا لو۔ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے پاپا' پاپا!"

کامران رو رہا تھا۔ باپ کو مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ ایسے ہی وقت ایک گولی چلی۔ کامران کے حلق سے آخری چیخ نکلی پھر ٹھائیں ٹھائیں کی کئی آوازیں سن کر فرمان علی نے خیالات سے چونک کر دیکھا۔ جانی کی بیوی اور بیٹا ستون سے اسی طرح بندھے ہوئے تھے لیکن مردہ ہو چکے تھے۔ جانی وحشت سے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ مار رہا تھا۔ اپنے کپڑے پھاڑ رہا تھا اور اپنے سر کے بال نوچ رہا تھا۔

بیدار بخت نے اپنے ماتحتوں سے کہا۔ "اس پاگل کے بچے کو یہاں سے لے جاؤ اور کہیں دور لے جا کر پھینک دو۔ اسے ماتم کرنے کے لئے زندہ رہنے دو۔"

وہ حکم دے کر پلٹ گیا۔ تارا اور فرمان علی اس کے پیچھے چلنے لگے۔ فرمان کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس کے اندر اپنی بیوی اسماء کی آہیں' بیٹے کی فریادیں اور آخری چیخیں گونج رہی تھیں۔ دماغ کے اندر اس طوفانی شور میں صرف ایک سوال گونج رہا تھا' کیا اس سے محبت کرنے والی شریکِ حیات اسماء اور اس کے جگر کے ٹکڑے کامران کا بھی یہی انجام ہو گا؟

☆======☆======☆

ہرے بھرے پارک میں بے شمار بچے کھیل رہے تھے۔ ان بچوں کی نگرانی کے لئے ان کی آیائیں بھی ساتھ تھیں۔ بعض بچوں کے ساتھ ان کے والدین بھی کھیل رہے تھے۔ اکثر بچوں کو جھولا جھولنے کا بہت شوق ہوتا ہے اس لئے پارک میں جہاں جھولے پڑے ہوئے تھے' وہاں بڑی بھیڑ تھی۔ اسماء اپنے بیٹے کامران کے ساتھ سی ساؤ کے پاس آئی تھی۔ سی ساؤ ایک ایسا کھیل ہے جس میں لکڑی کا ایک بڑا سا تختہ ہوتا ہے۔ اس تختے کے دونوں سروں پر ایک ایک بچہ بیٹھ کر اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر جھولتا ہے۔ ایک وقت میں ایک بچہ نیچے آتا ہے تو دوسرا بچہ اوپر کو جاتا ہے۔ کامران کا کوئی ہمجولی نہیں تھا۔ لہٰذا اسماء اسے تختے کے ایک سرے پر بٹھا کر دوسرے سرے کو ہاتھوں سے اوپر نیچے کر رہی تھی۔ کامران خوش ہو رہا تھا۔ بلندی پر جاتے وقت وہ خوف اور مسرتوں سے چیخنے لگتا تھا۔ ڈرتا بھی تھا اور قہقہے بھی لگاتا تھا۔

فرمان علی نے پارک میں داخل ہو کر اپنی شریکِ حیات اور اپنے بیٹے کامران کو دیکھا۔ آہستہ آہستہ ان کے قریب جاتے ہوئے سوچنے لگا۔ اپنے بیٹے کی طرح میں بھی اندر سے خوف زدہ ہوں اور اوپر سے ہنستا مسکراتا رہتا ہوں۔ میری ازدواجی زندگی اور گھریلو زندگی کتنی خوشگوار ہے۔ اسی خوشگواری اور خوشحالی کے پیچھے مجرموں کا .... خوف

سمایا رہتا ہے۔ اگر اس ظالم باس کو معلوم ہو گیا کہ میں سراغ رساں ہوں تو میری بیوی اور بچے کا انجام بھی وہی ہو گا' جو جانی جیسے مخبر کی بیوی اور اس کے جوان بیٹے کا ہوا تھا۔

خطرناک مجرموں سے ٹکرانے والی سرکاری ملازمت ہمیشہ جان لیوا ہوتی ہے۔ اگر اپنی جان نہ جائے' تب بھی بیوی بچوں کے سروں پر خطرات منڈلاتے رہتے ہیں۔ فرمان اپنی اسماء اور اپنے بیٹے کو جب بھی ہنستے بولتے دیکھتا تھا' اندر سے ٹوٹنے لگتا تھا۔

جب وہ اسماء اور بیٹے کے قریب آیا تو ایک عورت کی چیخ سنائی دی پھر کئی چیخیں اُبھرنے لگیں۔ ایک جھولے کی زنجیر ٹوٹ گئی تھی۔ اس میں بیٹھا ہوا بچہ بلندی پر جھولتے وقت فضا میں جیسے اُڑنے لگا تھا۔ اس کی ماں ہائے ہائے کر رہی تھی۔ بلندی سے آ کر گرنے والے بچے کو کوئی اس کی بدقسمتی سے بچا نہیں سکتا تھا لیکن وہ سیدھا سی ساؤ کے قریب آیا۔ اسماء نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس بچے کو کیچ کر لیا مگر خود توازن نہ سنبھال سکی۔ بچے کی حفاظت کرتی ہوئی سی ساؤ کے تختے کے ایک سرے پر گر پڑی۔ دوسرے سرے پر بیٹھے ہوئے کامران کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اسماء کے ایک سرے پر گرنے سے کامران دوسرے سرے سے بلندی کی طرف اچھل گیا۔ تختے سے الگ ہو کر فضا میں خوف سے چیخنے لگا۔ اب اس کے زمین پر گرنے اور ہاتھ پاؤں ٹوٹنے کی باری تھی۔ ایسے ہی وقت فرمان نے دوڑتے ہوئے دونوں بازوؤں کو پھیلا کر اپنے بیٹے کو آغوش میں سمیٹ لیا۔

اسماء اپنے بیٹے کو بچانے کے لئے زمین سے اٹھتے ہوئے چیخنے لگی تھی پھر اس نے بیٹے کو باپ کی آغوش میں صحیح سلامت دیکھا تو خوشی سے آنکھیں بھیگ گئیں۔ پرائے بچے کی ماں جلدی سے آکر اس کے بازوؤں سے اپنے بیٹے کو لے کر اسماء کا شکریہ ادا کرنے لگی اور اسے دعائیں دینے لگی۔

اسماء نے کہا۔ "بہن! آپ کی دعائیں قبول ہو گئی ہیں۔ وہ دیکھیں میرا بیٹا بھی بلندی سے گرتے گرتے باپ کی آغوش میں پہنچ گیا ہے۔"

فرمان نے بیٹے کو زمین پر کھڑا کرتے ہوئے اسے تھپک کر کہا۔ "میرا بیٹا تو بہت دلیر ہے۔ ڈرتا نہیں ہے۔ مشکل کے وقت سنبھلنے کی کوشش کرتا ہے۔"

اسماء تیزی سے قریب آئی پھر بیٹے کو سینے سے لگا کر فرمان سے بولی۔ "کیا خدا کی قدرت ہے۔ میں نے پرائے بچے کی حفاظت کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہمارے بچے کی حفاظت کے لئے بھیج دیا۔"

"میں گھر گیا تھا۔ وہاں تمہیں نہ دیکھ کر سمجھ گیا کہ کامران کو لے کر پارک آئی ہو

گی۔ اگر میں یہاں نہ آتا تو کیا ہوتا؟"

"آج اتفاقاً ایک بڑا حادثہ پیش آتے آتے رہ گیا۔ میں اپنے بیٹے کا صدقہ اُتاروں گی۔"

فرمان نے کہا۔ "زندگی میں ہمیشہ اتفاقاً حادثے پیش نہیں آتے۔ دشمن بھی حادثوں کے بہانے زندگیاں چھین لیتے ہیں۔"

"خدا کا شکر ہے کہ ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ بعض لوگ اس طرح چھپ کر دشمنی کرتے ہیں کہ پتا نہیں چلتا۔"

"آپ تو خواہ مخواہ ڈرا رہے ہیں۔ یہاں سے چلیں۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

فرمان نے بیٹے کے ساتھ چلتے ہوئے بیوی سے کہا۔ "تم آج کل کچھ زیادہ ہی گھر سے باہر رہنے لگی ہو۔"

"میں صرف بیٹے کے لئے باہر نکلتی ہوں۔ صبح اسے سکول پہنچاتی ہوں' دوپہر کو سکول سے واپس لانے کے لئے گھر سے نکلتی ہوں۔ آپ کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ بیٹے کو تفریح کے لئے کہیں لے کر جایا کریں۔ مجبوراً میں ہی اسے کھیلنے کودنے کے لئے پارک لے آتی ہوں۔"

"کچھ بھی ہو۔ مجھے تمہارا یوں باہر نکلنا پسند نہیں ہے۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ پہلے تو آپ ایسی پابندیاں عائد نہیں کرتے تھے؟ میرے باہر نکلنے سے کیا قیامت آ جائے گی؟"

"قیامت آ سکتی ہے۔ ایک حسین عورت کو اغوا کیا جا سکتا ہے اور اغوا کرنے کے لئے بیٹے کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔"

وہ چلتے چلتے رک گئی۔ کامران کو اپنے سے لپٹا کر بولی۔ "خدا نہ کرے' کبھی ایسا ہو۔ آج پارک میں بچے کو ذرا سا حادثہ پیش آیا ہے تو آپ خواہ مخواہ ڈرائے جا رہے ہیں۔"

وہ جواباً کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے دونوں کے ساتھ چلتا ہوا گھر کے دروازے تک آیا۔ اسماء نے چابی سے دروازے کو کھولا۔ بیٹے کے ساتھ اندر گئی پھر پلٹ کر بولی۔ "آپ کیوں کھڑے ہیں' اندر آئیں۔"

"میں ابھی آ جاؤں گا۔ تم دروازے کو اندر سے بند رکھو۔ جب تک میری آواز نہ سنو' تب تک کسی دستک پر دروازہ نہ کھولا کرو۔"

اسماء نے سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر پوچھا۔ "بات کیا ہے؟ پہلے تو آپ نے ایسی ہدایات نہیں دیں۔ کیا آپ نے کسی کو دشمن بنالیا ہے۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ دروازہ بند کرو۔ میں تھوڑی دیر بعد آؤں گا۔"

اسماء نے شوہر کو پریشان دیکھ کر بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "آپ جلدی آیئے گا۔ اگر کوئی پریشانی ہے تو اسے دنیا والے نہیں، صرف بیوی ہی دور کرسکے گی۔"

دروازہ بند ہونے کے بعد وہ اسی جگہ کھڑا رہا۔ اسے کہیں جانا نہیں تھا۔ وہ محض اندر کے اندیشوں کو باہر نکال پھینکنے کے لئے تازہ کھلے ماحول میں رہنا چاہتا تھا۔ کوئی ایسی تدبیر کرنا چاہتا تھا، جس پر عمل کرنے سے اسماء اور کامران کی زندگیاں طبعی عمر تک پہنچتیں اور وہ بیدار بخت کی لائی ہوئی موت سے مارے نہ جاتے۔

وہ تھکے ہوئے انداز میں اپنے دروازے کے سامنے بیٹھ گیا اور تو کوئی جگہ نہیں تھی جہاں جانے سے پوری فیملی کی حفاظتی تدابیر کے نسخے ہاتھ لگ جاتے۔ اگر انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ سے ملازمت چھوڑتا تو اس ڈیپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر جنرل کو یہی شبہ ہوتا کہ فرمان علی بھی مجرموں کے سرغنہ بیدار بخت کے ہاتھوں فروخت ہو گیا ہے۔ حالانکہ اسے اپنی جان کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ اپنے ملک سے جرائم ختم کرنا چاہتا تھا مگر ایسے آثار نظر آ رہے تھے کہ حب الوطنی کا یہ جذبہ اسے بہت مہنگا پڑنے والا ہے۔

رات کے آٹھ بجے اسماء نے ایک کھڑکی کو ذرا سا کھول کر دیکھا۔ اسے دروازے کے سامنے بیٹھے ہوئے فرمان علی کے لباس کی جھلک نظر آئی۔ اسے یقین نہیں آیا کہ جس کا انتظار وہ شام سے کر رہی ہے، وہ دروازے پر بیٹھا ہے۔

وہ یقین کرنے کے لئے دروازے کے پاس آئی۔ پہلے اس نے کی ہول سے جھانک کر دیکھا۔ وہاں سے باہر کی سٹریٹ لائٹ میں فرمان علی کی صورت نظر آئی۔ اس نے فوراً دروازے کو کھولا۔ فرمان خیالات میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ اس نے دروازہ کھلنے کی آواز نہیں سنی۔ جب اسماء باہر نکل کر اس کے پاس آکر بیٹھی تو اس نے چونک کر اپنی شریکِ حیات کو دیکھا پھر کہا۔ "وہ.......... وہ میں ابھی آکر بیٹھا ہوں۔"

"میں نے تو آپ سے نہیں پوچھا کہ کب سے بیٹھے ہیں؟ یہ بھی نہیں پوچھوں گی کہ پہلے کبھی گھروالا گھر کے باہر دروازے پر نہیں بیٹھا۔ آج کیوں بیٹھا ہے؟"

اس نے اسماء کو دیکھا پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "میں تمہیں بتانا نہیں

چاہتا تھا مگر تم میری خاموشی اور پریشانی دیکھ کر پریشان ہو رہی ہو اس لئے بتا رہا ہوں۔ میرے ایک دوست کی بیوی اور جوان بیٹا ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے ہیں پھر شام کو پارک میں کامران کے ساتھ وہ حادثہ پیش آیا تو میرا دل بُری طرح گھبرانے لگا ہے۔"

"آپ بہت حساس ہیں۔ آپ کے دوست کی بیوی اور بیٹے کی ہلاکت سے مجھے بھی دکھ ہو رہا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کی طرح خدانخواستہ ہمیں بھی کوئی حادثہ پیش آئے۔"

آہ! یہ فرمان علی کی مجبوری تھی کہ بیوی کو دل و جان سے چاہنے کے باوجود یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ ایک مخبر کی بیوی اور بیٹا کس طرح قتل کئے گئے۔ وہ تو ایک معمولی مخبر تھا جبکہ فرمان علی سرکاری طور پر بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والا سراغ رساں تھا اور ڈائریکٹر جنرل نے خاص طور پر اسے بیدار بخت کے پیچھے لگایا تھا۔ یہ باتیں اس طرح راز میں رکھی جاتی ہیں کہ اپنی بیوی اور بچوں کو بھی بتائی نہیں جاتیں۔

اسماء نے اس کے بازو کو پکڑ کر کہا۔ "چلیں اُٹھیں۔ یہیں بیٹھے رہنے سے پڑوسی کیا سوچیں گے؟"

وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ گھر کے اندر آ گیا۔ کامران سو گیا تھا۔ وہ دونوں بھی اپنے بیڈ روم میں آ گئے۔ ان میاں بیوی میں پہلے ہی محبت کچھ کم نہ تھی اس رات اسماء نے ٹوٹ کر اس سے پیار کیا تاکہ اس کے دل و دماغ سے پریشانیاں دور ہو جائیں لیکن وہ بے چاری نہیں جانتی تھی کہ اپنے شوہر کو جس قدر پیار دے رہی ہے اسی قدر وہ شوہر اپنی بیوی بچے کی بے حد و حساب محبتوں سے زخمی ہو رہا ہے اور ایسی فکر میں مبتلا ہو رہا ہے جو انسان کا خون خشک کر دیتی ہے۔

اس کے اعلیٰ افسر سے یہ طے پایا تھا کہ جب تک وہ اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو گا، اس وقت تک اپنے اس اعلیٰ افسر سے رابطہ نہیں کرے گا اور اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بھی رُخ نہیں کرے گا۔ ایسا کرنے سے اندیشہ تھا کہ بیدار بخت کو اپنے مخبروں کے ذریعے اس کی حقیقت معلوم ہو جاتی۔

دو روز بعد وہ ایک باڈی گارڈ کی حیثیت سے بیدار بخت کے ساتھ ایک کار میں بیٹھ کر ایک شاہراہ سے گزر رہا تھا تو انہیں تیز رفتار ٹریفک کے درمیان جانی نظر آیا۔

ڈرائیور نے بیدار بخت کے حکم سے سڑک کے کنارے گاڑی روک دی پھر سب ہی جانی کو دیکھنے لگے۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، داڑھی بڑھ گئی تھی اور سر کے

چھوٹے چھوٹے بال کانٹوں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ وہ بیچ سڑک پر کھڑا ہوا ٹریفک پولیس کی طرح تیز رفتار گاڑیوں کو سگنل دے رہا تھا اور چیخ چیخ کر گالیاں دے رہا تھا کہ وہ تمام گاڑیوں والے ٹریفک کے اصولوں کی پابندی نہیں کر رہے ہیں اور آندھی طوفان کی رفتار سے گاڑیاں دوڑاتے جا رہے ہیں۔

بیدار بخت نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں جانتا تھا' بیوی اور جوان بیٹے کی موت اسے پاگل بنا دے گی اور یہ پاگل بن چکا ہے۔ میں غداروں کو اسی طرح زندہ رکھ کر زندگی سے بے گانہ کر دیتا ہوں۔"

فرمان علی کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے تھوک نگل کر حلق کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "باس! یہ کبھی ہوش و حواس میں آ کر آپ کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتا ہے۔"

باس نے کہا۔ "میں ایسی گہری چوٹ پہنچاتا ہوں کہ زخم کبھی نہیں بھرتا۔ یہ پاگل ہی رہے گا۔ بالفرض محال ہوش میں آئے گا تو اسے میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملے گا۔ میں ایک بار ٹھوکر کھانے کے بعد ٹھوکر کھانے والی جگہ سے گزرنا چھوڑ دیتا ہوں۔"

فرمان کو بیدار بخت کی ایک ایک بات ایسے لگ رہی تھی جیسے گرم گرم سلاخیں اس کے دل پر داغی جا رہی ہوں۔ ایسا احساس اس لئے بھی شدت اختیار کر رہا تھا کہ وہ بہت جلد بیدار بخت کے گہرے رازوں اور دوسرے ملک رہنے والے اس کے بگ باس تک بھی ثبوت کے ساتھ پہنچنے والا تھا۔ اس کے بعد ان کے خلاف ایک بہت بڑے آپریشن کا منصوبہ تھا۔

ایسے ہی مرحلے پر اگر بیدار بخت کو کسی طرح خفیہ آپریشن اور فرمان کی مخبری کی اطلاع مل جاتی تو اسماء اور کامران کا بھی وہی انجام آنکھوں کے سامنے ہوتا جو جانی کی بیوی اور بیٹے کا ہو چکا تھا۔

مشکل یہ تھی کہ فرمان انہیں شہر یا ملک سے باہر نہیں بھیج سکتا تھا۔ بیدار بخت کے بگ باس کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ وہ دنیا کے آخری سرے تک پہنچ کر اس کی اسماء اور اس کے بیٹے کامران کو ہلاک کروا سکتا تھا۔

وہ روز صبح و شام اپنی شریکِ حیات اور بیٹے کو دیکھتا تھا۔ اب ایک ہی صورت ان کے بچاؤ کی نظر آ رہی تھی کہ وہ بیوی اور بیٹے سے ہمیشہ کے لئے رشتہ توڑ لے۔ ان سے شوہر اور باپ کا تو کیا ہمدردی کا بھی کوئی رشتہ نہ رکھے اور یہ خبر بیدار بخت تک پہنچا دے کہ بیوی اور بیٹا ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی سے نکل گئے ہیں۔

اس نے اپنے فیصلے پر زیادہ غور نہیں کیا۔ دوسرے ہی دن اس نے اسماء سے پوچھا۔ "تم کامران کو سکول سے واپس لانے گئی تھیں لیکن سکول کے گیٹ پر ایک کار والے سے مسکرا کر باتیں کر رہی تھیں۔ کیا وہ لطیفے سنا رہا تھا یا اس مسکرانے والے کے ساتھ دوستی ہو گئی ہے؟"

وہ حیرانی سے بولی۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ وہ شخص ہمارے کامران کے کلاس فیلو کا باپ ہے۔ مجھے تو یاد نہیں ہے کہ میں مسکرا رہی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت اس نے کوئی ہنسا دینے والی بات کی ہو۔ میں حیران ہوں کہ آپ میری ٹوہ میں رہنے لگے ہیں۔"

"پہلے نہیں رہتا تھا لیکن یہ تماشا دیکھنے کے بعد مجھے ٹوہ میں رہنا چاہئے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ عورت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے وہ سچ کہتے ہیں۔"

وہ غصے سے بولی۔ "وہ بکواس کرتے ہیں۔ آپ پہلے مجھ پر اندھا اعتماد کرتے تھے' اب آپ کا مزاج بدلتا جا رہا ہے۔ کیا مجھ سے دل بھر گیا ہے؟"

"تمہیں اپنے حسن پر ناز ہے اس لئے بھٹک رہی ہو۔ اگر آئندہ میں نے تمہیں کسی غیر سے گفتگو کرتے دیکھ لیا تو............"

وہ غصے سے جانے لگا۔ اسماء نے اس کی آستین پکڑ کر کہا۔ "آپ نے پہلی بار میرے کردار پر کیچڑ اُچھالی ہے۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔ آپ مجھے مار ڈالیں لیکن اپنے الفاظ واپس لیں۔"

اس نے ایک اُلٹا ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری یہ مجال کہ میری آستین پکڑ کر میرا راستہ روکو۔"

یہ کہہ کر اس نے اسماء کو دھکا دیا۔ وہ زمین پر گر پڑی۔ کامران دور سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا اور زمین پر پڑی ہوئی ماں سے لپٹ کر بولا۔ "ممی! پاپا گندے ہیں۔ پاپا نے آپ کو مارا ہے۔ میں بڑا ہو کر پاپا کو ماروں گا۔"

فرمان علی کے دماغ کو شاک پہنچا۔ وہ سچ مچ نفرت سے ایسا نہیں کر رہا تھا لیکن اس سے بیٹے کی نفرت مل رہی تھی۔ محبت کرنے والا بیٹا اپنی ماں کی حمایت میں معصومیت سے کہہ رہا تھا کہ وہ بڑا ہو کر ماں کے ظلم کا حساب لے گا۔

وہ ایک دم سے منہ پھیر کر کمرے سے باہر آ گیا پھر گھر سے باہر آ گیا۔ جنہیں دل و جان سے چاہتا تھا ان کی نفرتیں مول لینے پر اندر سے ٹوٹ کر بکھر رہا تھا۔ تیزی سے ایک

طرف چلا جا رہا تھا۔ اپنے آپ کو سمجھا رہا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اپنے پیاروں کے لئے کر رہا ہے۔ اگر ان سے نفرتیں لے کر انہیں سلامتی دے سکتا ہے تو دل پر پتھر رکھ کر یہ سودا کرنا چاہئے۔

دوسرے دن اسماء کامران کا ہاتھ پکڑے فٹ پاتھ پر چل رہی تھی۔ ایک شخص شاپنگ کے بعد بہت سے پیکٹ اٹھائے ان ماں بیٹے کے ساتھ چل رہا تھا۔ رات کے دس بجے فرمان علی گھر میں آیا تو نشے میں ڈگمگا رہا تھا۔ اسماء نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا آپ نے پی ہے۔ توبہ کیسی بدبو آ رہی ہے۔"

"میرے تو منہ سے بدبو آ رہی ہے لیکن تمہارے پورے وجود سے بدبو پھوٹ رہی ہے۔ آج میں نے جو دیکھا ہے اسے دیکھ کر کوئی غیرت مند شوہر برداشت نہیں کر سکتا۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ نے کیا دیکھا ہے؟"

"بے شرم' بے حیا! مجھ سے پوچھتی ہے۔ اب تیرے یار تجھے شاپنگ کرانے لگے ہیں۔ تیرے ساتھ شاپنگ کا سامان اُٹھا کر چلتے ہیں۔"

وہ چیخ کر بولی۔ "آپ کا دماغ چل گیا ہے۔ میں کامران کے ساتھ ٹیکسی سٹینڈ جا رہی تھی۔ کوئی شخص اپنا سامان اُٹھائے جا رہا تھا۔ میں چاہتی تھی وہ آگے نکل جائے لیکن بھاری سامان کے باعث اس کی رفتار سُست تھی۔"

"مگر تم تیز رفتاری سے دور ہو سکتی تھیں۔"

"کامران بچہ ہے۔ آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ میں تیزی سے چل نہیں سکتی تھی۔"

"کیا تم انکار کرتی ہو کہ کسی نے تمہیں شاپنگ نہیں کرائی ہے؟"

"ہاں انکار کرتی ہوں۔ آپ گھر کی تلاشی لے لیں۔ آپ کو شاپنگ کی ایک چیز بھی نہیں ملے گی۔"

وہ تلاشی لینے لگا پھر دوسرے کمرے میں گیا تو اس کے پیچھے آنے والی اسماء ٹھٹک گئی۔ ایک پلنگ پر ڈھیر ساری مہنگی شاپنگ کا سامان پڑا ہوا تھا۔ حیرانی اور شدید بے عزتی کے احساس سے اسماء چیخ پڑی۔ "نہیں' یہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی دشمن مجھے بدنام کرنا چاہتا ہے۔ وہ دیکھیں کسی نے وہ کھڑکی کھولی ہے اور یہ تمام سامان یہاں پھینک گیا ہے۔"

اس کے چیخنے اور بولنے کی آواز پر کامران نیند سے بیدار ہو گیا۔ بستر سے اُتر کر ان ں طرف آنے لگا۔ فرمان اس وقت اسماء کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر کہہ رہا تھا۔ "تم کہتی کوئی سامان یہاں پھینک گیا ہے۔ اتنا قیمتی سامان کوئی پھینک کر نہیں بلکہ معشوق کے

قدموں میں رکھ کر جاتا ہے۔ تم مجھے بے وقوف شوہر سمجھ کر ایسی باتیں بنا رہی ہو؟"

سر کے بال فرمان کی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ تکلیف سے کراہتی ہوئی بولی۔ "میں اپنے کامران کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میں بے وفا نہیں ہوں۔ میں صرف آپ کی اور صرف آپ کی............"

فرمان نے سر کے بالوں کو جھٹکا دے کر اسے دور گرا دیا۔ کامران اپنی ماں کو سنبھالنے کے انداز میں قریب آیا' پھر بولا۔ "پاپا! میری ممی کو نہ ماریں۔ آپ ماریں گے تو میں بھی ممی کے ساتھ مر جاؤں گا۔"

فرمان علی کے دماغ میں جیسے بجلی سی کوندی۔ ٹھائیں ٹھائیں کی آواز کے ساتھ جانی کی بیوی اور جوان بیٹا مرتے ہوئے دکھائی دیئے' اور سامنے اس کی اسماء اور کامران ابھی زندہ تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر محبت کر سکتا تھا لیکن دکھاوے کی نفرت سے منہ موڑ لیا۔ وہاں سے کھڑکی کی طرف گیا پھر کہا۔ "اس کھلی ہوئی کھڑکی کے راستے عشق ہوتا ہے اور شوہر کے اعتماد کو دھوکا دیا جاتا ہے۔ اب میں تمہارے ساتھ ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتا۔ ہمارے راستے الگ ہو چکے ہیں۔ میں تمہیں طلاق دے کر اپنی زندگی سے آزاد کر رہا ہوں۔"

وہ زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ وہیں سے چیخ کر بولی۔ "نہیں' آپ مجھے بد چلن سمجھتے ہیں تو جان سے مار ڈالیں۔ مگر طلاق نہ دیں۔"

وہ نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ منہ پھیر کر کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگرمچھ کے آنسو کسی اور کو دکھاؤ۔ میں پورے ہوش و حواس میں رہ کر تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔"

"نہیں" اسماء کے حلق سے چیخ نکلی۔ وہ زمین پر سے اُٹھنے لگی۔ کامران ماں کو سنبھالتے ہوئے غصے سے باپ کو دیکھ رہا تھا۔

فرمان نے کہا۔ "میں تمہاری بے حیائی کے تمام ثبوت دیکھ کر تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔"

دوسری بار طلاق کا لفظ پتھر کی طرح لگا۔ اسماء اُٹھ کر شوہر کی طرف بڑھتے بڑھتے لڑکھڑا کر گر پڑی۔ فرمان علی نے تیسری بار کہا۔ "میں پھر ہوش و حواس میں رہ کر یہ تیسری طلاق بھی دے رہا ہوں۔"

اسماء نے صدمے کی شدت سے "نہیں" کہہ کر دونوں ہاتھ فرش پر مارے۔ دونوں کلائیوں کی چوڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئیں۔ فرمان ان چوڑیوں کے ٹکڑوں کو جوتوں سے

روندتا ہوا دروازے کے پاس آیا۔ اس وقت کامران کہہ رہا تھا۔ "آئی ہیٹ یو پاپا! آئی ہیٹ یو۔"

اس نے دروازے پر رُک کر بڑے دُکھ سے بیوی اور بیٹے کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "میں حق مہر کے عوض اپنا یہ مکان اور یہاں کی ہر چیز تمہیں دے کر جا رہا ہوں اور یہ بیٹا جس پر میرا حق ہے۔ اسے میں نے.........."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے کامران نے کہا۔ "میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں۔ میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں۔ میں صرف اپنی ممی کا بیٹا ہوں۔"

فرمان نے کہا۔ "میرے کہنے سے پہلے ہی بچے نے کہہ دیا ہے کہ یہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ لہٰذا یہ تمہیں مبارک ہو۔"

یہ کہتے ہی وہ پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا' اس مکان سے نکل گیا۔ باہر اس کے باس کی پجارو کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کی سٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا پھر اسے سٹارٹ کر کے تیزی سے ڈرائیو کرنے لگا۔ اس نے اپنے اور بیوی بیٹے کے درمیان ایسی فولادی دیوار کھڑی کر دی تھی جو مذہب کے مطابق تھی۔ اس دیوار کو اب کوئی طاقت توڑ نہیں سکتی تھی اور نہ ہی اس لٹے ہوئے گھر کو آئندہ ہنستا بستا گھر بنا سکتی تھی۔

وہ جنونی انداز میں ڈرائیو کرتا ہوا بیدار بخت کی کوٹھی کے سامنے آیا۔ دربان گیٹ کھولنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی اس کی پجارو گیٹ کو توڑتی ہوئی کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ دربان دوڑتا ہوا کیبن میں گیا۔ پھر فون کا ریسیور اُٹھا کر نمبر ڈائل کر کے بولا۔ "جناب عالی! آپ کا باڈی گارڈ فرمان بہت غصے میں ہے' وہ پجارو کے ذریعے گیٹ کو توڑتے ہوئے اندر آ گیا ہے۔"

فرمان احاطے میں داخل ہونے کے بعد گاڑی کو لان کے پھول پودوں اور گھاس وغیرہ پر چلا رہا تھا۔ کبھی سٹیئرنگ گھما رہا تھا کبھی ادھر گاڑی کو موڑ رہا تھا۔ کتنے ہی گن مین خطرہ محسوس کرتے ہوئے دیواروں اور ستونوں کی آڑ میں اپنی اپنی گن سیدھی کئے کھڑے تھے۔ آخر وہ پجارو پورچ کے ایک ستون سے ٹکرا کر رک گئی۔ سٹیئرنگ کی طرف کا دروازہ کھل گیا۔ فرمان کا سر سٹیئرنگ سے ٹکرا گیا۔ چہرہ زخمی ہو گیا تھا۔ وہ وہاں سے لڑھکتا ہوا کھلے ہوئے دروازے سے باہر آ کر گھاس پر گر پڑا۔

بیدار بخت اوپر بالکونی سے یہ سب کچھ حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فرمان علی جیسا وفادار باڈی گارڈ ایسی حرکتیں کیوں کر رہا ہے۔ جب وہ زخمی

حالت میں گاڑی سے باہر آ کر گر پڑا تو اس نے اپنے کارندوں کو حکم دیا۔ "اسے اٹھا کر اندر لے جاؤ۔"

حکم کی تعمیل کی گئی۔ کارندوں نے اس کے پاس آ کر اٹھانا چاہا تو وہ خود اٹھ کر بیٹھ گیا پھر دو مسلح افراد کا سہارا لے کر بڑی کمزوری سے چلتا ہوا کوٹھی کے اندر آیا۔ بیدار بخت بڑے سے ہال نما ڈرائنگ روم میں کھڑا ہوا تھا۔ اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ ایک کارندے نے کہا۔ "باس! یہ فرمان کبھی پیتا نہیں ہے لیکن آج اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی ہے۔"

جن کارندوں نے فرمان کو سہارا دیا ہوا تھا' فرمان نے انہیں دھکے دے کر اپنے سے دور کرتے ہوئے پھر ڈگمگاتے ہوئے کہا۔ "ہاں میں نے پی ہے مگر پینے کے بعد بھی ہوش میں ہوں۔ باس! میں نے آپ کی قیمتی پجارو کو نقصان پہنچایا ہے' آپ مجھے گولی مار دیں۔"

بیدار بخت نے کہا۔ "تمہارے جیسے وفادار پر ایسی کئی پجارو کو آگ لگا سکتا ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے۔ تم تو ٹھنڈے دماغ کے آدمی ہو' پھر آج جوش اور جنون میں کیوں ہو؟"

"آج مجھ پر قیامت گزر گئی ہے۔ آج میری ازدواجی گھریلو زندگی کا باب بند ہو چکا ہے۔ میں ہمیشہ کے لئے بیوی اور بیٹے سے بچھڑ گیا ہوں۔"

"کیا تمہاری بیوی اور بیٹا مر گئے ہیں؟"

"ہاں دونوں میرے لئے مر گئے ہیں مگر پھر بھی زندہ ہیں۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں نشے میں بکواس کر رہا ہوں۔ میرا نشہ تو اسی وقت اڑ گیا تھا جب میں نے اپنی بیوی کی بے حیائی دیکھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ میرے اعتماد کو دھوکا دے سکتی ہے۔ آہ! اس دنیا میں کسی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ باس! میں نے اسے طلاق دے دی ہے۔"

"طلاق؟" باس نے پوچھا۔

"ہاں۔ اپنی آنکھوں سے اس کی بے حیائی دیکھنے کے بعد میری غیرت' میری مردانگی یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ میں اس کے ساتھ ایک پل بھی رہتا۔ اس لئے میں نے اسے طلاق دے دی۔ ایک نہیں' تین طلاقیں دے دیں۔ میں نے پان کی پیک کی طرح اسے اپنی زندگی سے باہر تھوک دیا ہے۔"

بیدار بخت نے کہا۔ "تمہیں یہی کرنا چاہئے تھا۔ تم نے مردوں والی بات کی ہے۔ یہ اچھا کیا اپنی زندگی سے دھکا دے کر ایک بے وفا بد چلن کو نکال دیا لیکن بیٹا تو تمہارا ہے۔"

"میرا!" فرمان اِدھر سے اُدھر جاتے ہوئے ہنسنے لگا۔ "ہا ہا ہا۔ بیٹا میرا ہے مگر میں باپ ہو کر بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ میرا ہے' جو عورت ایک مرد کی نہ ہو۔ اس کی اولاد کا حساب نہیں ملتا کہ ایک بے حیا عورت کے بیٹے کا اصل باپ کون ہے؟ میں نے اس بیٹے کو بھی اس کے حوالے کر دیا ہے اگر وہ میرے پاس رہتا تو اسے دیکھ دیکھ کر میری غیرت پوچھتی رہتی کہ واقعی وہ میرا خون ہے یا نہیں؟"

"بے شک۔ صرف ایک عورت ہی بتا سکتی ہے کہ اس نے کس کی اولاد کو جنم دیا ہے۔ میں تمہارے احساسات کو سمجھ رہا ہوں۔ آج تمہیں بے وفا بیوی اور بیٹے کی دائمی جدائی کا صدمہ نہیں ہے بلکہ صدمہ یہ ہے کہ تم ایک عورت سے دھوکا کھاتے رہے۔ میں تمہارا غم غلط کروں گا۔"

اس نے ایک ملازم کو حکم دیا۔ "فرمان کو ایک بلیک لیبل وہسکی کی بوتل دو اور اس کوٹھی میں جو کنیز اسے پسند آئے' اسے ہمارے وفادار کے حوالے کر دو۔"

"باس! میں ایک مہربانی چاہتا ہوں۔ آئندہ اُس گھر میں واپس نہیں جانا چاہتا۔ آپ میرا کوئی دوسرا ٹھکانا بنا دیں۔ یا دن رات مجھے اپنے قدموں میں رہنے دیں۔"

"تم نے ہمارے دل کی بات کہہ دی ہے۔ تم اسی لمحے سے ہماری اس کوٹھی میں رہا کرو گے۔ جنہیں ٹھکرا کر چلے آئے ہو' انہیں بھول جاؤ۔ یہاں پیو اور عیش کرتے ہوئے جیو۔"

یہ کہہ کر بیدار بخت وہاں سے چلا گیا۔ فرمان علی جیسے صدمات سے چُور ہو کر تھکے ہوئے انداز میں قالین پر گھٹنے ٹیک کر جھک گیا۔ اسے اب یہ اطمینان حاصل ہو گیا تھا کہ باس کو کبھی اس کی غداری کا علم ہو گا تو اسماء اور کامران پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ وہ غداروں کی بیوی بچوں کو ہلاک کرتا تھا۔ اسماء جیسی بد چلن ثابت ہونے والی مطلقہ عورت کو وہ کبھی ہلاک نہ کرتا۔ کیونکہ اس کی ہلاکت سے فرمان پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ اس نے باس کے دماغ میں یہ بات بٹھا کر بیوی اور بیٹے کو سلامتی دی تھی مگر یہ سوچ کر وہ پریشان ہو رہا تھا کہ اسماء جیسی محبت کرنے والی وفا شعار بیوی کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی؟

☆------☆------☆

وہ کامران کو اپنے سینے سے لگائے فرش پر بیٹھی رہی۔ سامنے دیوار کو تکتی رہی اور سوچتی رہی کہ ابھی جو کچھ ہو رہا ہے' وہ سچ ہے یا محض خواب ہے۔ اگر ایسا دل دہلا دینے والا خواب ہوتا تو وہ آیت الکرسی پڑھ کر پھر سو جاتی مگر جاگتی ہوئی آنکھوں اور صدمے سے

لوٹ جانے والا دل کہہ رہا تھا کہ اب وہ ایک مطلقہ عورت ہے۔ ایک دل و جان سے چاہنے والے شوہر نے اسے ہمیشہ کے لئے ٹھکرا دیا ہے۔

اور یہ توہین تو برداشت نہیں ہو رہی تھی کہ اس نے تمام تر وفاداری بھلا کر اس پر بد چلنی کا الزام لگایا ہے۔ اس بات پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کامران بار بار ماں کے آنسو پونچھتا رہا اور کہتا رہا۔ "پاپا گندے ہیں۔ آپ نہ روئیں ممی! میں دروازے بند کر دوں گا۔ پاپا کو یہاں نہیں آنے دوں گا۔"

وہ روتی ہوئی بولی۔ "وہ خود نہیں آئیں گے۔ میں بھی ان کے سامنے نہیں جا سکوں گی۔ کیونکہ ہم ایک دوسرے کے لئے نامحرم ہو چکے ہیں۔"

"ممی! یہ نامحرم کیا ہوتا ہے؟"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟ اتنا سمجھ لو کہ وہ میرے لئے اور میں ان کے لئے پرائی ہو چکی ہوں۔ آئندہ ہم کبھی تمہارے پاپا کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکیں گے اور............"

وہ خلا میں تکتی ہوئی بولی۔ "اور اب تو مجھے اس پرائے شخص سے پردہ کرنا ہو گا۔ ہاں پردہ کرنا ہو گا۔ میں ایسا پردہ کروں گی کہ وہ کبھی اپنی غلطی پر پچھتا کر مجھے ڈھونڈنا چاہیں گے تو میری صورت نہیں دیکھ سکیں گے۔"

وہ صبح اذان ہونے تک روتی رہی اور سوچتی رہی اور آئندہ عزت و آبرو سے زندگی گزارنے کی راہیں متعین کرتی رہی۔ کامران سو گیا تھا۔ وہ فرش پر سے اُٹھ گئی۔ ایک طرف پلنگ پر رکھا ہوا شاپنگ کا ڈھیر سارا سامان ایک عزت دار گھریلو خاتون کی توہین کر رہا تھا۔ یہ سوال ذہن میں ڈنک مار رہا تھا کہ وہ تمام سامان کس نے کھڑکی کے راستے اس کے گھر میں پہنچا کر اس کی ازدواجی زندگی میں آگ لگا دی ہے؟

اس چبھتے ہوئے سوال کا جواب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا پھر خلافِ توقع اچانک ہی طلاق کی گالیاں کھانے کا صدمہ ایسا تھا کہ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

اس نے اپنا اور کامران کا مختصر سامان باندھا پھر بیٹے کو نیند سے جگا کر اپنے ساتھ لے گئی۔ فرمان کے اس مکان کو اور مکان کے تمام سامان کو چھوڑ دیا۔ جس گھر میں شوہر نہ ہو' وہ گھر نہیں ہوتا۔ صرف ایک مکان ہوتا ہے اور وہ صرف مکان میں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ گھر بسانا چاہتی تھی۔ مگر کیسے بساتی؟ ایک شریف عورت طلاق حاصل کرنے کے باوجود کسی پرائے مرد کو جیون ساتھی بنانا کبھی گوارا نہیں کرتی۔

اس نے بی اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ لاہور میں اس کی ایک سہیلی انگلش میڈیم سکول کی ہیڈ مسٹریس تھی۔ وہاں اسماء کو ایک ٹیچر کی ملازمت مل گئی۔ سہیلی نے اس کی رہائش کا بھی انتظام کر دیا۔ اس طرح وہ کراچی سے بہت دور آ کر مطمئن ہو گئی کہ آئندہ کبھی فرمان علی سے سامنا نہیں ہو گا۔

فرمان نے اپنا گھر اُجاڑ کر بیوی اور بیٹے کی سلامتی کو یقینی بنا دیا تھا مگر اس نے اپنے دل و دماغ کا سکون غارت کر لیا تھا۔ وہ مہینے دو مہینے اور چھ مہینے میں کئی بار اس مکان کے قریب سے گزرتا رہا اور اسے ہمیشہ ویران پاتا رہا۔ اس نے شہر کے مختلف حصوں میں بھی انہیں تلاش کیا۔ تلاش کرنے کا مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ بیوی اور بیٹے کی خیریت معلوم ہوتی رہے لیکن وہ دونوں اسے شہر میں نظر نہیں آئے۔ یہی بات سمجھ میں آئی کہ اسماء بیٹے کو لے کر کسی دوسرے شہر چلی گئی ہے۔

آئندہ ایک برس کے دوران فرمان علی نے بیدار بخت کے کالے دھندوں کے متعلق ٹھوس ثبوت کے ساتھ بہت اہم معلومات حاصل کر لیں۔ اس نے اعلیٰ افسران کے ذریعے پہلے انٹرپول سے تعاون حاصل کیا اور بیرونِ ملک رہنے والے بیدار بخت کے بگ باس کو گرفتار کرایا پھر تمام خفیہ اڈوں پر کامیاب چھاپے مارنے کے بعد بیدار بخت کو ہتھکڑیاں پہنا دیں۔

اس نے ہتھکڑیاں پہننے کے بعد ناگواری سے مسکرا کر فرمان علی کو دیکھا' پھر کہا۔ "میں نے کبھی کسی سے دھوکا نہیں کھایا تھا مگر تم تو آستین کے سانپ نکلے۔ ہم جیسے مجرم یہ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ کبھی اپنے گریبان میں اور آستین میں جھانک کر نہیں دیکھتے ہیں۔"

فرمان نے کہا۔ "اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ آستین سے سانپ نکل آیا ہے۔ عدالت تمہیں سمگلنگ اور کئی قتل کے جرم میں سزائے موت دے گی۔"

اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "میں تمہارے جیسے سانپ کا سر کچلنے سے پہلے نہیں مروں گا۔ مجھے کسی جیل میں بھیجنے سے پہلے وہاں کی آہنی سلاخوں کو چیک کر لینا کیونکہ وہ میرے لئے کسی وقت بھی موم بن جائیں گی۔"

وہ پولیس والوں کی حراست میں چلا گیا۔ انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے فرمان علی کو انعام و اعزازات سے نوازا گیا۔ اسے ماتحت چیف افسر کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ اس نے ڈائریکٹر جنرل سے کہا۔ "سر! میں اپنی خدمات کے صلے میں دو ماہ کی چھٹی چاہتا ہوں۔ اس کم بخت بیدار بخت کا کیس ایسا منحوس تھا کہ میری بیوی اور بیٹا مجھ سے بچھڑ کر

ہیں گم ہو گئے ہیں۔ میں انہیں تلاش کروں گا۔"

"تمہیں چھٹی مل جائے گی۔ ویسے اپنی بیوی اور بیٹے کی تصاویر تمام اخبارات میں شائع کراؤ اور اپنا موجودہ پتا بتاؤ۔ وہ یقیناً اخبار پڑھ کر تم سے آملیں گے۔"

فرمان علی نے طلاق والی بات کسی افسر کو نہیں بتائی تھی کیونکہ اس طرح اسماء کی توہین ہوتی اور بیٹا احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتا۔ ویسے اس نے اخبارات میں اسماء اور کامران کی تصاویر شائع کرائیں۔ اسماء کو پیغام بھی دیا کہ وہ ایک بار آ کر اس سے ملاقات کرے۔ وہ ازسرنو ازدواجی زندگی گزار سکتے ہیں لیکن یہ طریقہ ناکام رہا۔ اسماء نہ اس کے شائع کردہ پتے پر ملنے آئی اور نہ ہی اس کے پیغام کا جواب ڈاک کے ذریعے دیا۔

وہ دو ماہ تک مختلف شہروں میں انہیں ڈھونڈتا رہا اور ناکام و نامراد بھٹکتا رہا پھر ڈیوٹی پر واپس آگیا۔ اسماء نے نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ ایک ٹیچر کی حیثیت سے اسکول میں مصروف رہتی تھی پھر مزید آمدنی کے لئے بچوں کو ٹیوشن پڑھایا کرتی تھی۔ ایسی مصروفیات میں وہ اخبارات نہیں پڑھ پاتی تھی۔ اگر پڑھ بھی لیتی تو اس محبوب سے اور شوہر سے رابطہ نہ کرتی کیونکہ وہ نامحرم ہو چکا تھا۔

یوں مہینے اور سال گزرنے لگے۔ کامران جوان ہو گیا۔ اس نے سب سے زیادہ مارکس حاصل کر کے انٹر کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ وہ بہت ذہین تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ طلاق کیا ہوتی ہے؟ اس کے باپ نے کس طرح اس کی ماں پر جھوٹا الزام لگا کر ان ماں بیٹے کو اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔ وہ جب بھی فرمان علی کے متعلق سوچتا تھا تو نفرت سے دل و دماغ میں زہر بھرنے لگتا تھا۔

اسماء نے کہا۔ "بیٹے! میں نے اپنی زندگی میں جو بہت بڑا صدمہ اُٹھایا تھا۔ تمہاری شاندار کامیابی نے اس صدمے کو کم کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا بیٹا یونیورسٹی کے بھی تمام امتحانات میں اوّل آیا کرے گا۔"

اس نے کہا۔ "ممی! میں الجھن میں ہوں۔ آئندہ ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتا' جس میں اس کم ظرف کا نام آئے جو میرا باپ کہلاتا ہے۔"

"بیٹے! یہ بڑی بات ہے۔ تمہارے پاپا جیسے بھی تھے' ان کی شان میں تمہیں گستاخی نہیں کرنا چاہئے۔"

"نہیں کروں گا لیکن اس نام کو اپنے ساتھ برداشت نہیں کروں گا۔ جب تک سکول میں تعلیم حاصل کرتا رہا اور میرے سرٹیفکیٹ میں یہ لکھا جاتا رہا کہ کامران علی ولد

فرمان علی تو میں خون کے گھونٹ پیتا رہا۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں ذہنی اذیت میں مبتلا نہ رہوں تو کسی طرح ولدیت میں آنے والے نام کو مٹا دیں۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو؟ اولاد کی زندگی سے باپ کا نام کبھی نہیں مٹ سکتا۔"

"جب آپ کی زندگی سے شوہر کا نام مٹ سکتا ہے تو وہی نام میری زندگی سے کیوں چپکا ہوا ہے؟"

"ایسا انسانی تہذیب کی ابتدا سے ہوتا آیا ہے۔ اولاد ہمیشہ باپ کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔"

وہ بیٹے کو سمجھاتی ہوئی کچن میں آئی پھر چولہا جلانے لگی۔ کامران نے کہا۔ "میں یونیورسٹی میں داخلہ لینے جاؤں گا تو وہاں بھی ولدیت یہی لکھی جائے گی۔ میں کہوں گا' باپ کا نہیں میری ماں کا نام لکھو تو وہ بھی میری بات نہیں مانیں گے۔ ممی! میں صرف آپ کے نام سے پہچانا جانا پسند کرتا ہوں۔"

"تم ذہین ہو کر بچگانہ باتیں کر رہے ہو۔"

"یہ بچگانہ باتیں نہیں ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اے لوگو! قیامت کے دن تمہیں تمہاری ماؤں کے نام سے پکارا جائے گا۔ کیا اس دنیا کے اصول اور قوانین اللہ تعالیٰ کے فرمان سے بڑھ کر ہیں؟"

"اس سلسلے میں بحث نہ کرو۔ قیامت آنے دو پھر میرے نام سے اپنی شناخت قائم کر لینا۔"

"تو پھر میں قیامت کے دن ہی آپ کے نام کے ساتھ یونیورسٹی میں داخلہ لوں گا۔ اس وقت تک یہ سرٹیفکیٹ میرے لئے عذاب ہے۔"

اس نے جیب سے سرٹیفکیٹ نکال کر اسے کھولا پھر اسے چولہے کی آگ کے پاس لے گیا۔ سرٹیفکیٹ کے ایک حصے میں آگ لگ گئی۔ شعلہ بھڑک گیا۔ اسماء نے چیخ کر کہا۔

"یہ کیا حماقت ہے؟"

اسماء نے سرٹیفکیٹ سے بھڑکنے والے شعلے کو اپنی مٹھی میں دبا لیا۔ شعلہ بجھ گیا۔ آگ بجھ گئی۔ کامران نے ماں کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔ "ممی! یہ آپ نے کیا کیا؟ ہاتھ جل گیا ہو گا' پلیز مٹھی کھولیں' مجھے دیکھنے دیں۔"

اسماء نے کہا۔ "یہ صرف ایک سرٹیفکیٹ نہیں ہے۔ تمہاری ماں کی برسوں کی محنت ہے۔ میں نے دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ محنت کرتی رہی اور تمہیں پڑھاتی

رہی اور تم ایک پل میں میری برسوں کی محنت کو جلا کر راکھ کرنا چاہتے ہو۔"

اسماء نے سرٹیفکیٹ کو پوری طرح کھول کر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو' یہ ذرا جل چکا ہے لیکن میں نے تمہارے ساتھ تمہارے باپ کے نام کو جلنے سے بچا لیا ہے۔ جانتے ہو کیوں؟"

اس نے ماں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ماں نے کہا۔ "تمہارے باپ کا نام جل جائے گا اور ایک باپ کا نام تمہاری زندگی میں نہیں رہے گا تو تمہاری ماں کو گالی پڑے گی۔ ایک بازاری عورت اپنی اولاد کے صحیح باپ کی نشاندہی نہیں کر سکتی۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میرے پاس بھی تمہارے باپ کی صحیح نشاندہی نہ ہو؟"

کامران تڑپ کر ماں سے لپٹ گیا۔ "سوری ممی سوری! آپ نے ایسی بات کہہ دی ہے کہ اب یہ نفرت انگیز نام میری ماں کی شرافت کے لئے لازمی ہو گیا ہے۔ آج میری سمجھ میں آگیا ہے کہ باپ کا نام میرے لئے ہی نہیں' میری ماں کی شرم و حیا کے لئے بھی نہایت ضروری ہے۔ سوری ممی سوری............!"

فرمان علی کے نام کے حوالے سے وہ ماں بیٹے ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے اور جس نام کا حوالہ تھا' وہ نام والا زندہ رہ کر بھی ان کے لئے مُردہ تھا۔

☆======☆======☆

یونیورسٹی کا ماحول تعلیمی لحاظ سے تو بہتر ہوتا ہے لیکن رومانی لحاظ سے جوانوں کے لئے بہترین ہوتا ہے۔ طلبا اور طالبات میں کچھ پرانے ہوتے ہیں اور کچھ نئے سال کے موسمی پھل کی طرح' حسین طالبات اور طلبا کے تر و تازہ چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں ذہانت بھی ہوتی ہے۔ شرارت بھی ہوتی ہے۔ حسن بھی ہوتا ہے اور جوانی کا گرم خون بھی دوڑتا رہتا ہے۔

کامران نے وہاں کے ماحول کو بہت ہی رنگین اور دلچسپ پایا۔ کچھ لڑکیاں بہت ریزرو رہتی تھیں۔ کسی لڑکے سے بات تک کرنا گوارا نہیں کرتی تھیں اور کچھ اتنی بے باک ہوتی تھیں کہ سب ہی لڑکوں سے ہنستی بولتی رہتی تھیں۔ کامران خوبرو' قد آور اور باڈی بلڈر تھا۔ ایک لڑکی اس کے سامنے سے اکثر گزرتی ہوئی سرد آہیں بھرتی تھی۔ دوسری لڑکی اس کا راستہ روک کر کہتی تھی۔ "ہائے چاکلیٹ! کبھی تو نظریں اٹھا کر دیکھ لیا کرو۔"

وہ شرماتا تو نہیں تھا لیکن کتراتا ضرور تھا۔ کسی کے ساتھ سکینڈل نہیں بنانا چاہتا تھا۔ لڑکے بھی اتنے شریر تھے کہ ان سے بھی دور ہی رہتا تھا اور جو لڑکے ذہین اور سنجیدہ تھے

وہ بھی کامران کی طرح وقت پر یونیورسٹی آتے تھے۔ کلاسیں اٹینڈ کرتے تھے۔ درمیانی طویل وقفہ ہوتا تب بھی وقت ضائع نہیں کرتے تھے' وہاں کی لائبریری میں بیٹھ کر کتابیں پڑھتے تھے۔

تقریباً ایک ماہ بعد لائبریری کے ایک چپڑاسی نے چند لڑکوں کے پاس آکر پوچھا۔

"آپ میں سے کامران صاحب کون ہیں؟"

وہ بولا۔ "میرا نام کامران ہے' بات کیا ہے؟"

"آپ لائبریری کے فون بوتھ میں جائیں۔ آپ کی والدہ کا فون ہے۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر بوتھ میں آیا۔ ریسیور ایک طرف رکھا ہوا تھا۔ اس نے اسے اٹھا کر کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو ممی! کیا آپ ہیں؟"

اسے ماں کی آواز سنائی دی۔ "ہاں بیٹے! میں بول رہی ہوں۔"

"خیریت تو ہے؟ آپ نے کیسے فون کیا؟"

"میں بالکل خیریت سے ہوں۔ تم سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا دن رات پڑھتے لکھتے ہی رہو گے۔ گھر میں آتے ہو تو کتابیں کھول کر بیٹھ جاتے ہو۔ یونیورسٹی میں پڑھنا لازمی ہے لیکن فرصت کے وقت لائبریری میں بیٹھنا ضروری نہیں ہے۔"

"تعجب ہے۔ آج پہلی بار آپ مجھے پڑھنے سے منع کر رہی ہیں۔"

"میں پڑھنے سے نہیں' زیادہ پڑھنے سے منع کر رہی ہوں۔ زندگی کی خوشیاں اور رونقیں کتابوں سے باہر ہوتی ہیں۔ کبھی اپنے آس پاس کے ماحول کی رنگینیوں اور خوبصورتیوں کو سمجھا کرو۔"

"جی' میں سمجھا نہیں۔"

"اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے؟ کیا میرے لئے بہو نہیں لاؤ گے؟"

"جی؟" حیرانی سے بولا۔ "آپ فون پر بہو کی ضرورت محسوس کر رہی ہیں؟"

"میں روبرو تم سے کہنا چاہتی تھی مگر جھجک محسوس ہوتی تھی۔ میں نے سوچا فون پر کہنا مناسب ہو گا۔"

"آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ بیٹے سے بہو کی بات کرنے سے جھجکتی ہیں۔ اچھی بات ہے۔ میں گھر آکر اس سلسلے میں بات کروں گا۔"

"نہیں۔ میرے سامنے ایسی باتیں نہ کرنا۔ ماں بیٹے کے درمیان کچھ پردہ رہنا چاہئے۔ یہ اخلاق اور تہذیب کا تقاضہ ہے۔"

"آپ ہمیشہ اخلاق اور تہذیب کا درس دیتی ہیں' مجھے آپ جیسی ماں پر فخر ہے۔ بہرحال بہو تو ضرور لاؤں گا لیکن پہلے تعلیم مکمل ہو جائے۔"

"تعلیم تو زندگی بھر حاصل کی جاتی ہے لیکن پیار و محبت کی عمر گزر جائے تو پھر واپس نہیں آتی۔"

کامران نے بڑی حیرانی سے ریسیور کو دیکھا۔ اس کی ممی نے کبھی پیار و محبت جیسے الفاظ جوانی کے حوالے سے ادا نہیں کئے تھے۔ پہلی بار اس نے سن کر کہا۔ "ممی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ ایسا اس لئے کہہ رہی ہوں کہ اپنا گھر آباد نہیں کر سکی لہٰذا تمہارا گھر آباد کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے لڑکی بھی دیکھ لی ہے۔"

"میں آپ کی خوشیوں کی خاطر گھر آباد کروں گا لیکن آپ نے لڑکی کہاں دیکھی ہے؟"

"تمہاری یونیورسٹی میں دیکھی ہے۔ وہاں داخلے کے وقت تمہارے ساتھ آئی تھی۔ تب اسے دیکھا تھا پھر آج یونیورسٹی کے قریب سے گزر رہی تھی تو وہ پھر نظر آئی۔ ہائے میں اسے دیکھتی ہوں تو دل کھنچا جاتا ہے۔ آج وہ گلابی رنگ کے سوٹ میں ہے۔ اس کے گلے میں سیاہ چمکتے موتیوں کی ایک مالا ہے۔ اس نے شانے سے جو ہینڈ بیگ لٹکا رکھا ہے' وہ بھی سیاہ ہے تم نے تو اسے ضرور دیکھا ہو گا؟"

"آپ جانتی ہیں ممی! میں اِدھر اُدھر نہیں دیکھتا۔ اپنے راستے چلتا ہوں۔ یہ بھی آپ کی ہدایت ہے کہ شریف لڑکے پرائی لڑکیوں کو نہیں دیکھتے ہیں۔"

"لیکن شریف بچے اسے ضرور دیکھتے ہیں جسے ماں اپنی بہو بنانا چاہتی ہے۔ میں چاہتی ہوں' آج تم اسے دیکھ لو۔ یوں بھی شادی سے پہلے ایک دوسرے کے مزاج کو ضرور سمجھ لینا چاہئے۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں ابھی لائبریری سے نکل کر اسے تلاش کروں گا۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ یونیورسٹی کے باہر ایک فون بوتھ کے اندر دو لڑکیاں تھیں۔ ایک حسین لڑکی نے ریسیور رکھ کر دوسری لڑکی کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "بازی مار لی۔ چل نکال ایک سو روپے' بڑی آئی کہتی تھی کہ وہ نظر اٹھا کر مجھے نہیں دیکھے گا۔ اب وہ مجھے تلاش کرنے آ رہا ہے۔"

سہیلی نے پرس کھول کر سو کا ایک نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "رومانہ تُو شیطان کی خالہ

ہے۔ یہ لے سو روپے۔ تعجب ہے تُو آواز کس طرح بدل کر بولنے لگتی ہے؟ کیا واقعی اس کی ماں کی آواز میں بول رہی تھی۔"

"اس کی ماں کی آواز میں نہ بولتی تو وہ میرے چکر میں کبھی نہیں آتا۔ اس پتھر کو پانی کرنے کے لئے میں نے سب سے پہلے اس کے گھر کا پتا معلوم کیا۔ وہاں اس کی ممی کو دیکھا۔ وہ اپنے مکان کے دروازے پر تالا لگا کر بازار سے سودا لانے جا رہی تھیں۔ میں ان کا تعاقب کرتی رہی۔ بڑی دیر تک بازار میں گھومتے رہنے کے بعد انہوں نے گھر کی ضرورت کا اتنا سامان خریدا کہ دو بڑے تھیلے بھر گئے۔ وہ انہیں بڑی مشکلوں سے اٹھا کر چل رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ "ماں جی! آپ ایک تھیلا مجھے دیں۔ میں آپ کے گھر پہنچا دوں گی۔"

پہلے تو خاتون نے رسماً انکار کیا پھر میں نے ان کا آدھا بوجھ کم کر دیا۔ ایک تھیلا اٹھا کر ان سے گفتگو کرتی ہوئی انہیں گھر تک پہنچا دیا۔ اس طرح ان کی آواز' بولنے کے انداز کی نقل دل ہی دل میں کرتی رہی اور اب تم نے دیکھ ہی لیا کہ میں نے فون پر اسے کیسا چکر دیا ہے۔"

وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی یونیورسٹی کے احاطے میں آئیں پھر ایک درخت کے سائے میں بنی ہوئی سیمنٹ کی بینچ پر بیٹھ گئیں۔ چند منٹ کے بعد ہی یونیورسٹی کے برآمدے پر کامران نظر آیا۔ رومانہ کی سہیلی رشیدہ نے کہا۔ "اری وہ دیکھ وہ اِدھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ ذرا اس کی بے چینی تو دیکھ۔"

رومانہ نے کہا۔ "مجھے دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ خود ہی کچے دھاگے سے بندھا چلا آئے گا۔"

واقعی وہ ان کی طرف آ رہا تھا۔ مگر کچھ جھجک رہا تھا۔ آس پاس یوں دیکھ رہا تھا جیسے سب کی نظریں بچا کر چوری کرنے آ رہا ہو۔ رومانہ نے آہستگی سے کہا۔ "دیکھ رشیدہ! ہنسی اور مسکراہٹ کو ضبط کرنا۔ ورنہ کھیل بگڑ جائے گا۔ ہمیں اسے نظر انداز کر کے سنجیدگی سے گفتگو کرنا چاہئے۔"

کامران ایک لمبا چکر کاٹ کر ان کے پیچھے درخت کے پاس آ گیا اور گلابی سوٹ والی کو دیکھنے لگا۔ گلے میں سیاہ چمکتے ہوئے موتیوں کی مالا ہو گی لیکن سامنے آ کر دیکھنے سے وہ مالا نظر آ سکتی تھی۔

رومانہ نے کہا۔ "رشیدہ! اگر تم سے کہا جائے کہ کسی کو پیچھے سے دیکھ کر پہچانو تو کیا

تم اسے شناخت کر سکتی ہو؟"

"پیچھے سے چہرہ نظر نہیں آتا۔ بھلا شناخت کیسے ہو سکتی ہے؟"

"سنا ہے کہ دل کی آنکھوں سے دیکھو تو پیچھے سے ہی نہیں' تاریکی میں بھی اپنوں کو پہچان لیا جاتا ہے۔"

☆======☆======☆

کامران جھجکتے ہوئے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے رومانہ کے سامنے اس انداز میں آیا جیسے کینٹین کی طرف جا رہا ہو پھر اس نے جان بوجھ کر اپنی ایک کتاب اور کاپیاں گرا دیں۔ رومانہ کو قریب سے ایک نظر دیکھنے کی یہی تدبیر سوجھی تھی۔ اکڑوں بیٹھ کر اس نے کتاب اور کاپیاں اٹھاتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ انجان بن کر سیاہ چمکتے ہوئے موتیوں کی مالا سے کھیل رہی تھی۔ ظاہر کر رہی تھی کہ کسی سوچ میں گم ہے۔

کامران اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا مگر جب اس نے دیکھا تو دل نے کہا' اسے دیکھتا ہی رہے لیکن اس معاملے میں وہ بزدل تھا۔ کاپیاں اٹھا کر تیزی سے چلتا ہوا ان سے دور ہوتا چلا گیا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ اس سے جتنی دور ہوتا جا رہا ہے' دل اتنا ہی اس کی طرف کھنچا جا رہا ہے۔

دور ہونے کے دوران اس نے رومانہ اور رشیدہ کے قہقہے سنے۔ اس نے یہی سمجھا کہ لڑکیاں کسی لطیفے پر بے تحاشا ہنس رہی ہیں۔ وہ دوپہر کو گھر آیا تو آتے ہی ماں سے لپٹ گیا۔ اسماء نے پوچھا۔ "کیا بات ہے' آج بہت خوش ہو؟"

"خوشی ایسی ہے کہ بتائی نہیں جا سکتی پھر وہ بتانے والی نہیں گھر میں لانے والی خوشی ہے۔ اب تو آپ سمجھ گئیں ناں؟"

اسماء نے کچھ سوچا پھر مسکرا کر کہا۔ "گھر میں لانے والی خوشی کا اشارہ دے رہے ہو۔ اس لئے بات کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔"

"تو بس آپ سمجھتی رہیں اور فوراً میرے لئے کھانا لے آئیں۔ آج تو بھوک کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔"

وہ ماں سے الگ ہو کر گنگناتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اسماء کچھ حیران تھی اور حیران ہونے سے زیادہ خوش تھی۔ اگرچہ بیٹے نے وضاحت نہیں کی تھی مگر اس نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ جوان بیٹے کی خوشی کا انداز ایک بہو کی آمد کی پیش گوئی کر رہا ہے۔

کامران ایک میز پر کتاب اور کاپیاں رکھ کر بستر پر چاروں شانے چت لیٹ گیا۔

چھت کو مسکراتے ہوئے تکنے لگا۔ وہاں رومانہ کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ ماں بیٹے کی پسند ایک ہے لیکن یہ کیسے معلوم کیا جائے کہ وہ حسین لڑکی بھی اسے پسند کرے گی یا نہیں؟ اس کے گھر دلہن بن کر آئے گی یا نہیں؟

وہ کوئی تدبیر سوچ رہا تھا کہ حسینہ کے دل کی بات معلوم کی جائے لیکن اس نے کبھی کسی سے عشق کرنے کے متعلق پہلے کبھی سوچا نہیں تھا۔ اس معاملے میں اناڑی تھا۔ اس لئے کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

دوسرے دن رومانہ اپنی کار میں بیٹھی دور سے کامران کے مکان کو دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ کامران کتابیں اور کاپیاں لے کر نکل رہا تھا۔ اسماء نے مسکرا کر اسے رخصت کیا پھر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ کامران بس سٹینڈ کی طرف جا رہا تھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو رومانہ نے کار سے باہر آ کر اسے لاک کیا پھر کامران کے دروازے پر آ کر دستک دی۔ دروازہ کھل گیا۔ اسماء نے اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا۔ "ارے بیٹی! تم ہو؟ آؤ اندر آ جاؤ۔"

وہ مکان میں داخل ہوتی ہوئی بولی۔ "ادھر سے گزر رہی تھی مجھے زور کی پیاس لگی تو سوچا آپ کے ہاں پانی مل جائے گا۔"

"بیٹی! تم پانی مانگ رہی ہو' میں تمہیں ٹھنڈا میٹھا شربت پلاؤں گی۔"

"ماں جی! میرا اندازہ ہے کہ آج آپ کچھ زیادہ ہی خوش ہیں۔"

وہ دوسرے کمرے میں شربت تیار کرتی ہوئی بولی۔ "تمہارا اندازہ درست ہے۔ اللہ نے چاہا تو بہت جلد میرے گھر میں بہو آئے گی۔"

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ بہو آپ نے پسند کی ہے یا آپ کے صاحب زادے نے.........؟"

"اے بیٹی! کیا بتاؤں' میرا بیٹا بڑا شرمیلا ہے ابھی اس نے کھل کر کسی لڑکی کے بارے میں نہیں بتایا۔ بس اشارے میں سمجھا دیا ہے کہ اسے کوئی پسند آ گئی ہے۔"

وہ ایک ٹرے میں شربت لے کر آئی۔ رومانہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے شربت سے بھرا ہوا گلاس اٹھایا پھر کہا۔ "ابھی آپ کی خوشی ادھوری ہے اس لئے شربت پی رہی ہوں۔ خوشی پوری ہو جائے گی تو مٹھائی کھانے آؤں گی۔"

اسماء نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "خدا تمہیں خوش رکھے۔ مٹھائی ضرور کھلاؤں گی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ بیٹے کی پسند بالکل ایسی ہی ہو جیسی تم ہو۔"

شربت پیتے پیتے اچانک پھندا لگا۔ وہ کھانسنے لگی۔ دل کی بات اچانک کہہ دی جا۔۔۔ تو کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

کامران یونیورسٹی کی بس میں جایا کرتا تھا۔ اس لئے رومانہ اس سے پہلے یونیورسٹی پہنچ گئی۔ وہاں دو مختلف کلاسیں جاری رہنے کے دوران ان دونوں نے دور ہی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ کامران تیسری کلاس اٹینڈ کرنے کے بعد لائبریری کی طرف جا رہا تھا۔ ایسے وقت اس نے رومانہ کو دیکھا۔ وہ پارکنگ ایریا میں اپنی کار کی اسٹیئرنگ سیٹ کا دروازہ کھولے بیٹھی تھی۔ کامران ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہو گیا' سوچنے لگا' کیا یہ آج وقت سے پہلے جا رہی ہے؟

لیکن وہ نہیں جا رہی تھی۔ کامران نے اُسی چپڑاسی کو دیکھا جس نے کل .... اسے لائبریری میں آ کر اطلاع دی تھی کہ اس کی ممی فون پر بلا رہی ہیں۔ وہی چپڑاسی رومانہ کی کار کے قریب جا کر اسے سلام کر رہا تھا۔ رومانہ نے اپنا پرس کھول کر اس میں سے دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر دیئے' اسے کوئی بات سمجھاتی رہی پھر وہ چپڑاسی اسے سلام کر کے واپس جانے لگا۔

کامران سوچ میں پڑ گیا۔ آہستہ آہستہ لائبریری کی طرف جانے لگا۔ لائبریری کے ساتھ لگے ہوئے فون بوتھ کے قریب رُک کر اسے یوں دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو کہ معاملہ کیا ہے؟ جس چپڑاس نے آ کر اسے اطلاع دی تھی' اسے رومانہ روپے کیوں دے رہی تھی؟

اس نے بوتھ میں آ کر اپنے ایک پڑوسی سے رابطہ کیا پھر اس سے کہا۔ "میں کامران بول رہا ہوں' آپ کو زحمت ہو گی۔ پلیز میری امی کو فون پر بلا دیں۔"

"بیٹے! زحمت کیسی' میں ابھی بلاتا ہوں۔"

اس نے تھوڑی دیر انتظار کیا پھر ماں کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کامران بیٹے! کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟"

"جی ہاں۔ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے کل مجھے یہاں فون کیا تھا؟"

"نہیں بیٹے! اگر فون کرتی تو کل تمہارے گھر آنے پر ضرور ذکر کرتی۔ ویسے یہ فون کا معاملہ کیا ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے ممی! یہ یونیورسٹی ہے۔ یہاں لڑکے یونہی شرارتیں کیا

کرتے ہیں۔ میں نے آپ کو خواہ مخواہ پڑوس میں آنے کی زحمت دی۔ اچھا خدا حافظ۔"

وہ بوتھ سے باہر آ گیا پھر لائبریری کے اندر آ کر اپنی پسند کی کتاب ایک ریک میں تلاش کرنے لگا۔ آج پڑھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کس نے ممی بن کر اسے کل دھوکا دیا تھا؟

کتاب تلاش کرنے کے دوران پھر وہی چپڑاسی آ گیا۔ اس نے سلام کر کے کہا۔

"کامران صاحب! آپ کی والدہ کا فون ہے۔"

وہ چپڑاسی کا شکریہ ادا کر کے فون بوتھ میں آیا۔ ریسیور الگ رکھا ہوا تھا۔ اس نے اسے کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو ممی! آج آپ نے پھر فون کیا ہے؟"

دوسری طرف سے رومانہ نے اسماء کی آواز میں کہا۔ "ہاں! کل تمہاری خوشی سے یہ معلوم ہو گیا کہ میں نے جس لڑکی کو پسند کیا ہے' اسے تم نے بھی پسند کیا ہے لیکن تم نے لڑکی کا نام نہیں بتایا؟"

"نام کیا چیز ہے ممی! آج میں اس کے باپ دادا کی پوری ہسٹری معلوم کر کے بتا دوں گا۔"

"کیا وہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے؟"

"یہ ابھی معلوم نہیں ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلے پسند کا اظہار اس کی طرف سے ہو۔"

"بیٹے! تم بہت نادان ہو۔ بھلا کوئی لڑکی اپنی زبان سے ایسا کہہ سکتی ہے۔ شرمیلی اور شریف زادیاں دل کی بات اپنے دل میں ہی رکھتی ہیں۔"

"ہاں۔ مگر یہ موجودہ دور کی یونیورسٹی ہے۔ یہاں کے ماحول میں لڑکیاں شرماتے ہوئے بھی دل کی باتیں کہنے کا راستہ نکال لیتی ہیں۔ اگر وہ ایک کاغذ پر اتنا ہی لکھ دے کہ کامران علی' میں تمہاری ہوں۔ صرف تمہاری اور اس کے ساتھ ہی اپنا نام بھی لکھ دے اور وہ کاغذ اپنی کسی سہیلی کے ذریعے کسی طرح مجھ تک پہنچا دے تو پھر تمام پردے اُٹھ جائیں گے۔ میں اس کا ہاتھ تھام کر اسے آپ کے پاس لے آؤں گا۔"

"اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو؟"

"تو ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ آپ کو ایک بہو کی ضرورت ہے اور میری نظروں میں ایک حسین لڑکی ہے۔ اگر یہ لڑکی تحریری طور پر ایسا نہیں کرے گی' جیسا میں چاہتا ہوں تو میں وہ دوسری لڑکی آپ کو دکھاؤں گا آپ اسے ضرور پسند کریں گی۔ اچھا

خدا حافظ کلاس کا وقت ہو رہا ہے۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ رومانہ اپنے ساتھ موبائل فون لائی تھی اور اپنی کار میں بیٹھ کر اس فون کے ذریعے گفتگو کر رہی تھی۔ اس نے بھی فون بند کر دیا اور سوچ میں پڑ گئی۔ کامران نے پتہ نہیں کس لڑکی کو پسند کے دوسرے نمبر پر رکھا ہے اگر میں نے محبت کا تحریری اعتراف نہ کیا تو پہلے نمبر پر نہیں رہوں گی۔ وہ دوسرے نمبر والی میری جگہ پہلے نمبر پر آ جائے گی۔

وہ اس مسئلے پر تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر اس نے ایک کاغذ پر اپنی محبت کا اظہار کیا۔ ویسے وہ نہیں چاہتی تھی کہ تحریری اعتراف ہو۔ اس لئے پہلے اپنی سہیلی رشیدہ کے پاس آئی اور بولی۔ "پلیز میرا ایک کام کرو۔ کامران کے پاس جا کر میرے دل کی بات کہہ دو۔ میں اسے چاہتی ہوں۔ جب سے اسے دیکھا ہے' یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ تمام عمر اسی کے نام سے پہچانی جاؤں گی۔"

رشیدہ نے کہا۔ "محبت تم کرتی ہو اور اظہار میں کروں؟ کیا تمہیں خود کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

"جب تمہیں کسی سے محبت ہو گی تب سمجھو گی کہ محبوب کے روبرو دل کی بات کہی نہیں جاتی۔"

"کہی نہیں جاتی۔ لکھی تو جا سکتی ہے۔ تم یہی باتیں لکھ کر دے دو۔ میں کبوتری بن کر پیار کی چٹھی پہنچا دوں گی۔"

رومانہ نے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ اسے دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے پہلے لکھ رکھا ہے لیکن تم زبانی ہی کہہ سکو تو بہتر ہے ورنہ یہ خط دے دینا۔"

رشیدہ نے وہ خط لیا پھر کامران کے پاس آ کر پوچھا۔ "میں تم سے کچھ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم میری سہیلی رومانہ کو چاہتے ہو؟"

"میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے' تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔"

"تو پھر سمجھ لو۔ دونوں ہاتھ تالیاں بجا رہے ہیں۔ وہ بھی تمہیں دل و جان سے چاہتی ہے۔"

"میں کیسے یقین کر لوں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لڑکے اور لڑکیوں کا سکینڈل عام ہوتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے تم بھی ہمارا سکینڈل بنا رہی ہو۔"

"تم مجھے الزام دے رہے ہو؟"

"تو پھر الزام سے بچو اور اپنی سہیلی کے بارے میں جو کہہ رہی ہو اس کا ثبوت دو۔"

"اچھا ہوا کہ میں اس کا خط لے آئی۔ ورنہ تم مجھے سکینڈل بنانے والی لڑکی سمجھتے۔ لو' یہ ہے اس دیوانی کا خط دیوانے کے نام۔"

وہ خط دے کر چل گئی۔ کامران نے اسے کھول کر پڑھا پھر مسکرایا۔ اسے محبت کے جواب میں محبت بھرا خط لکھنا چاہئے تھا یا اس سے ملاقات کرنا چاہئے تھی لیکن وہ رومانہ کی نظروں میں آئے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

وہ محبت کا اظہار کر چکی تھی۔ اس لئے جواب کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ جب پتہ چلا کہ کامران جا چکا ہے تو اسے مایوسی ہوئی۔ اس نے سوچا دوسرے دن پھر ٹیلی فون کو محبت کا ذریعہ بنائے گی لیکن دوسرے دن یونیورسٹی کے احاطے میں داخل ہوتے ہی اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اس نے جو خط کامران کو لکھا تھا اس کی بے شمار فوٹو سٹیٹ کاپیاں نظر آئیں۔ ان میں بہت سی دیواروں پر چپکی ہوئی تھیں اور کئی کاپیاں مختلف سٹوڈنٹس کے ہاتھوں میں نظر آ رہی تھیں۔ ہر طرف اس کے محبت نامے کے چرچے تھے۔ رشیدہ نے ایک محبت نامہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا۔ اس نے نام دینے سے پہلے تمہیں بدنام کر دیا ہے۔"

رومانہ گم صم سی تھی۔ اس کی محبت ایک مذاق بن گئی تھی۔ اب وہ اس ماحول میں زیادہ دیر ٹھہر کر اپنا مذاق اُڑتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لئے کار کو تیزی سے ڈرائیو کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

کامران دیکھ رہا تھا کہ محبت کیسے مذاق بن رہی ہے؟ ایک چاہنے والی نے دل کی بات کاغذ پر لکھ دی تھی اور وہ تحریر جیسے ایک جرم بن گئی تھی۔ نکاح نامہ بھی ایک کاغذ ہے۔ اس پر لڑکی اپنی رضامندی لکھے تو ساری دنیا کے لئے قابلِ قبول ہے۔ محبت نامہ بھی ایک کاغذ ہے اس پر رضامندی لکھی جائے تو وہ مذاق ہے یا پھر جرم ہے۔ کیا عجب تماشا ہے۔ ایک مضبوط اور ناقابل انکار نکاح نامہ تین بار طلاق دینے سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتا ہے لیکن محبت نامہ دل کے خون سے لکھا جاتا ہے۔ اسے دل والے کبھی مٹنے نہیں دیتے۔ پائیداری کس میں ہے؟ نکاح نامے میں یا محبت نامے میں؟

کامران نے دوپہر کو گھر پہنچ کر دروازے پر دستک دی۔ ماں نے دروازہ کھولا۔ اسے گھور کر دیکھا پھر منہ پھیر کر چلی گئی۔ اس نے اندر آ کر دروازے کو بند کیا پھر آواز دی۔ "ممی! آپ کہاں ہیں؟ آپ دروازہ کھولتے ہی مجھے دیکھ کر مسکراتی ہیں۔ آج آپ کے

تیور بدلے ہوئے ہیں۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ صرف یونیورسٹی..........."

وہ بولتے بولتے دوسرے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس دوسرے کمرے میں رومانہ بستر کے سرے پر بیٹھی ہوئی تھی اور اسماء اس کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ ان کے سامنے فرش پر محبت نامے کی فوٹو سٹیٹ کاپی نظر آ رہی تھی۔

اس نے رومانہ کو دیکھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور آنکھوں سے پتا چلتا تھا کہ روتے روتے ابھی چپ ہوئی ہے۔ اسماء نے کہا۔ "یہ وہی لڑکی ہے جو بازار سے میرا آدھا بوجھ اٹھا کر گھر تک لائی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ یہ تمہیں کب سے چاہتی ہے اور اس نے کس طرح فون پر آواز بدل کر شرارت کے ذریعے تمہیں اپنی طرف مائل کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ ابھی اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ کیا تمہیں احساس ہے کہ تم نے ایک محبت کرنے والی لڑکی کو کس طرح بدنام کرنے کی نفرت انگیز حرکت کی ہے؟ تمہیں اس سے کیا دشمنی تھی؟ اور ایسی دشمنی کر کے تم نے کیا حاصل کیا ہے؟"

کامران نے کہا۔ "اگر میں محبت نامے کے جواب میں نفرت نامہ لکھ کر اس کی فوٹو سٹیٹ کاپیاں تقسیم کرتا تو یہ دشمنی ہوتی۔ میں نے تو اپنی اور رومانہ کی محبت کا اعلان کیا ہے۔ کیا محبت جرم ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر جگہ جگہ اس کا اعلان کرنا جرم کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا آپ قائل کر سکتی ہیں کہ میں نے رومانہ سے دشمنی کی ہے؟"

"ہاں۔ ہمارے معاشرے میں سماجی قوانین کے مطابق شریف زادیاں نکاح سے پہلے محبت کرتی ہیں اور اس محبت کا چرچا ہوتا ہے تو صرف لڑکیاں ہی نہیں ان کا پورا خاندان بدنام ہو جاتا ہے۔"

"اگر نکاح سے پہلے محبت کی جائے تو بدنامی ہوتی ہے اور نکاح کے بعد کسی ثبوت کے بغیر بدنام کر کے طلاق دی جائے تو کیا ہوتا ہے؟"

اسماء نے چونک کر صدمے سے بیٹے کو دیکھا۔ وہ بولا۔ "کیا ایک مطلقہ عورت اور اس کا بیٹا اسی طرح بدنام نہیں ہیں' جس طرح آج رومانہ بدنام ہو رہی ہے۔ اسے یا تو ہماری طرح آج سے گمنام زندگی گزارنا ہو گا یا پوری یونیورسٹی میں گردن اٹھا کر فخر سے کہنا ہو گا' ہاں محبت کی ہے اور محبت جرم نہیں ہے۔"

"تم اپنے طور پر درست کہہ رہے ہو لیکن جو ظلم تمہارے باپ نے مجھ پر کیا۔ وہ ظلم تم نے رومانہ پر کیوں کیا ہے؟"

"میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ رومانہ کے پیار میں کتنی پختگی ہے۔ جب اس کے والدین کو

اور اس کے تمام رشتے داروں کو معلوم ہو گا کہ یہ ایک مطلقہ عورت کے بیٹے سے محبت کرتی ہے تو ان کا رد عمل کیا ہو گا؟ اس کے خاندان والے اس کی محبت کو اور ہم ماں بیٹے کے وجود کو برداشت کریں گے؟"

رومانہ نے سر اٹھا کر کہا۔ "میں کسی کی پروا نہیں کرتی۔ میں نے تمہیں اور ممی کو دل سے اپنایا ہے اور اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ تم نے مجھے بدنام نہیں کیا ہے بلکہ ہم تینوں کے درمیان جو اپنائیت ہے' اس کا اعلان کیا ہے۔"

اسماء نے رومانہ کے پاس بیٹھ کر اس کا سر اپنے سینے پر رکھ کر کہا۔ "ہم بہت بڑے امتحان سے گزرنے والے ہیں۔ طلاق دینے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ مگر ہمارے سماج میں صرف یہی کہا جاتا ہے کہ عورت بد چلن تھی۔ اس لئے شوہر نے اسے چھوڑ دیا۔ مجھ پر بھی یہ داغ لگایا گیا ہے۔ کامران بھی قابل نفرت سمجھا جاتا ہے کیونکہ داغ دار ماں کا بیٹا ہے اور بیٹی تم بھی یہی سمجھی جاؤ گی کیونکہ میری بہو بننے کے لئے دنیا والوں سے لڑائی شروع کر رہی ہو۔"

"وہ تو شروع ہو چکی ہے۔ میں ایک بہت بڑے سٹیج فنکار کی بیٹی ہوں۔ آج کل ڈیڈی مختلف ممالک کے شہروں میں ثقافتی اور تفریحی پروگرام پیش کر رہے ہیں۔ وہ بہت فراخ دل ہیں۔ جب واپس آئیں گے تو میری محبت کے فیصلے کو دل سے قبول کریں گے۔"

☆======☆======☆

قوانین' وقت اور حالات کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ایک حکومت میں قانون کسی کو مجرم قرار دیتا ہے تو اس حکومت کے بدلتے ہی دوسری حکومت اس مجرم کو ایک معزز شہری ثابت کرنے کے لئے قانون کا چہرہ بدلتی ہے پھر اس مجرم کو باعزت بری کر دیا جاتا ہے۔

بیدار بخت گرفتار ہونے کے دو برس بعد ہی رہا ہو گیا تھا۔ کیونکہ حکومت بدل گئی تھی۔ جو سیاستدان نئی حکومت میں بااختیار بن گئے تھے' ان میں سے کچھ بیدار بخت کے احسان مند تھے۔ اس نے کسی سیاسی امیدوار کو لاکھوں روپے اور کسی کو کروڑوں روپے اسمبلی تک پہنچنے کے لئے دیئے تھے۔ انہوں نے اقتدار سنبھالتے ہی بیدار بخت کے کیس کا رُخ بدل دیا۔ وہ جو سزائے موت پانے والا تھا' ایک نئی زندگی پا کر جیل سے باہر آزاد دنیا کی کھلی فضاؤں میں آ گیا۔

رہائی کے بعد اس کی سب سے پہلی خواہش یہی تھی کہ فرمان علی کو موت گھاٹ اُتارے لیکن ایسا کرنا اتنا آسان نہیں رہا تھا جتنا کہ وہ سمجھ رہا تھا۔ پتا چلا کہ وہ انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے ایک خفیہ شعبے کا چیف افسر ہے۔ اس شعبے کے ڈائریکٹر جنرل اور دوسرے اعلیٰ افسران نے برسراقتدار سیاسی پارٹی کے لیڈر سے یہ کہہ دیا تھا کہ فرمان علی کا سروس ریکارڈ بے داغ ہے اور اعلیٰ کارکردگی سے بھرپور ہے۔ بیدار بخت کو سمجھا دیا جائے کہ وہ کوئی انتقامی کارروائی کرے گا تو پورا ڈیپارٹمنٹ حکومت کے خلاف سراپا احتجاج بن جائے گا۔

کوئی بھی حکومت ہو' وہ عوام سے دھاندلی کر سکتی ہے لیکن فوج' انٹیلی جنس اور پولیس ڈیپارٹمنٹ کے اعلیٰ افسران کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے پہلے سہم سہم کر اتنا سوچتی ہے کہ سوچتے سوچتے اس کی مدتِ حکومت ختم ہو جاتی ہے۔

بیدار بخت اپنے سیاست دانوں کی حکومت میں فرمان علی کے خلاف کچھ نہ کر سکا۔ جب دوسری حکومت آئی تو وہ ملک سے فرار ہو گیا۔ کیونکہ پھر قانون کی صورت بدل سکتی تھی اور وہ پھر مجرم قرار دیا جا سکتا تھا۔

انتقام پورا نہ ہو تو اندر ہی اندر آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ اس کے اندر بھی پندرہ برس سے آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ پھر پاکستان آ گیا تھا۔ پتا چلا کہ فرمان علی ٹرانسفر ہو کر لاہور چلا گیا ہے۔ بیدار بخت بھی لاہور آ گیا۔ اس نے داڑھی مونچھیں بڑھالی تھیں۔ بالوں میں سفیدی کے باعث کوئی معتبر بزرگ لگتا تھا۔ بہت غور سے اسے دیکھا جائے تو وہ پہچانا جاتا تھا۔ ورنہ لباس کے اندر ریوالور اور ہاتھ میں تسبیح لے کر اللہ اللہ کرتا رہتا تھا۔

پندرہ برس کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ فرمان علی اپنی بیوی اسماء اور بیٹے کامران کو تلاش کرتے کرتے مایوس ہو گیا تھا۔ یہ وقت نے بتایا کہ مایوسی کفر ہوتی ہے۔ اپنے ایمانی جذبوں اور محبت کے رشتوں پر یقین رکھا جائے تو کفر ایمان والوں سے دور رہتا ہے۔ اس نے ایک دن اسماء کو انارکلی چوک میں دیکھ لیا۔ اپنی گاڑی روک کر ماتحتوں سے انتظار کرنے کے لئے کہا پھر تیزی سے چلتے ہوئے اس کے سامنے پہنچ گیا۔

وہ ایک دم سے چونک کر پیچھے ہٹ گئی۔ حیرانی سے اور گم شدہ محبت کے تقاضوں سے اسے دیکھنے لگی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ پندرہ برس کے بعد اپنے ظالم محبوب کو دیکھ رہی ہے۔ فرمان نے بڑی محبت سے کہا۔ "اسماء!"

اسے یکبارگی احساس ہوا کہ ایک نامحرم اس کا نام لے رہا ہے۔ وہ دوسری طرف منہ

پھیر کر بولی۔ "آپ کو میرا نام لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہمارا کوئی رشتہ نہیں رہا۔ پلیز چلے جائیے۔"

وہ بولا۔ "ہمارا رشتہ اتنا مضبوط ہے کہ کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ مجھے صفائی کا موقع دو۔ میں نے تمہاری اور کامران کی سلامتی کے لئے..........."

وہ سخت لہجے میں بولی۔ "اب کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں رہی ہے۔ آپ ایک غیر عورت کو راہ چلتے نہ روکیں۔ ورنہ میں اونچی آواز میں بولوں گی تو یہاں مجمع لگ جائے گا۔ کیا آپ کا دل نہیں بھرا۔ یہاں مجھے تماشا بنانا چاہتے ہیں؟"

وہ تیزی سے چلتی ہوئی ایک دکان میں چلی گئی۔ فرمان کو احساس ہوا کہ وہ غلطی کر رہا ہے یوں سرعام اسماء کو اپنی محبت اور خلوص کا یقین نہیں دلا سکے گا۔ وہ پلٹ کر اپنی گاڑی کے پاس آیا پھر اپنے ایک خاص ماتحت سے بولا۔ "کیا تم نے اس خاتون کو دیکھا ہے' جس سے میں باتیں کر رہا تھا؟"

"یس سر! وہ خاتون سامنے والی دکان میں گئی ہیں۔"

"تم بڑی رازداری سے ان کا تعاقب کرو۔ یہ معلوم کرو کہ وہ کہاں رہتی ہیں۔ مجھے ان کا مکمل پتا چاہئے۔"

"یس سر!" ماتحت اسے سیلوٹ کر کے چلا گیا۔ فرمان علی گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ اسماء کو چھوڑ کر جائے لیکن وہ اسے دوبارہ دیکھ لیتی تو اس سے چھپنے کی کوششیں کرتی پھر چھپنے والی کو تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔ لہٰذا فی الوقت فرمان علی کا ہی اس سے چھپنا مناسب تھا۔

شام ہو گئی۔ بیدار بخت کے ایک کارندے نے رپورٹ دی کہ فرمان علی سادہ لباس میں ہے اور لوہاری گیٹ کی ایک گلی سے گزر رہا ہے۔ بیدار بخت نے کہا۔ "اس کا تعاقب کرو اور معلوم کرو کہ وہ وہاں کیا کرتا پھر رہا ہے۔ مجھے اس موبائل پر اطلاع دیتے رہو۔"

وہ فرمان علی کو اس طرح ہلاک نہیں کر سکتا تھا کہ اس پر قتل کا شبہ ہوتا۔ وہ اس تاک میں تھا کہ کسی طرح اسے حادثاتی موت سے دوچار کرے۔

اسماء باہر سے تھک کر آئی تھی۔ مغرب کی اذان سنتے ہی اس نے سوئچ کے بٹن دبا کر کمروں میں روشنی کی پھر دروازہ بند کرنے کے لئے سامنے والے کمرے میں آئی تو اس کمرے کے دروازے پر فرمان کو دکھ کر ٹھٹک گئی۔

وہ بولا۔ "میری محبت اور نیک نیتی کو سمجھو۔ دیکھو میں تمہیں تلاش کرتا ہوا یہاں

تک آ پہنچا ہوں۔"

"آپ کے یہاں آنے سے محبت نہیں دشمنی ظاہر ہو رہی ہے۔ آپ مجھے بدنام کرنے آئے ہیں۔ محلے والوں نے آپ کو ایک مطلقہ عورت کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا ہو گا۔"

"تم مطلقہ نہیں ہو۔ میں نے تمہیں طلاق نہیں دی ہے۔ تم آج بھی میری شریک حیات ہو۔"

"خدا کے لئے باتیں نہ بنائیں۔ میرے منہ پر مجھے طلاق دے کر مجھ سے یہ جھوٹ نہ کہیں کہ آپ نے مجھے طلاق جیسی گالی نہیں دی ہے۔"

"میں ابھی ثابت کر دوں گا کہ تم نے جو کچھ سنا اور دیکھا' وہ محض ایک فریب تھا۔ تمہاری اور کامران کی زندگی خطرے میں تھی۔ میں نے تم دونوں کی حفاظت کے لئے ایک چال چلی تھی۔"

"مذہب کے معاملات میں نہ کوئی چال چلی جا سکتی ہے اور نہ کسی چالاکی سے ہیرا پھیری کی جا سکتی ہے۔"

"میں نے دینی معاملات میں کوئی چالاکی نہیں دکھائی ہے۔ میری چالاکی یا مجبوری یہ تھی کہ میں تمہیں اپنے سراغ رساں ہونے کی حقیقت نہیں بتا سکتا تھا۔ سرکاری فرائض کی ادائیگی لازمی تھی۔ ہم اپنے فرائض بیوی بچوں سے بھی چھپاتے ہیں۔ آج مجبور ہو کر ظاہر کر رہا ہوں کہ میں انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کا چیف افسر ہوں۔ یہ بات میں پہلے بتا دیتا اور یہ کہہ دیتا کہ دشمن کو دھوکا دینے کے لئے تمہیں مطلقہ ظاہر کر رہا ہوں تو تم خود کو اور کامران کو مجھ سے دور نہ کرتیں۔ اگر دور بھی رہتیں تو مجھ سے چھپ کر ملنا چاہتیں اور یہ بات دشمن تک پہنچ جاتی۔"

"آپ جتنی بھی لمبی کہانی سنائیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ آپ مجھے طلاق دے چکے ہیں۔"

فرمان نے پوچھا۔ "کیا منہ بند ہو تو طلاق کا لفظ ادا ہو سکتا ہے؟ جس وقت تم نے تین بار طلاق کے الفاظ سنے' اس وقت میرا چہرہ کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف تھا۔ تم نے اپنی آنکھوں سے میرے ہونٹوں کو ملتے ہوئے اور زبان کو بولتے ہوئے نہیں سنا تھا۔"

"آپ کیسی بچگانہ باتیں کر رہے ہیں؟ اگر آپ کا منہ بند تھا تو پھر طلاق کے الفاظ کیسے گونج رہے تھے؟"

"ایسے۔ یہ دیکھو' میں تمہارے سامنے اپنے ہونٹوں کو سختی سے بند کر رہا ہوں۔ اس کے بعد تم مجھے بولتے ہوئے سنو گی۔"

اس نے اپنے ہونٹوں کو سختی سے بند کر لیا پھر اسماء نے حیرانی سے اس کے بند منہ کو دیکھا اور سنا بھی' وہ کہہ رہا تھا۔ "آج میں ہوش و حواس میں رہ کر تمہیں طلاق دے رہا ہوں' میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں' میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔"

فرمان علی کی آواز آ رہی تھی مگر اس کے ہونٹ سختی سے بند تھے۔ یہ ناممکن سی بات تھی کہ منہ بند ہو اور آدمی بولتا رہے۔

لیکن ایسا ہو رہا تھا۔ اب بھی فرمان کا منہ سختی سے بند تھا اور آواز آ رہی تھی۔ فرمان علی کی آواز کہہ رہی تھی۔ "اسماء! اکثر آنکھوں سے دیکھی ہوئی اور کانوں سے سنی ہوئی باتیں غلط ہوتی ہیں' جھوٹ ہوتی ہیں۔ اب میں آپ کو اسماء نہیں' بھابی کہوں گا کیونکہ میں فرمان نہیں فرمان کا دوست ہوں۔ میرا نام امجد تارا ہے اور میں فرمان کے پیچھے دروازے کی آڑ میں کھڑا ہوں۔"

دروازے کی آڑ سے امجد تارا سامنے آیا۔ اس طرح فرمان کی آواز میں بولا۔ بھابی! میں مختلف آوازوں کی نقالی کرتا ہوں۔ پندرہ برس پہلے جب آپ طلاق کے الفاظ سن رہی تھیں تو میرا یہ دوست کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس ہونٹوں کو سختی سے بند کئے کھڑا تھا اور میں کھڑکی کی آڑ سے آپ کے شوہر کی آواز میں طلاق دے رہا تھا۔ کیا ایک نقال کسی کے شوہر کی آواز میں طلاق دے تو کیا طلاق ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ آپ کسی بھی عالم دین سے رجوع کریں۔ میں آپ کے شوہر کی آواز میں نکاح قبول کروں تو وہ نکاح قبول ہو گا اور نہ میں شوہر کہلاؤں گا۔"

پھر فرمان کے ہونٹ متحرک ہوئے۔ اس نے پوچھا۔ "کیوں اسماء! تمہاری غلط فہمی دور ہو گئی۔"

وہ حیرت اور مسرت سے اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خوشی سے بھیگ رہی تھیں۔ وہ بولی۔ "میں تو کیا' دنیا والے بھی یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ میں حلالہ کے قانون پر عمل کئے بغیر آپ کو پا سکتی ہوں۔ میرے لئے تو یہ معجزے سے کم نہیں ہے کہ میں مطلقہ کہلاتے ہوئے بھی مطلقہ نہیں بلکہ سہاگن کی زندگی اب تک گزارتی آئی ہوں۔"

تارا نے کہا۔ "بھابی! آپ کو اچانک بہت بڑی خوشی حاصل ہوئی ہے۔ میں ابھی جا

رہا ہوں۔ کل صبح آؤں گا لیکن جانے سے پہلے کہہ دوں کہ آپ کی طرح آپ کے بیٹے نے بھی آواز کے سلسلے میں میری بیٹی سے دھوکا کھایا تھا۔ آپ سمجھ گئی ہوں گی۔ میں رومانہ کا باپ ہوں۔ بہتر ہے کل میں یہاں نہ آؤں۔ آپ دونوں تاریخ پکی کرنے میرے غریب خانے پر تشریف لائیں' اچھا' خدا حافظ۔"

وہ فرمان سے مصافحہ کر کے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی فرمان نے اسماء کے ہاتھ کو تھام لیا پھر کہا۔ "میں نے اس خطرناک دشمن کو گرفتار کرنے کے بعد تمہیں بہت تلاش کیا مگر تقدیر کو یہی منظور تھا کہ ہم برسوں کی جدائی کے بعد آج ملیں۔ میرا بیٹا کہاں ہے؟ وہ تو جوان ہو گیا ہو گا۔"

وہ فرمان کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ "ہاں! بالکل آپ کی طرح ہے۔ آج اس کی بھی غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ ایک ذرا سی غلط فہمی کے باعث وہ آپ کو ماں کا دشمن سمجھنے لگا ہے۔ میں مانتی ہوں آپ نے ہماری سلامتی کی خاطر ایسا کیا تھا مگر پندرہ برس تک یہ سلامت مہنگی پڑتی رہی۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی دروازہ کھلا اور کامران نظر آیا۔ اس نے ماں کو ایک شخص سے گلے لگتے دیکھا تو جیسے بجلی کا جھٹکا سا پہنچا۔ پہلے تو وہ چند ساعتوں تک سکتے میں رہا پھر چیخ پڑا۔ "نہیں' نہیں۔ میں اندھا ہوں۔ میں کچھ نہیں دیکھ رہا ہوں اور اگر دیکھ رہا ہوں تو یہ ایک بے شرم خواب ہے جو کسی بیٹے کو نہیں دیکھنا چاہئے۔"

اسماء نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ کچھ کہنے سے پہلے سوچنا سمجھنا چاہئے۔ یہ تمہارے پاپا ہیں۔"

"پاپا!" اس نے غور سے فرمان کو دیکھا۔ آٹھ برس کے بچے کو اپنے باپ کے جو دھندلے سے نقوش یاد تھے' وہ واضح ہونے لگے۔ اس نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر غصے سے دانت پیستے ہوئے پہلے باپ کو پھر ماں کو دیکھا اور کہا۔ "پاپا؟ آپ کس شخص کو میرا باپ کہہ رہی ہیں؟ جس نے آپ کو طلاق دی؟"

وہ بولی۔ "بیٹے! انہوں نے طلاق نہیں دی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ............"

وہ گرج کر بولا۔ "اصل بات یہ ہے کہ آپ چھپ چھپ کر ان سے ملتی رہیں' آج بیٹے نے دیکھ لیا تو طلاق سے انکار کر رہی ہیں۔"

فرمان نے کہا۔ "بیٹے! ہم برسوں کے بعد............"

وہ تنبیہہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر بولا۔ "خبردار مجھے بیٹا نہ کہنا۔ آپ کی زبان پر

لفظ بیٹا ایک گالی ہے اور یہی گالی آج ممی بھی مجھے دے رہی ہیں۔ ایسی بے شرمی دیکھنے کے بعد مجھے یہاں کھڑے ہی کھڑے زمین میں گر جانا چاہئے۔"

"تم بولتے ہی رہو گے یا ہماری بھی سنو گے۔"

وہ پیچھے ہٹ کر بولا۔ "مجھے کچھ نہیں سننا' آپ دونوں کی زبان کتنا بھی سچ کہہ لے' وہ اتنا سچ نہیں ہو گا جتنا کہ میری یہ آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔"

وہ اور پیچھے ہٹ کر بولا۔ "مجھے تو آپ لوگوں کے سامنے کھڑے ہونے پر بھی شرم آ رہی ہے۔ آپ کو نہ آئے مجھے آ رہی ہے۔"

وہ پیچھے ہٹتے ہوئے دروازے پر پہنچ کر بولا۔ "آج تک دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے کہ اولاد کی غلطیوں پر والدین پردہ ڈالتے ہیں۔ آج ایک بیٹا اپنے والدین کی بے شرمی کو چھپانے کے لئے دروازہ بند کر رہا ہے۔"

اس نے ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ اندر والدین کی بے گناہی' گناہ کا الزام اٹھا رہی تھی۔ وہ دونوں سکتے کی حالت میں بند دروازے کو دیکھ رہے تھے۔

☆======☆======☆

وہ موبائل فون کے ذریعے کہہ رہا تھا۔ "میں سچ کہتا ہوں باس! میں نے مکان کی پچھلی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر ایک ایک بات سنی ہے۔ پندرہ برس پہلے فرمان علی نے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی تھی۔ آپ کو دھوکا دیا تھا لیکن اب وہ ایک نئے مسئلے سے دوچار ہیں۔ ان کا اپنا جوان بیٹا یہ ماننے کو تیار نہیں ہے کہ طلاق نہیں ہوئی تھی۔ وہ اب بھی اپنے والدین کو ایک دوسرے کے لئے نامحرم سمجھتا ہے اور انہیں بے شرم کہہ کر گھر سے نکل گیا ہے۔ میں اس جوان کا تعاقب کر رہا ہوں۔ آپ حکم دیں' مجھے کیا کرنا چاہئے۔"

"اس کے جوان بیٹے کے پیچھے لگے رہو۔ جب وہ والدین سے ناراض ہے تو گھر واپس نہیں جائے گا۔ کسی دوست کے ہاں رہے گا۔ یا کوئی نیا ٹھکانا بنائے گا۔ اس جوان کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دو۔"

بیدار بخت نے موبائل فون بند کر دیا۔ موجودہ حلئے کے مطابق اس کے سر پر جناح کیپ تھی۔ چہرے پر داڑھی اور ایک ہاتھ میں تسبیح تھی۔ وہ مسجد کے صحن میں بیٹھا ہوا تھا بالوں کی سفیدی بھی اسے بزرگ' دیندار اور نمازی ظاہر کر رہی تھی۔ وہ انگلیوں کے

درمیان سے تسبیح کے ایک ایک دانے کو گزارتے ہوئے سوچنے لگا۔ میں ناحق اتنے عرصے سے فرمان علی کو ہلاک کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اچھا ہوا کہ اسے ہلاک نہ کر سکا۔ اس نے بیوی کو طلاق دینے والی بات کہہ کر مجھے دھوکا دیا۔ اپنے بیوی بچے کو زندہ سلامت رکھنے کے لئے مجھے بے وقوف بناتا رہا۔ اب مزہ آئے گا۔

اس نے سامنے سے گزرنے والے ایک نمازی کے سلام کا جواب دیا پھر سوچنے لگا۔ دشمن کو جان سے مارنا حماقت ہے۔ اس کے گھر کو تباہ کرنا اور اس کی عزت کو خاک میں ملانا دانشمندی ہے۔ بیٹا اپنے ماں باپ کو ایک دوسرے کے لئے نامحرم سمجھتا ہے۔ ماں باپ کی ملاقات کو بے شرمی کہتا ہے۔ مجھے اس بے شرمی کو اُچھالنا چاہئے' وہ ذلت اور رسوائی کی زندگی گزاریں گے اور میں طرح طرح سے ان پر کیچڑ اچھالتا رہوں گا۔

وہ اس پہلو پر غور کرنے لگا کہ نئے سرے سے دشمن کے خلاف انتقامی کارروائی کا آغاز کس طرح کیا جا سکتا ہے۔

اللہ کے بندے مسجد میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرتے ہیں لیکن شیطان اللہ والا بن کر بھی مسجد کی چار دیواری کو اپنی شیطانیت کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس نے عشا کی نماز بھی محض دکھاوے کے لئے پڑھی۔ نماز کے بعد وہ صحن میں آیا تو پھر موبائل فون پر اشارہ موصول ہوا۔ اس نے فون کو آپریٹ کرتے ہوئے کہا۔ "ہیلو' میں بی بی بول رہا ہوں۔"

بی بی کوڈ ورڈ بھی تھا اور بیدار بخت کا مخفف بھی تھا۔ دوسری طرف سے اس کے خاص ماتحت نے کہا۔ "باس! وہ تو بشیر احمد کے مکان میں گیا ہے؟"

"کون بشیر احمد؟"

"ہمارا ایک سپلائر ہے۔ یونیورسٹی میں سٹوڈنٹ بن کر رہتا ہے اور لڑکے لڑکیوں کو ہیروئن کا عادی بناتا ہے۔ فرمان کا بیٹا اسے سٹوڈنٹ اور دوست سمجھ کر اس کے پاس گیا ہے۔"

"اس بشیر احمد سے خفیہ طور پر رابطہ کرو۔ اس سے کہو کہ فرمان کے بیٹے کو اپنے اعتماد میں لے۔ اس سے ہمدردی کرے اور اسے اپنے مکان میں پناہ دے۔"

"آل رائٹ باس! میں ابھی رابطہ کرتا ہوں۔"

"اور ایک بات ہے۔ بشیر احمد جس مکان میں کرایہ دار ہے اس مکان کے مالک کو ہر قیمت پر خرید لو تاکہ وہ کسی اہم معاملے میں ہماری مرضی کے مطابق پولیس کو بیان دے۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ ادھر اسماء اور فرمان علی اپنے بیٹے کی واپسی کا انتظار کرتے

رہے۔ اسماء نے کہا۔ "مجھے آپ کے ملنے سے دنیا جہان کی خوشیاں مل گئی ہیں لیکن اب بیٹے نے سکون غارت کر دیا ہے۔ وہ بڑا ضدی ہے۔ یہاں نہیں آئے گا۔ آپ کچھ کریں۔"

فرمان نے اسے تسلی دی۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں ابھی اپنے تمام ماتحتوں اور پولیس والوں کے ذریعے معلوم کروں گا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر میں خود اس کے پاس جا کر اس کی غلط فہمی دور کروں گا اور امجد تارا اور رومانہ کا بھی تعاون حاصل کروں گا۔"

فرمان علی تھوڑی دیر کے لئے اسماء کے مکان سے نکل کر اپنے دفتر میں آیا پھر کامران کو تلاش کرنے کے لئے اپنے ذرائع کے مطابق تمام انتظامات کئے۔ اس کے بعد اسماء کے پاس آ گیا۔ اپنے ساتھ ایک موبائل فون بھی لے آیا۔ تاکہ اسے کامران کے بارے میں رپورٹ ملتی رہے۔

تمام تلاش کرنے والے صبح تک یہی رپورٹ دیتے رہے کہ اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے۔ رات گزر گئی۔ صبح کی روشنی پھیل گئی۔ اسماء نے روتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کی طویل جدائی میں اس کی پرورش کی ہے۔ میں اس کی ذہنی حالت کو سمجھتی ہوں۔ پہلے وہ مجھے طلاق ملنے پر آپ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ کل رات ہم دونوں سے نفرت کر کے گیا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے' وہ ایسے ذہنی انتشار میں خود کو نقصان نہ پہنچا لے۔"

"حوصلہ رکھو اسماء! تمہارے بیان کے مطابق وہ ذہین بھی ہے۔ کوئی غلط قدم نہیں اُٹھائے گا۔ میں دفتر جا رہا ہوں۔ شام تک ضرور اسے تمہارے پاس لے آؤں گا۔"

وہ اسماء سے کامران کی موجودہ تصاویر لے کر گیا پھر دفتر میں آ کر اپنے ماتحت سے کہا۔ "ان تصاویر کی مزید کاپیاں بنا کر تمام پولیس سٹیشنوں کے انچارج تک پہنچا دو .... اخبارات میں بھی شائع کراؤ کہ اس کی ماں سخت بیمار پڑ گئی ہے۔ اس کے دودھ کا قرض ادا کرنے کے لئے آ جاؤ۔"

وہ اپنے طور پر صبح سے دفتر میں بیٹھا کوششیں کرتا رہا۔ دوپہر کو اسماء نے دفتر میں آ کر پوچھا۔ "کیا آپ کے یہاں بیٹھے رہنے سے میرا بیٹا مل جائے گا؟"

"ہمارے اور پولیس ڈیپارٹمنٹ والے اسے تلاش کر رہے ہیں۔ اس کی تصاویر تمام تھانوں میں بھیج دی ہیں اور اخبارات میں.........."

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "آپ اس کرسی پر بیٹھ کر افسرانہ کارروائیاں کر رہے ہیں۔ ہو

سکتا ہے آپ مجرموں کو اس طرح تلاش کر لیتے ہوں لیکن وہ ہمارا بیٹا ہے۔ اپنی چیز گم ہو تو خود اسے ڈھونڈنا پڑتا ہے۔"

"وہ میری جان ہے۔ میں نے تمہاری اور اس کی حفاظت کے لئے ایک طویل عرصے تک جدائی کے صدمات اُٹھائے ہیں۔ میں یہاں سے اٹھ کر سڑک پر جاؤں گا تو وہ نہیں ملے گا۔ گم ہونے والے کو ڈھونڈ نکالنے کے جتنے طریقے ہیں ان پر عمل کیا جا رہا ہے۔ خدا نے چاہا تو ہمارا بیٹا یہاں ضرور آئے گا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ آواز آئی۔ "سر! آپ کا بیٹا مل گیا ہے۔ ہم اندر آ سکتے ہیں۔"

"کم آن" اسماء اور فرمان دونوں خوش ہو کر اپنی کرسیوں سے اٹھ گئے۔ دروازہ کھلا۔ کامران اندر آیا۔ اس کے آس پاس اور پیچھے ایک پولیس انسپکٹر اور مسلح سپاہی تھے۔ اسماء نے دیکھتے ہی پوچھا۔ "بیٹے! تم کہاں چلے گئے تھے؟"

وہ ماں باپ سے منہ پھیر کر کھڑا ہوا تھا۔ انسپکٹر نے کہا۔ "سر! آپ کے صاحب زادے ایک تھانے کی حوالات میں تھے۔"

"حوالات میں؟" فرمان علی نے حیرانی سے پوچھا۔ "حوالات میں کیوں؟"

"سر! یہ جس مکان میں رہتے تھے' وہاں سے ایک کلاشکوف اور دس کلو ہیروئن برآمد ہوئی ہے۔"

اسماء نے کہا۔ "یہ جھوٹ ہے۔ یہ کسی دوسرے مکان میں نہیں میرے ساتھ میرے گھر میں رہتا تھا۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "جو بات قانون کے محافظ جانتے ہیں۔ وہ ایک ماں نہیں جان سکتی۔ یہ بے شک آپ کے ساتھ رہتے تھے لیکن انہوں نے رازداری سے ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ وہاں منشیات اور اسلحہ چھپا کر رکھتے تھے اور یونیورسٹی کے طلبا و طالبات کو ہیروئن کے استعمال کا عادی بناتے تھے۔"

کامران نے کہا۔ "یہ جھوٹ ہے۔ مجھ پر الزام لگایا جا رہا ہے۔ میں اپنے دوست بشیر احمد کے مکان میں گیا تھا۔ وہاں رات گزارنا چاہتا تھا۔ بشیر احمد رات کو روٹیاں لانے گیا تو واپس نہیں آیا۔ دو گھنٹے بعد ہی پولیس والے مکان میں گھس آئے۔ ان کے پاس ایک کلاشنکوف اور سفید پاؤڈر کی تھیلیاں تھیں۔ انہوں نے الزام لگایا کہ وہ سب چیزیں میری ہیں پھر مجھے لے جا کر حوالات میں بند کر دیا۔"

فرمان نے کہا۔ "بعض پولیس والے ایسی دھاندلیاں کرتے ہیں۔ اس مکان کے مالک سے پوچھا جائے کہ اس مکان کو کس نے کرائے پر لیا تھا۔"

"سر! ہم نے تحقیقات کی ہیں۔ مالک مکان کا بیان بھی لکھوایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مکان کسی بشیر احمد نے نہیں بلکہ آپ کے صاحب زادے نے اس سے کرائے پر لے رکھا تھا۔"

فرمان علی نے کہا۔ "یہ بیان خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جب اسے ملزم کے طور پر حوالات میں رکھا گیا تھا تو ابھی اسے ہتھکڑی کے بغیر کیوں لایا گیا ہے؟ کیا الزام غلط ثابت ہوا ہے؟"

"نو سر! اس علاقے کے ایک بدمعاش ہیروئن سپلائر نے بھی بیان دیا ہے کہ آپ کے صاحب زادے اس سے مال لے کر یونیورسٹی میں نشے کا زہر پھیلایا کرتے تھے۔"

فرمان نے کہا۔ "میں اپنے طور پر تفتیش کروں گا لیکن ابھی میرے بیٹے کے خلاف ثبوت بھی ہیں اور گواہ بھی اور الزام بھی سخت ہے۔ جب تک یہ سب کچھ غلط ثابت نہ ہو۔ یہ ملزم کہلائے گا۔ چونکہ ملزم کو ہتھکڑی پہنائی جاتی ہے۔ لہٰذا اسے بھی پہنائی جائے۔"

کامران نے چونک کر غضب ناک ہو کر باپ کو دیکھا۔ اسماء نے کہا۔ "یہ آپ کیسا حکم دے رہے ہیں۔ اپنے بیٹے کو ہتھکڑی پہنانے کو کہہ رہے ہیں۔"

"اسماء' میرے فرائض کو سمجھو۔ جب تک انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ کامران میرا بیٹا ہے' اسے حوالات میں رکھا گیا۔ جب مجھ جیسے بڑے افسر سے اس کا رشتہ معلوم ہوا تو اسے حوالات سے بھی باہر لایا گیا اور میری عزت کا خیال کرتے ہوئے اسے ہتھکڑی نہیں پہنائی گئی۔ یہ سراسر قانون کے اور ہمارے فرائض کے خلاف ہے۔"

"چولہے میں گئے آپ کے فرائض۔ ہم کل رات سے بیٹے کو تلاش کر رہے ہیں۔ اب یہ مل گیا ہے تو اسے جھوٹے الزام میں ہتھکڑی پہنا رہے ہیں۔"

کامران نے نفرت سے کہا۔ "محترمہ! آپ کبھی میری ممی کہلاتی تھیں لیکن آپ سے اور آپ کے صاحب سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ لہٰذا آپ میری وکالت یا سفارش نہ کریں۔ جو بچہ کبھی باپ کی انگلی پکڑ کر نہ چلا ہو' وہ لاوارث ہوتا ہے اور ایک لاوارث کو ہتھکڑی پہنانے کا حکم دینے والا باپ کبھی نہیں ہو سکتا۔"

کامران نے اپنے دونوں ہاتھ انسپکٹر کی طرف بڑھا دیئے۔ انسپکٹر نے ہچکچاتے ہوئے بڑے صاحب اور بیگم صاحبہ کو دیکھا پھر ان کے بیٹے کو ہتھکڑی پہنا دی۔

اسماء گم صم کھڑی رہی۔ پولیس والے کامران کو لے گئے' فرمان نے کہا۔ "یہ میری بدقسمتی ہے کہ پہلے ماں بیٹے کی سلامتی کے لئے طلاق کا جھوٹا ناٹک کیا۔ اس جھوٹ کو تم نے سمجھ کر مجھے قبول کرلیا۔ مگر بیٹے کے دل سے نفرت نہیں گئی ہے۔ دوسری بدقسمتی یہ ہوئی کہ فرض کی ادائیگی کے لئے پھر میں نے بیٹے کے دل میں نفرت بڑھادی ہے۔"

"آپ تارا بھائی اور رومانہ کو لے کر تھانے جائیں۔ وہاں تارا بھائی آپ کی آواز بنا کر ہمارے بیٹے کے دل سے تمام نفرتیں دور کر دیں گے۔ اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ آپ بیٹے پر لگے ہوئے الزام کو غلط ثابت کر دیں گے۔"

فرمان علی اسی وقت اسماء کے ساتھ دفتر سے نکل کر امجد تارا کے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی بدقسمتی کی گھڑیاں ٹلنے والی نہیں تھیں۔ وہاں گھر میں رومانہ تنہا تھی۔ اس نے کہا۔ "ممی! ابھی میں آپ کے پاس جانے والی تھی۔ ڈیڈی نے کہا ہے کہ میں کچھ دنوں تک آپ کے ساتھ رہوں۔"

"تمہارے ڈیڈی کہاں ہیں؟"

"وہ صبح سے کہیں چلے گئے ہیں۔ یہ موبائل فون نمبر دیا ہے اور کہا ہے کہ آپ ان سے رابطہ کریں۔"

فرمان نے وہ نمبر لے کر فوراً رابطہ کیا' پھر پوچھا۔ "تارا! تم کہاں ہو؟"

اس نے کہا۔ "بیدار بخت میرے پیچھے ہے اور میں اس کے آگے ہوں۔ اسے دوڑا رہا ہوں۔ وہ کوئی خطرہ محسوس کر کے میری جان کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ کیا تم معلوم کر سکتے ہو کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟"

فرمان نے کہا۔ "بات کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔ اسے شاید معلوم ہو گیا ہے کہ میں نے اسماء کو طلاق نہیں دی تھی اور اسے محفوظ رکھنے کے لئے اس دشمن کو دھوکا دیا تھا۔ اب وہ میرے بیٹے کو منشیات فروش ثابت کر کے ہم سے انتقام لے رہا ہے۔ ہمارا کامران اس وقت حوالات میں ہے۔ ہمارا یہ بیٹا بھی طلاق کے ناٹک کو سچ سمجھ کر مجھ سے اور تمہاری بھابی سے سخت نفرت کر رہا ہے۔"

تارا نے کہا۔ "اس حد تک بات سمجھ میں آگئی ہے تو اب اس کی تصدیق ہو جائے گی۔ کامران کو کہاں سے گرفتار کیا گیا تھا؟"

"میں ابھی تھانے جا کر اس مالک مکان کا نام پتا وغیرہ معلوم کروں گا پھر تمہیں بتاؤں گا۔ میرے دوسرے فون کا انتظار کرو۔"

فرمان نے فون بند کیا۔ اسماء اور رومانہ کے ساتھ اس تھانے میں پہنچا' تھانے کے انچارج نے فرمان علی کو دیکھتے ہی اُٹھ کر سیلوٹ کیا پھر اس کی مطلوبہ معلومات فراہم کرنے لگا۔ فرمان نے ایک دوسرے کمرے میں جا کر تنہائی میں تارا سے رابطہ کیا۔ اسے مالک مکان کا نام پتا اور فون نمبر بتایا۔ تارا نے کہا۔ "تم بھابی اور رومانہ کو لے کر اپنے سرکاری بنگلے میں جاؤ۔ ایک گھنٹے کے اندر تم ٹیلی فون کالیں ریکارڈ کرنے کے انتظامات کرو۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں فون کروں گا۔"

فرمان ان دونوں کو لے کر اپنے سرکاری بنگلے میں آگیا۔ وہاں پہنچنے کے چند منٹ بعد فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ فرمان نے ریسیور اُٹھا کر کہا۔ "ہیلو' میں فرمان علی بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے بیدار بخت کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے تو تم آواز سے پہچان لوگے۔ کیا نام بتانا ضروری ہے؟"

"ایک کمینے کے ہزار نام ہوں۔ تب بھی وہ کمینہ کہلاتا ہے۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ اب میرے بیٹے سے دشمنی کر رہے ہو۔"

"ٹھیک سمجھ رہے ہو لیکن یہ دشمنی ذرا ادھوری ہے۔ امجد تارا نے جس طرح تمہاری بیوی کو طلاق نہ دیے جانے کا یقین دلایا ہے۔ اسی طرح تمہارے بیٹے کے دل سے بھی ماں باپ کے خلاف نفرت دور کر سکتا ہے۔ وہ کمبخت آوازوں کا نقال میرے ہاتھ نہیں آ رہا ہے۔ اس لئے میں نے تمہیں ایک وارننگ دینے کے لئے ابھی فون کیا ہے۔"

"تم کیا وارننگ دینا چاہتے ہو؟"

"ابھی مجھے تھانے سے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ تمہاری بیوی اور تارا کی بیٹی ہے۔ میں تمہاری بیوی کو وہ وارننگ سنانا چاہتا ہوں؟"

فرمان نے اسماء کو ریسیور دے کر کہا۔ "وہ دشمن تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس کی بکواس سن لو۔"

اسماء نے ریسیور لے کر کان سے لگایا۔ فرمان نے بھی اُس ریسیور سے کان لگایا۔ اسماء نے کہا۔ "ہیلو! مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہو؟"

وہ بولا۔ "بہت چھوٹی سی صدمہ پہنچانے والی بات ہے۔ اس بات کو باپ سے زیادہ ماں سمجھ کر اس پر عمل کرے گی۔ یہ میری وارننگ ہے کہ تارا کو کبھی اپنے بیٹے کامران تک نہ پہنچنے دینا۔ اگر وہ کامران کے دل سے ماں باپ کے خلاف نفرت دور کر دے گا تو کسی بھی نامعلوم سمت سے ایک گولی آئے گی اور تمہارے بیٹے کا لہو چاٹ جائے گی۔ بیٹے

کو زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو اس کے دل میں نفرت کی پرورش کرو۔ بیٹے کے پاس جا کر اپنی زبان سے کہو کہ تم واقعی مطلقہ ہو اور فرمان علی کے ساتھ گناہ کی زندگی گزار رہی ہو۔"

"تم کیسے کم ظرف اور کمینے ہو۔ ماں کی زبان سے ایسی شرمناک بات کہلوانا چاہتے ہو۔ کامران کا سر ساری زندگی اس احساس سے جھکائے رکھنا چاہتے ہو کہ وہ گناہ گار والدین کا بیٹا ہے۔ خدا سے ڈرو۔ اپنا انجام سوچو۔ آخر تم کب تک میرے فرمان کی گرفت سے بچتے پھرو گے۔"

"ہاں' میں کبھی نہ کبھی قانون کے شکنجے میں آ سکتا ہوں۔ میری طرح ہر مجرم یہ بات سمجھتا ہے۔ میرا مقصد تو صرف انتقام لینا ہے۔ اس لئے میری فکر نہ کرو۔ بیٹے کو نفرت کرنے اور اپنے ماں باپ پر کیچڑ اچھالنے دو' دیٹس آل۔"

☆======☆======☆

ادھر سے فون بند کر دیا گیا۔ اسماء نے ریسیور رکھ کر رونے کے انداز میں کہا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہمارے بیٹے کی زندگی خطرے میں ہے۔ خدا کے لئے آپ تارا بھائی سے کہیں کہ وہ کبھی کامران کے قریب نہ جائیں' مجھے بیٹے کی زندگی چاہئے۔ خواہ وہ زندگی بھر ہمیں گناہ گار سمجھ کر نفرت کرتا رہے۔"

فرمان نے رومانہ سے کہا۔ "بیٹی! انہیں دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔ مجھے کام کرنے دو۔"

رومانہ اسماء کو تسلیاں دیتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بنگلا ٹیلی فون ایکسچینج کے قریب تھا۔ فرمان نے وہاں جا کر مخصوص کالیں ریکارڈ کرنے کے انتظامات کئے۔ ٹھیک مقررہ وقت پر تارا نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ "میں اس مالک مکان کا فون نمبر ڈائل کر رہا ہوں۔ اسے ریکارڈ کرو۔"

"یہاں تمام تیاریاں مکمل ہیں۔ تم ڈائل کرو۔"

فرمان اور تارا ایک طویل عرصے تک بیدار بخت کے ساتھ رہ چکے تھے۔ وہ اپنے ایک خاص ماتحت پر بہت بھروسا کرتا تھا۔ اسے اپنا دست راست کہتا تھا اور اسی کے ذریعے تمام اہم کام کرتا تھا۔ تارا نے نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ ہونے پر مالک مکان کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو میں چمن بھائی بول رہا ہوں' تم کون ہو بھائی؟"

تارا نے بیدار بخت کے خاص دست راست کی آواز اور لہجے میں کہا۔ "میں بخاری بول رہا ہوں۔ ہمارا باس بیدار بخت تم سے بہت خوش ہے۔ تم نے کامران کے خلاف تھانے میں جھوٹا بیان بڑی ہوشیاری سے لکھوایا ہے۔ کہیں غلطی نہیں کی۔ کیا تم مانتے ہو کہ ہم نے بھی تمہیں خوش کیا ہے؟"

"بخاری بھائی! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ آپ نے پچیس ہزار روپے دیئے۔ اتنی رقم میں تو اپنے باپ کے خلاف بھی بیان دے سکتا ہوں۔"

"کامران کا باپ فرمان علی چیف آف انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ اپنے بیٹے کو جھوٹے

الزام سے بچانے کے لئے تفتیش کر رہا ہے۔ تمہارے پاس بھی سوالات کرنے کے لئے آ سکتا ہے۔ تم ہوشیار رہنا اور ذرا بھی نہ گھبرانا۔"

اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "بخاری بھائی! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا اس کامران کا باپ انٹیلی جنس کا افسر ہے؟ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"بتانا بھول گیا تھا۔ کیا تم گھبرا رہے ہو؟"

"گھبراہٹ تو ہو رہی ہے۔ مگر سزا سے بچنے کے لئے اس افسر کے سامنے سنبھل کر جوابات دوں گا؟"

"ہم نے کامران کو کرایہ دار بنا کر پھانس لیا۔ وہ اصلی کرایہ دار ادھر آئے تو اسے آئندہ اپنی طرف آنے سے منع کر دینا۔"

"میں تو اسے منع کر دوں گا مگر ایک گڑبڑ ہے۔ میں اس شہر میں ہمیشہ نہیں رہتا ہوں۔ اس لئے وہ اصلی کرایہ دار بشیر احمد اپنے چیک کے ذریعے کرایہ ادا کرتا تھا اور وہ چیک ہر ماہ میرے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرتا تھا اگر وہ انٹیلی جنس کا افسر بینک تک چھان بین کے لئے پہنچے گا تو میری گردن پھنس جائے گی۔"

"فکر نہ کرو۔ ہم افسر کو بینک تک پہنچنے نہیں دیں گے۔ تم اپنے دل و دماغ سے تمام پریشانیاں نکال دو۔ ہم تمہیں پھنسنے نہیں دیں گے۔"

تارا نے رابطہ ختم کر دیا پھر موبائل فون کے ذریعے فرمان سے پوچھا۔ "کیا ریکارڈنگ صحیح ہو رہی ہے؟"

"تارا! تم واقعی باکمال ہو۔ ریکارڈنگ ہو چکی ہے اور اگر نہ بھی ہوتی تو معلوم ہو چکا ہے کہ چمن بھائی کا بینک اکاؤنٹ چیک کر کے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ کامران کبھی وہاں کرائے دار نہیں رہا۔ اصل مجرم کرائے دار کوئی اور ہے۔"

تارا نے کہا۔ "اب دوسری کال کی ریکارڈنگ کراؤ۔ میں اس تھانے کا فون نمبر ڈائل کر رہا ہوں۔ جہاں کے پولیس انسپکٹر نے چمن بھائی کے مکان پر چھاپا مار کر کامران کو گرفتار کیا تھا۔"

وہ نمبر ڈائل کرنے لگا۔ ریکارڈنگ دوبارہ ہونے لگی۔ رابطہ ہونے پر تارا نے بیدار بخت کی آواز اور لہجے میں کہا۔ "ہیلو میں بی بی بول رہا ہوں۔ ریسیور انسپکٹر فاضل کو دو۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "اوہ جناب بی بی صاحب! میں آپ کا خادم انسپکٹر فاضل بول رہا ہوں۔ مجھے یاد ہے۔ آپ نے آج آٹھ بجے رات کو حاضری کا حکم دیا ہے۔

بندہ حاضر ہو جائے گا۔"

"تمہارے دست راست بخاری نے بتایا ہے کہ فرمان علی نے اپنے بیٹے کو الزام سے بچانے کے لئے اپنے طور پر تفتیش شروع کر دی ہے اور وہ تمہارے پاس تھانے میں آیا تھا۔"

"جناب! ایسے کتنے ہی انٹیلی جنس کے افسران آتے جاتے رہتے ہیں' میں نے بڑی خوب صورتی سے فرمان علی کو مطمئن کر کے یہاں سے چلتا کر دیا ہے۔"

"شاباش! آج رات آٹھ بجے تمہیں خوش کر دوں گا۔"

تارا نے فون بند کر دیا۔ زیادہ گفتگو لازمی نہیں تھی۔ کیونکہ یہ معلوم ہو چکا تھا کہ انسپکٹر فاضل رات کے آٹھ بجے بیدار بخت سے ملاقات کرنے جائے گا۔

تارا نے اپنی صلاحیتوں سے کام آسان کر دیا تھا۔ فرمان علی اپنے بااعتماد ماتحتوں اور سپاہیوں کے ذریعے انسپکٹر فاضل کا تعاقب کرتا ہوا ایک عالی شان کوٹھی میں پہنچا تو بیدار بخت کو فرار ہونے کا راستہ نہیں ملا۔ وہ چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ خاص ماتحت بخاری بھی گرفتار ہو گیا۔

دوسرے دن چمن بھائی کا بینک اکاؤنٹ چیک کیا گیا۔ پتا چلا کہ بشیر احمد نامی شخص پچھلے تین برس سے چمن بھائی کے مکان کا مستقل کرائے دار تھا اور اکثر اپنے چیک کے ذریعے کرایہ چمن بھائی کے اکاؤنٹ میں جمع کیا کرتا تھا۔

جب یہ راز کھلا تو چمن بھائی سچ اُگلنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ اس رات سے پہلے اس نے کامران کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بخاری نے اسے بیدار بخت کے حکم سے پچیس ہزار روپے دیئے تھے۔ انسپکٹر فاضل بھی ان مجرموں کے ساتھ گرفتار ہو گیا تھا۔

جب پولیس کے دو افسران اور کئی سپاہی انہیں حراست میں لے کر جانے لگے تو تارا نے بیدار بخت سے کہا۔ "تمہارے ممنونِ احسان رہنے والے سیاست دانوں کی حکومت نہیں ہے۔ اس لیے جیل میں رہو۔ اگر کبھی تمہارے چاہنے والوں کی حکومت بنے گی تو باہر آ جانا اور ایسا نہ ہوا۔ کوئی تمہیں بچانے والا بااختیار نہ ہوا تو پھانسی کا پھندا تمہارا مقدر بن جائے گا۔"

کامران کے خلاف ایف آئی آر درج ہو چکی تھی۔ اس لئے عدالت میں اسے پیش کیا گیا۔ تاکہ اس کی بے گناہی کے ثبوت اور گواہ پیش کر کے اسے رہائی دلائی جا سکے۔

کامران کا کردار آئینے کی طرح صاف تھا۔ اسے یقیناً عدالت سے رہائی کا حکم مل جاتا لیکن

ایسا نہیں ہوا۔ کامران نے عدالت میں اپنے باپ فرمان علی کو غصے اور نفرت سے دیکھا پھر جج سے کہا۔ "جناب عالی! یہ ثابت ہو چکا ہے کہ میں بے قصور ہوں لیکن جس رات مجھے اسلحہ اور منشیات کے ساتھ گرفتار کیا گیا' اس مکان میں' میں کیوں تھا؟ مجھے اپنے والدین کے ساتھ ان کے مکان میں ہونا چاہیے تھا۔"

کامران سے پوچھا گیا۔" تم والدین کا مکان چھوڑ کر ایسی جگہ کیوں تھے' جہاں منشیات اور اسلحہ پایا گیا تھا؟"

اس نے جواب دیا۔ "اولاد ایسے وقت گھر چھوڑ دیتی ہے' جب وہ والدین کے قابل نہیں رہتی یا والدین اولاد کے قابل نہیں رہتے۔ میں یہ بتانا نہیں چاہتا کہ کون کس کے قابل نہیں ہے۔ فی الحال تو یہی کہوں گا کہ میں اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر بیدار بخت جیسے مجرم کے گروہ میں شامل ہونے گیا تھا۔ وہ میرے مجرم بننے کی پہلی رات تھی اور میں گرفتار کر لیا گیا۔ اگرچہ میرے جرم کا کوئی ثبوت نہیں لیکن میں اپنی زبان سے مجرم ہونے کا اقرار کرتا ہوں۔ اگر میرے ساتھ وہ مال پکڑا نہ جاتا تو میں دوسرے دن منشیات کا وہ زہر یونیورسٹی کے طلبا و طالبات میں پھیلانے والا تھا۔"

فرمان علی نے کہا۔" یہ تم عدالت میں کیسی غلط باتیں کر رہے ہو؟"

کامران نے کہا۔ "صحیح بات کروں گا تو میرے بزرگ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

فرمان کے ہونٹ سختی سے بند ہو گئے۔ عدالت میں بیٹھی ہوئی اسماء نے بھی منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ کامران نے جج صاحب سے کہا۔ "جناب عالی! مجھے آپ اس مجرمانہ ارادوں کی سزا دے سکتے ہیں کہ میں اس رات بیدار بخت کے گروہ میں شامل ہوا تھا اور دوسرے دن سے جرم کی ابتدا کرنے والا تھا۔"

جج صاحب نے کہا۔ "تمہارے جیسے گمراہی کا راستہ اختیار کرنے والے جوانوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے تھوڑی بہت سزا ضرور دینا چاہئے لیکن میں حیران ہوں کہ تم خود سزا پانے کے لئے اپنے مجرم ہونے کا اعتراف کر رہے ہو۔"

"ایسا اس لئے کر رہا ہوں کہ میرے اس سزا کو بھگتنے تک میرے بزرگ اپنی گناہ گار زندگی سے توبہ کر لیں۔ میں نے ایک بار گھر کا دروازہ بند کر کے ان کی غلطیوں پر پردہ ڈالا۔ آج دوسری بار عدالت سے سزا پا کر انہیں مہلت دے رہا ہوں کہ میرے جیل سے باہر آنے تک گناہوں سے باز آ جائیں۔ ورنہ میں رشتوں کو بالائے طاق رکھ کر ان کی سیاہ

کاری کو منظر عام پر لے آؤں گا۔"

جج صاحب نے پوچھا۔ "تم اپنے کن بزرگوں کے متعلق ایسا کہہ رہے ہو؟"

"معافی چاہتا ہوں جناب عالی! ابھی تک یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ میرے سزا پانے کے بعد یہ معاملہ درست نہ ہوا تو میں گناہ گاروں کو ہتھکڑیاں پہنا کر اسی عدالت میں لاؤں گا۔"

اس نے عدالت میں اپنے والدین کے خلاف بہت کچھ کہنے کے باوجود ان پر کیچڑ نہیں اُچھالی۔ چونکہ وہ مجرم نہیں تھا مگر اپنے بیان کے مطابق جرم کی ابتدا کرنے والا تھا۔ لہٰذا اسے تنبیہہ کے طور پر جیل کے ایسے حصے میں صرف ایک ہفتے کی قید کی سزا دی گئی' جہاں دوسرے قیدیوں کا اس پر سایہ نہ پڑے اور حکم دیا گیا کہ ایک ماہر نفسیات کی خدمات حاصل کر کے اس کے ذہن کو صحت مند بنایا جائے تاکہ وہ آئندہ مجرمانہ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہ کرے۔

اسے جیل بھیج دیا گیا۔ اسماء نے کہا۔ "یہ کیا ہو گیا؟ وہ خواہ مخواہ سزا بھگتنے گیا ہے اور ہم بدنامی کے خوف سے اسے روک بھی نہ سکے۔ آپ بہت بڑے افسر ہیں۔ جیل میں جا کر تارا بھائی کے ذریعے اس کی غلط فہمی دور کر سکتے ہیں۔"

"میں ایسا کر سکتا ہوں مگر نہیں کروں گا کیونکہ وہ صرف ایک ہفتے کے لئے ہم سے دور ہوا ہے۔ ایک ہفتے بعد ہماری شادی کی پچیسویں سالگرہ ہے۔ وہ ہمیں گناہ گار سمجھتا ہے مگر ہم اپنی ازدواجی زندگی کی سلور جوبلی منائیں گے اور اسے اپنا چیلنج پورا کرنے دیں گے کہ وہ ماں باپ کو ہتھکڑیاں پہنا کر عدالت میں لے جائے۔"

☆======☆======☆

سلور جوبلی کی خوشی میں چراغاں کئے جاتے ہیں لیکن چیف آف انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ فرمان علی اور بیگم اسماء فرمان کی شادی کی سلور جوبلی میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

اس تاریکی میں شہر کے امیر و کبیر اور معزز شخصیات تھیں۔ پورا ہال معزز مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سب اس تجسس میں تھے کہ وہ شادی کی سلور جوبلی ہے یا طلاق کی پندرہویں سالگرہ؟ ان کے جوان بیٹے کامران نے بھری محفل میں اپنے والدین سے یہی سوال کیا تھا کہ اور کہا تھا کہ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں' جنہیں سب کے سامنے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ لہٰذا سلور جوبلی کی ان جگمگاتی ہوئی روشنیوں کو بجھا دیا جائے تاکہ گناہ

گاروں کو اعتراف کرتے ہوئے شرم نہ آئے۔

اور یوں تمام روشنیاں بجھا دی گئی تھیں۔ تاریکی میں جو مہمان جہاں تھا' وہیں کھڑا یا بیٹھا رہ گیا تھا اور منتظر تھا کہ اب سلور جوبلی منانے والے کیا کہیں گے؟

تب تاریکی میں فرمان علی کی آواز اُبھری۔ "خواتین و حضرات! میں فرمان علی آپ سے مخاطب ہوں۔ چونکہ میں اس مکان کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ اس لئے تاریکی میں چلتا ہوا اس کامران علی کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہوں' جو مجھے باپ نہیں کہتا ہے اور نہ مجھے بیٹا کہنے کی اجازت دیتا ہے۔"

پھر اس نے بیٹے سے کہا۔ "کامران علی! کیا تم اپنے روبرو اس شخص کی آواز سن رہے ہو' جسے کبھی پاپا کہا کرتے تھے؟"

"ہاں۔ میں اپنے روبرو آپ کی آواز سُن رہا ہوں۔"

اچانک کامران نے اپنے پیچھے سے آواز سنی۔ "کامران! جھوٹ نہ بولو۔ تم میری آواز سامنے سے نہیں اپنے پیچھے سے سُن رہے ہو۔"

کامران نے حیرانی سے پلٹ کر پیچھے دیکھنا چاہا مگر تاریکی میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے پیچھے سے آواز آئی۔ "تم خاموش کیوں ہو؟ تمہیں میرے رو برو رہنا چاہئے۔ تم دوسری طرف کیوں پلٹ گئے ہو۔"

کامران نے پلٹنے سے پہلے اپنے سامنے سے آواز سنی۔ "بیٹا اس لئے میرے روبرو ہو گیا ہے کہ میں اس کا باپ ہوں۔"

پیچھے سے کہا گیا۔ "نہیں میں اس کا باپ ہوں۔ بیٹے! میری طرف گھوم جاؤ۔"

کامران نے گھوم کر حیرانی سے پوچھا۔ "یہ .... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اپنے پاپا کی آواز سامنے سے بھی سُن رہا ہوں اور پیچھے سے بھی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایک ہی آواز بیک وقت آگے اور پیچھے سے سنائی نہیں دے سکتی' روشنی کرو۔"

آگے سے باپ کی آواز آئی۔ "ابھی تاریکی رہے گی۔"

پیچھے سے باپ آواز آئی۔ "اگر تم فرمان علی کا خون ہو تو تاریکی میں اپنے باپ کی آواز کو پہچانو۔"

آگے سے باپ نے کہا۔ "ابھی تم نے کہا تھا کہ باپ کا لہو کم ظرف نہ ہو تو میں تمہاری لائی ہوئی ہتھکڑی اُٹھا کر خود پہن لوں گا۔"

پیچھے سے باپ نے کہا۔ "لیکن یہ ہتھکڑی میری کلائی میں اس وقت آئے گی جب تم

اس تاریکی میں اور بھری محفل میں سب کی موجودگی میں بتاؤ گے کہ تمہارا باپ کہاں ہے؟ آگے ہے یا پیچھے؟"

آگے سے پوچھا گیا۔ "ہاں برخوردار! بولو' باپ آگے ہے یا پیچھے؟"

پیچھے سے آواز آئی۔ "میں تمہاری آسانی کے لئے پھر طلاق کے الفاظ دُہراتا ہوں تاکہ تم باپ کو پہچان سکو۔ میں شادی کی سلور جوبلی میں اسماء بیگم کو طلاق کا تحفہ دیتا ہوں۔ سنتی ہو اسماء! میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔ میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں.........."

کامران نے فوراً ہی پیچھے گھوم کر اندھیرے میں اسے پکڑ لیا۔ اس کے گریبان کو پکڑتے اور جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "آپ ہیں۔ آپ بھری محفل میں اعتراف کر رہے ہیں کہ.........."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پورے ہال میں روشنی ہو گئی۔ اس نے تارا کا گریبان پکڑا ہوا تھا اور تارا اس کے باپ کی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "ابھی تو میں [illegible] دو ہی طلاقیں دی ہیں۔ تیسری دینے دو۔ ہاں تو اسماء میں تمہیں تیسری طلاق [illegible] رہا ہوں۔ ہمارا لائق بیٹا! باپ کی نقلی آواز کو پہچان رہا ہے اور اصلی لہو کی پہچان بھ[illegible] ہے۔"

کامران نے تیزی سے پلٹ کر پیچھے [illegible]یکھا۔ وہاں فرمان علی کھڑا ہوا تھا۔ تارا کہہ رہا تھا۔ "خواتین و حضرات! کامران نے آٹھ برس کی کچی عمر میں باپ کو ماں کے خلاف طلاق کے الفاظ ادا کرتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ اس نے میری آواز اس طرح سنی تھی' جس طرح آپ تمام حاضرین تاریکی میں سن رہے تھے او[illegible] دھوکا کھا رہے تھے کہ میرا دوست فرمان علی اپنی شادی کی سلور جوبلی میں بیوی کو طلاق دے رہا ہے۔"

ایک بزرگ نے کہا۔ [illegible] واقعی ایسا ہوا ہے تو میاں بیوی میں طلاق نہیں ہوئی لیکن آپ نے فرمان علی کی آواز اور لہجے میں خواہ مخواہ طلاق کے الفاظ کیوں ادا کئے تھے؟"

تارا کے جواب دینے سے پہلے فرمان علی نے کیک کے پاس سے ہتھکڑی اُٹھا کر کہا۔ "پندرہ برس پہلے ایسا کیوں ہوا۔ میں ابھی وضاحت کروں گا لیکن اس بیٹے نے اپنے ماں باپ پر کیچڑ اُچھالنے کا جرم کیا ہے۔ اس لئے ہتھکڑی اب اسے پہنائی جائے گی۔"

فرمان علی نے اس کی ایک کلائی میں ہتھکڑی پہنائی۔ رومانہ نے تیزی سے قریب آ کر کہا۔ "انکل! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ اپنے ہی بیٹے کو.........."

بات پوری ہونے سے پہلے فرمان نے ہتھکڑی کا دوسرا حصہ رومانہ کو پہنا دیا پھر دونوں کو ایک بندھن میں باندھنے کے بعد ان کے ہاتھوں کو بلند کرتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی اور

اسماء کی شادی کی سلور جوبلی میں اپنے بیٹے کو اس کی محبت کا تحفہ دے رہا ہوں۔"
تمام ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔ فلش لائٹس جل رہی تھیں اور سلور جوبلی کے ان خوبصورت لمحات کو کیمروں کی آنکھیں محفوظ کر رہی تھیں۔

☆======☆======☆

وسیلہ

ماں دنیا کا مقدس ترین رشتہ ہے۔ اس ماں
کی کہانی جس نے اس رشتے کو گالی بنا دیا تھا۔
دو ہم شکل افراد کی دلچسپ اور عبرت ناک کہانی
ایک سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوا تھا
تو دوسرا نان جویں کو بھی محتاج تھا۔
کروڑوں کی جائیداد کے حصول کے لئے
کھیلے جانے والے خونی ڈرامے کی کہانی۔

ایسی غضب کی سردی تھی کہ میرا سارا وجود تھرتھرا رہا تھا اور دہشت بھی ایسی تھی کہ کلیجہ کانپ رہا تھا۔ میں اُدھر دیکھنا نہیں چاہتا تھا مگر وہ گھورتی ہوئی آنکھیں اِدھر دیکھ رہی تھیں۔ ایسی ظالم نگاہیں تھیں کہ بدن میں جگہ جگہ چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے کوٹ کے کالر کو کھڑا کر لیا تاکہ سرد ہواؤں سے گردن محفوظ رہے۔ کوٹ کو اپنے اطراف اچھی طرف لپیٹ کر سینے پر ہاتھ باندھ لیا۔ جیسے ان نگاہوں سے خود کو چھپا رہا ہوں۔ دراصل اس وقت مجھ پر دو طرفہ حملے ہو رہے تھے۔ ایک تو سردی مجھے مار رہی تھی۔ دوسرے وہ نگاہیں لحہ لحہ مجھے کاٹ رہی تھیں۔

میں نے فٹ پاتھ پر چلتے چلتے ایک ذرا سر گھما کر سڑک کے دوسری طرف والے فٹ پاتھ پر دیکھا تو وہی نظر آیا۔ وہ بھی اس فٹ پاتھ پر ساتھ چلتا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ میرے شانہ بشانہ چل رہا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ہمارے درمیان ایک کشادہ سڑک تھی لیکن وہ نگاہیں اس سڑک کو پار کرتی ہوئی مجھ تک پہنچتی رہتی تھیں۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی تھی۔ سامنے ہی بس اسٹاپ تھا۔ وہاں پہنچ کر میں رک گیا۔ کسی لمحے بھی بس آنے والی تھی۔ اس بس میں سوار ہونے کے بعد میں اس سے دور ہو سکتا تھا۔ اس سے پیچھا چھڑا سکتا تھا۔ میں نے ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ دور بس کی ہیڈ لائٹس کو دیکھتے ہی جان میں جان آئی۔

میں بزدل نہیں ہوں لیکن حالات نے مجھے کمزور بنا دیا ہے۔ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ میری جیب میں دس روپے پچاس پیسے تھے۔ اگر یہ رات بھی میں فاقے سے گزار لیتا تو کل صبح دس روپے کے تازے پھل لے کر میں امی کے پاس سینی ٹوریم جا سکتا تھا۔ اتنی بڑی دنیا میں امی کے سوا میرا کوئی نہیں تھا۔ جب میں بچہ تھا تو امی نے دن رات محنت کرتے کرتے' مجھے اچھا کھلاتے پلاتے جوان کیا تھا۔ مسلسل کئی برسوں کی محنت نے انہیں ٹی بی کی مریضہ بنا دیا تھا۔ اب وہ سینی ٹوریم پہنچ گئی تھیں اور اب میرا فرض تھا کہ میں دن رات محنت کروں اور اپنی امی کے لیے علاج کی سہولتیں مہیا کروں اور اچھی

خوراک پہنچاؤں۔ اس وقت بہتر خوراک پہنچانے کے لیے میری جیب میں صرف دس روپے پچاس پیسے تھے۔

جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے' تب سے کسی کو اپنا دشمن نہیں بنایا۔ پتہ نہیں کیوں وہ شخص جو دوسرے فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا تھا۔ میرا تعاقب کر رہا تھا اور مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا۔ اس وقت بھی وہ دوسرے فٹ پاتھ پر میرے روبہ رو کھڑا ہوا تھا۔ اسی وقت وہ بس آکر ہمارے درمیان رک گئی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں جلدی سے آگے بڑھ کر بس پر سوار ہوا۔ پھر کھڑکی سے جھانک کر دوسرے فٹ پاتھ کی طرف دیکھنے لگا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ وہ فٹ پاتھ خالی تھا اور وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسی وقت بس چل پڑی۔ اس کے چلتے ہی وہ شخص دروازے پر نظر آیا اور اب وہ اندر آکر آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ میں جگہ نہ ہونے کے باعث بس کی چھت والی ریلنگ کو پکڑے کھڑا تھا۔ وہ بھی ریلنگ کے سہارے چلتا ہوا ٹھیک میرے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اب ہم بالکل نزدیک تھے۔ ایک دوسرے کے چہرے کو بڑی تفصیل سے دیکھ سکتے تھے اور وہ گھورتی ہوئی آنکھیں میرے چہرے کی ایک ایک تفصیل کو ٹٹول رہی تھیں۔ پھر اس نے میری طرف جھک کر بڑے رازدارانہ انداز میں دھیرے سے پوچھا۔ "کیا یہ تمہاری مونچھیں اصلی ہیں؟"

میرا ہاتھ بے اختیار اپنی مونچھوں پر گیا۔ میں نے اسے بڑی حیرانی سے دیکھا۔ یہ سوال میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں نے ذرا پیچھے ہٹ کر پوچھا۔ "آپ کون ہیں' مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ بہت دیر سے میرا تعاقب کر رہے ہیں اور اب آپ نے یہ کیسی بات پوچھی؟"

اس نے کہا۔ "جتنا سوال کر رہا ہوں' اتنا ہی جواب دو۔ کیا میں تمہاری مونچھوں کو ہاتھ لگا کر دیکھ سکتا ہوں؟"

یہ کہتے ہی اس نے میرا جوب نہیں سنا۔ ہاتھ بڑھا کر میری مونچھوں کو چھو لیا۔ پھر اس کے بالوں کو چٹکی میں پکڑ کر ہولے سے کھینچا تو میرے منہ سے کراہ نکل گئی۔ وہ اپنا ہاتھ کھینچ کر بولا۔ "سوری یہ تو اصلی ہیں۔"

اسی وقت کنڈکٹر ہمارے پاس آگیا۔ میں اپنی جیب سے پچاس پیسے نکال کر ٹکٹ لینا چاہتا تھا کہ اجنبی نے بڑے ہی گمبھیر لہجے میں کہا۔ "نہیں' ٹھہر جاؤ۔ میں ٹکٹ لے رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک روپے کا نوٹ نکالا پھر کنڈکٹر کو دیتے ہوئے بولا۔ "ریلوے

اسٹیشن۔"

میں نے حیرانی سے اجنبی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔"آپ کیسے جانتے ہیں کہ میں ریلوے اسٹیشن جانا چاہتا ہوں؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔"تعجب ہے میں تو تمہارے بارے میں یہ نہیں جانتا تھا۔ یہ محض اتفاق ہے۔ میں ریلوے اسٹیشن کے پاس ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ ہوٹل تک چلو۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

"میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔"

"کیا تم مجھ سے خوف زدہ ہو۔"

میں نے تائید میں سرہلا کر کہا۔"ہاں۔"

"خوف کی وجہ؟"

"وجہ تم خود سمجھ سکتے ہو۔ تم مشکوک انداز میں میرا تعاقب کرتے رہے ہو۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ دراصل میں تمہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم مجھے شاید کوئی چور اچکا سمجھ رہے ہو؟"

"ہاں' میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں تمہارے متعلق کیا رائے قائم کروں۔ جب کوئی شخص بار بار گھور کر دیکھے اور بے وجہ پیچھا کرتا رہے تو رات کے سناٹے میں اور اندھیرے میں یہی خوف طاری ہو جاتا ہے کہ پتہ نہیں وہ تعاقب کرنے والا کیوں دشمن بنا ہوا ہے اور کیا چاہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جیب میں جو کچھ پونجی ہو اسے چھینا چاہتا ہو اور اس کے لیے قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کرے۔"

اجنبی نے پوچھا۔"تمہاری جیب میں کتنی پونجی ہے؟"

میں نے جواب دیا۔"دس روپے پچاس پیسے"۔

اس نے اچانک ایک زور دار قہقہہ لگایا۔ بس کی اندرونی فضا اس کے قہقہے سے جھنجھنا اٹھی۔ تمام مسافر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اسے احساس ہوا کہ اس نے اپنے قہقہے سے لوگوں کو چونکا دیا ہے۔ اس نے فوراً ہی خاموش ہو کر مجھے دیکھا۔ پھر دھیرے سے کہا۔"تم احمق ہو۔ کیا دس روپے پچاس پیسے کے لیے کوئی کسی کا دشمن بن سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں بن سکتا۔ کیا تم اخبارات نہیں پڑھتے ہو' پانچ دس روپے کے لیے بھی درندہ صفت لوگ راہ چلتے مسافروں کو لوٹ لیتے ہیں۔ یا قتل کر دیتے ہیں۔ میری جیب میں یہ آخری پونجی ہے اور ایک غریب آدمی کی آخری پونجی دنیا کی ساری دولت سے زیادہ

اہم ہوتی ہے۔ اس پونجی کے لیے طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے ہیں اور تمہارے تعاقب نے مجھے کتنے ہی اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا۔"

اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔"تھا کا مطلب یہ ہوا کہ اب تمہارے دل میں میری طرف سے اندیشہ نہیں رہا۔ دیکھو' میرے دوست بن جاؤ۔ مجھ پر بھروسہ کرو۔ میرے ساتھ ہوٹل چلو۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

میں اس کی طرف خاموشی سے دیکھنے لگا۔ اس کے بدن پر اتنا قیمتی لباس تھا کہ اسے دیکھ کر اس کی دولتمندی کا پتہ چلتا تھا۔ اس نے سردی سے بچنے کے لیے بہت ہی قیمتی کپڑے کا اوور کوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ اتنا قد آور تھا کہ بس کی چھت سے اس کا سر لگ رہا تھا۔ اس لیے اس نے فلیٹ ہیٹ اتارنے کے بعد سر کو جھکا لیا تھا۔ ان دنوں میں بھوک اور بیروزگاری سے تنگ آکر اکثر سوچا کرتا تھا کہ کہیں سے مجھے دولت مل جائے یا کوئی ایسا دولت مند ہتھے چڑھ جائے جسے میں بڑی آسانی سے لوٹ کر فرار ہو سکوں اور قانون کی گرفت میں نہ آسکوں۔ میری شرافت کا بھرم قائم رہے اور مجھے اتنی دولت مل جائے کہ میں اپنا کوئی کاروبار کر سکوں۔

اسے دیکھ کر میں نے سوچا کہ ہوٹل کے کمرے میں اس کے ساتھ جانا چاہیے اور کوئی ایسا موقع تلاش کرنا چاہیے کہ اس کے پاس جو کچھ ہو' وہ میری جیب میں آجائے خواہ ایمان داری سے اس کے کسی کام آکر یا بے ایمانی سے اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر۔

بس تیز رفتاری سے چلی جارہی تھی۔ کھڑکی کے باہر بھی شہر کا اندھیرا اور کبھی سڑک کے کنارے کی روشنیاں نظر آجاتی تھیں۔ ان مناظر میں ایک چہرہ ابھر رہا تھا اور وہ میری امی کا چہرہ تھا۔ کھانستا ہوا اور خون تھوکتا ہوا۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ وہ ٹی بی کے آخری اسٹیج پر ہیں اور ان کا معقول علاج ہونا چاہیے اور اچھی خوراک ملنی چاہیے۔ علاج تو سرکاری طور پر ہو رہا تھا۔ دوائیں بھی مل رہی تھیں لیکن قیمتی دواؤں کی کمی تھی اور اچھی خوراک بھی میں مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ ان باتوں کا خیال آتا تھا تو دل کڑھنے لگتا تھا اور میں ندامت سے سوچنے لگتا تھا کہ کیا میں اپنی بوڑھی ماں کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ اس بڑھاپے میں انہیں اچھی صحت دے سکوں اور اپنی محنت اور کمائی کے ذریعے انہیں آرام پہنچا سکوں۔

بس ریلوے اسٹیشن کے اسٹاپ پر رک گئی۔ ہم دونوں بس سے اتر کر فٹ پاتھ پر

چلنے لگے۔ قریب ہی وہ بڑا سا ہوٹل تھا جہاں اس اجنبی کا قیام تھا۔ ہم اس ہوٹل میں داخل ہوئے۔ پھر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دوسری منزل کے ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ اس دوران میں سوچ رہا تھا اور فیصلہ کر رہا تھا کہ اس اجنبی پر کس حد تک اعتماد کیا جاسکتا ہے اور کس حد تک اسے بیوقوف بنا کر کچھ رقم حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے۔"

"علیم۔" میں نے کہا۔ "میرا نام عبدالعلیم ہے۔"

ہم کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا نام کچھ اور ہے۔ ذرا دماغ پر زور دے کر سوچو۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں بچپن سے اپنے نام کو جانتا ہوں اور اس نام سے پکارا جاتا ہوں۔ کوئی مجھے عبدل کہتا ہے کوئی مجھے علیم کہتا ہے۔ میرا پورا نام عبدالعلیم ہے۔"

"اور میں بھی تمہیں ایک عرصے سے جانتا ہوں۔ تمہاری یادداشت بہت کمزور ہے۔ تم رہ رہ کر بہت باتوں کو بھول جاتے ہو۔ حتیٰ کہ تم اپنا نام بھی بھول گئے ہو۔ تمہیں کچھ یاد بھی ہے کہ تمہاری ماں کا کیا حال ہو رہا ہو گا؟"

میں نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں مجھے اپنی ماں کے بارے میں بہت فکر ہے۔ وہ سینی ٹوریم میں ہیں اور ان کے علاج اور خوراک کے لیے مجھے اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہے۔"

اجنبی نے جھنجلا کر کہا۔ "کیوں فضول باتیں کرتے ہو۔ تمہاری ماں سینی ٹوریم میں نہیں، اپنے گھر میں ہے اور وہ دل کی مریضہ ہے، تپ دق کی مریضہ نہیں ہے۔"

میں نے بھی جھنجلا کر کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ کو بھی بھولنے کا مرض لاحق ہے اور آپ لوگوں کو پہچاننے میں غلطی کرتے ہیں۔ یقیناً آپ نے بھی مجھے پہچاننے میں غلطی کی ہے۔"

اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "میں نے غلطی کی ہے۔ تم کہتے ہو کہ میں نے غلطی کی ہے۔ ادھر آؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ پھر ایک کرسی پر لا کر زبردستی بٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہاں بیٹھو۔ میں ابھی تمہیں دکھاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے سوٹ کیس کے پاس جا کر اسے کھولا۔ پھر اس میں سے ایک

تصویر نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ میں نے اسے ہاتھ میں لے کر دیکھا تو ایک دم سے چونک گیا۔

میرے ہاتھوں میں میری تصویر تھی اور وہ تصویر اس اجنبی کے سوٹ کیس سے نکلی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس تصویر کو غور سے دیکھا تو ذرا سی دیر میں بہت سا فرق واضح ہو گیا۔ وہ یقیناً میرے جیسے کسی صحت مند نوجوان کی تصویر تھی۔ اس کا چہرہ بالکل ترو تازہ تھا اور صحت مندی و دولت مندی کی علامت بنا ہوا تھا۔ اس کے گال پھولے ہوئے تھے جبکہ مفلسی اور فاقوں نے میرے گال پچکا دیے تھے اور رخساروں کی ہڈیاں ابھر گئی تھیں۔ میری آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں خوب صورت اور چمکیلی تھیں۔ اس کے چہرے پر تازگی تھی۔ میرا چہرہ پژ مردہ تھا۔

اگر مجھے کہیں سے کچھ رقم مل جاتی اور میں تینوں وقت اچھی طرح کھانے پینے لگتا تو یقیناً اس تصویر والے نوجوان کی طرح صحت مند ہو سکتا تھا۔ میرے چہرے پر بھی ایسی تازگی اور سرخی آسکتی تھی جیسا کہ اس رنگین تصویر میں نظر آرہی تھی۔ اس اجنبی نے پوچھا۔ "اب کیا سوچ رہے ہو۔ کیا اب بھی تمہیں یاد نہیں آیا۔ دیکھو صاحب زادے تم کبھی اتنی دیر کے لیے کوئی بات نہیں بھولتے تھے۔ کبھی وقتی طور پر کچھ بھول جایا کرتے تھے لیکن یاد دلانے سے تمہیں وہ بات یاد آجایا کرتی تھی، اب کیا بات ہے کہ تم اپنے آپ کو نہیں پہچان رہے ہو۔"

میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ سخت غلط فہمی کا شکار ہیں۔ میں یہ نوجوان ہرگز نہیں ہوں آپ خود ہی اس تصویر کو دیکھ کر اندازہ لگائیں کہ اس کی اور میری صحت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

اس نے کہا۔ "تمہیں اپنا گھر چھوڑے ہوئے چار ماہ گزر چکے ہیں۔ پتہ نہیں کہاں کہاں بھٹکتے رہے ہو اور کتنے وقت سے فاقے کر رہے ہو تمہارے بدن پر لنڈے بازار کا کپڑا ہے۔ مجھے تو دیکھ کر تمہاری حالت پر افسوس ہو رہا ہے کہ اتنے دولت مند ہو کر ایسی بدترین زندگی گزار رہے ہو۔"

"دولت مند!" میں نے چونک کر پوچھا۔ "کیا یہ نوجوان بہت دولت مند ہے۔"

"یہ نوجوان نہیں۔ تم دولت مند ہو۔ یہ نوجوان تم ہی ہو۔ کیا میں تمہیں یاد دلاؤں گا کہ تمہارے باپ نے تمہارے لیے اتنا بڑا کاروبار چھوڑا ہوا ہے کہ اس کاروبار سے ہر ماہ پانچ لاکھ روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔"

پانچ لاکھ۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں حیرانی سے منہ کھول کر اس کا منہ تکنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ہاں' صرف اتنا ہی نہیں۔ بلکہ پچاس لاکھ روپے کی جائیداد تمہارے نام پر ہے اور جس لڑکی سے تمہاری شادی ہونے والی ہے' وہ کم از کم دو کروڑ روپے کی جائیداد اپنے ساتھ لے کر آئے گی۔"

میں یہ سنتے ہی ایک دم سے چکرا کر کرسی پر گر پڑا۔ پھر مجھے ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں۔

☆======☆======☆

جب مجھے ہوش آیا تو مجھے اپنا چہرہ بھیگا بھیگا سا لگا میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں پانی کا جگ ہے اور اس نے میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تھے۔ تب کہیں مجھے ہوش آیا تھا۔ میں نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔ "میرا نام کیا ہے۔"

اجنبی نے کہا۔ "تمہارا نام عظیم بیگ ہے مگر میں اور تمہاری امی تمہیں صاحب زادہ کہہ مخاطب کرتے ہیں۔"

میں نے کرسی پر ذرا سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "اگر میرا نام عظیم بیگ ہو جائے اور میں صاحب زادہ کے نام سے پکارا جاؤں تو کیا لاکھوں اور کروڑوں کی دولت اور جائیداد میں سے مجھے کچھ روپے مل سکتے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ کچھ روپوں کی کیا بات ہے۔ وہ ساری کی ساری دولت تمہاری ہے۔"

میں نے گھبرا کر کہا۔ "اتنی ساری دولت کی بات نہ کرو۔ ورنہ میں پھر بے ہوش ہو جاؤں گا۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں ہے کہ میں اتنی دولت سمیٹ سکوں۔ مجھے تو صرف اتنے پیسے چاہئیں کہ جن سے میں اپنی امی کا باقاعدہ علاج کرا سکوں اور انہیں بڑھاپے میں آرام پہنچا سکوں۔"

"تم کس امی کی بات کر رہے ہو۔ تمہاری امی کا علاج کرنے کے لیے تو شہر کے سب سے بڑے اور مہنگے ڈاکٹر آتے رہتے ہیں' ان کا معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کے لیے دوائیں تجویز کرتے رہتے ہیں۔"

میں نے فوراً ہی اس اجنبی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے بولنے سے روکتے ہوئے کہا۔ "خدا کے لیے میری بات سن لو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں عظیم بیگ عرف صاحبزادہ نہیں ہوں۔ اس تصویر کو دیکھ کر میں بھی سمجھ گیا ہوں اور آپ بھی سمجھ لیں کہ

میں اس نوجوان کا ہمشکل ہوں۔ یہ بات دوسری ہے کہ میرے اور اس کے چہرے میں ذرا سا فرق ہے اور وہ بھی صرف صحت کی خرابی کی وجہ سے ایسا ہے۔"

اس نے تصویر کو اٹھا کر پھر ایک بار دیکھا اور میری صورت دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہاں' کچھ اور بھی فرق ہے اور وہ یہ کہ صاحبزادہ کی مونچھیں نہیں ہیں۔ وہ مونچھیں رکھنے کا عادی نہیں ہے اور دوسری بات یہ کہ صاحبزادہ کنگھی کرتے وقت دائیں طرف سے مانگ نکالتا ہے اور تمہارے سر کے بالوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم بائیں طرف سے مانگ نکالا کرتے ہو۔ بہرحال' کیا تم ثابت کر سکتے ہو کہ تم صاحبزادہ نہیں بلکہ عبدالعلیم ہو۔"

"ہاں' کل صبح میں آپ کو اپنی ماں کے پاس سینی ٹوریم میں لے جاؤں گا۔ وہ بتائیں گی کہ انہوں بچپن سے اپنی گود میں مجھے پالا ہے اور مجھے جوان کیا ہے۔"

وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تعجب ہے کہ تم اس کے ہم شکل ہو یعنی کہ صاحبزادہ نہیں ہو لیکن تصویر دیکھو اور اپنے آپ کو دیکھو تو میں کیا تمہاری والدہ بھی' میرا مطلب ہے کہ صاحبزادہ کی والدہ بھی دھوکا کھا جائیں گی اور تمہیں اپنا بیٹا سمجھنے لگیں گی؟"

میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں' ساری دنیا دھوکا کھا سکتی ہے۔ ماں کبھی اس فریب میں نہیں آ سکتی کہ اس کے بیٹے کی جگہ کوئی کھلونا لا کر رکھ دیا جائے وہ ہزاروں' لاکھوں میں اپنے بیٹے کو پہچان لے گی۔ ویسے آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام حشمت بیگ ہے۔ میں صاحبزادہ کا چچا ہوں۔ تم رہتے کہاں ہو؟"

"میں یہاں سے تقریباً سوا سو میل دور ایک چھوٹے سے شہر میں رہتا ہوں۔ یہاں میری امی سینی ٹوریم میں داخل ہیں۔ اس لیے میں انہیں جب بھی دیکھنے کے لیے ملنے کے لیے آتا ہوں تو اس شہر میں ایک دو روز ٹھہر جاتا ہوں۔"

"کہاں قیام کرتے ہو؟"

"اور کہاں قیام کر سکتا ہوں۔ ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں رات گزارتا ہوں اور دن بھر مارا مارا پھرتا ہوں۔ جب تک سینی ٹوریم والے اجازت دیتے ہیں کہ میں ماں کے پاس بیٹھوں' اس وقت تک میں وہاں رہتا ہوں پھر باہر چلا آتا ہوں۔"

"آج رات تم میرے ساتھ یہاں گزارو۔ صبح اٹھ کر ہم سینی ٹوریم جائیں گے۔ میں تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ تم عبدالعلیم ہو۔"

"آپ کی مہربانی ہے کہ مجھے یہاں رات گزارنے کی اجازت دے رہے ہیں۔"

ریلوے کے تیسرے درجے کے کھلے ہوئے ویٹنگ روم میں رات گزارنا ایسا لگتا ہے جیسے بس یہ زندگی کی آخری رات ہے اور صبح ہونے نہیں پائے گی کہ ٹھٹھر کر مرجائیں گے۔"

"تم نے کچھ کھایا ہے؟"

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔"نہیں۔" حالانکہ میں کسی پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں فاقے کرتا ہوں اور ہمدردی کا محتاج ہوں۔ کوئی مجھے ایک وقت کی روٹی کھلا دے۔ میں نے جلدی سے کہا۔" اب تو اتنی رات ہو گئی ہے۔ کوئی خاص بھوک بھی نہیں ہے۔ میں صبح اٹھ کر کھالوں گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم رات کو بھوکے سو جاؤ۔ میرے ساتھ رہ کر تو کم از کم ایسا نہیں ہو گا۔ میں ابھی کھانے کا آرڈر دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ملازم کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔ میں نے انکار کیا کہ میں روٹی نہیں کھاؤں گا لیکن اس نے ڈانٹ کر کہا۔" جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ تم عبدالعلیم ہو' اس وقت تک میں تمہیں صاحبزادہ یعنی کہ اپنا بھتیجا سمجھتا رہوں گا اور یہ میرا حق ہے کہ میں تمہیں ڈانٹ ڈپٹ کر اپنے حکم پر عمل کرنے کے لیے مجبور کروں۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں چپ چاپ اسے قبول کرتے رہو۔"

میں خاموش بیٹھا رہا۔ یوں بھی اندر سے میرا دل چاہ رہا تھا کہ میرے دس روپے پچاس پیسے محفوظ رہیں اور کہیں سے کھانا آجائے۔ بس ذرا شرم آرہی تھی کہ کوئی دوسرا مجھے کھلا رہا ہے لیکن جب کھانا آیا تو میں اس پر ٹوٹ پڑا۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ کھانے کے بعد چائے آگئی۔ اس نے چائے پینے میں میرا ساتھ دیا اور ہم باتیں کرتے رہے۔ میں نے پوچھا۔"عظیم بیگ اپنے گھر سے کہاں چلا گیا ہے۔ کیا آپ مجھے اس کے بارے میں کچھ بتائیں گے۔"

"ہاں' کل صبح جب تصدیق ہو جائے گی کہ تم عبدالعلیم ہو تو پھر میں تمہیں بتاؤں گا اور اگر تم میرے بھتیجے ہو تو بھی مجھے بتانا ہی ہو گا کہ تم کیوں اس طرح بھٹک رہے ہو۔"

"حشمت صاحب' عظیم بیگ کے جسم پر کوئی نہ کوئی ایسا نشان تو ضرور ہو گا جو ان کی شناخت کا باعث بن سکتا ہے۔ آپ ایسے کسی شناختی نشان کے لیے میرے جسم کا معائنہ کریں اور اس طرح یقین کر لیں کہ میں عبدالعلیم ہوں۔"

اگر کوئی شناختی نشان ہوتا تو میں بہت پہلے ہی اسے تمہارے جسم پر دیکھنے کی کوشش کرتا۔ ایسا کوئی نشان صاحبزادے کے جسم پر نہیں ہے۔ بالکل بے داغ ہے۔ حتیٰ کہ کوئی

تل یا مسا بھی اس کے بدن پر نہیں ہے۔ کیا تمہارے جسم پر ایسا کوئی نشان ہے؟" میں نے کہا۔"میرے جسم پر بھی یوں تو کوئی مسا وغیرہ نہیں ہے لیکن بچپن میں میری پسلی پر چوٹ لگی تھی تو وہاں ایک زخم کا نشان ہے۔"

اس نے کہا۔"ذرا مجھے وہ نشان دکھاؤ۔"

میں نے اٹھ کر اپنی قمیض کو پتلون کے اندر سے نکالا اور اسے اوپر کی طرف اٹھا کر اپنی پسلی دکھائی۔ وہاں ایک زخم کا نشان تھا جو کبھی بہت گہرا تھا۔ اب سوکھ گیا تھا اور اپنی کے طور پر وہ نشان چھوڑ گیا تھا۔ حشمت بیگ نے اس زخم کے نشان کو ہاتھ سے چھو کے دیکھتے ہوئے کہا۔" ہوں' یہ تازہ نہیں ہے' کئی برس پرانا ہے۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ تم عبدالعلیم ہو کیونکہ میں نے اب سے تقریباً پانچ چھ ماہ پہلے صاحبزادہ کو سوئمنگ پول میں تیرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ انڈرویر میں تھا اور اس کی پسلی بالکل صاف تھی۔ یعنی وہاں کوئی ایسا زخم کا نشان نہیں تھا۔ اگر یہ تازہ نشان ہوتا تو میں یہ سمجھتا کہ صاحبزادہ کو کہیں چوٹ لگی ہے اور اس کے بدن پر اس نشان کا اضافہ ہو گیا ہے۔"

میں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے پوچھا۔"اس کا مطلب یہ ہے کہ امی سے ملنے سے پہلے ہی ثابت ہو گیا کہ میں عبدالعلیم ہوں؟"

اس نے اثبات میں سرہلا کر کہا۔"ہاں' اب مجھے یقین ہو گیا ہے اور اب میں حیران ہوں کہ تم صاحبزادہ سے کتنی مشابہت رکھتے ہو۔ آج شام کو میں نے تمہیں اس راستے پر دیکھا تھا جو سینی ٹوریم کی طرف جاتا ہے' شاید تم وہاں سے واپس آرہے تھے۔ تمہیں دیکھتے ہی میں چونک گیا تھا اور میں نے یہی سمجھا کہ تم صاحبزادہ ہو اور پھر اپنی یادداشت کی کمزوری کے باعث بھٹک رہے ہو۔ میں تمہارا پیچھا کرتا رہا اور یہ دیکھتا رہا کہ تم کہاں جاتے ہو' کیا کرتے ہو۔ ان دنوں کس کے ساتھ زندگی گزار رہے ہو لیکن شام سے تم اِدھر اُدھر سڑکوں پر گھوم رہے ہو۔ خود بھی تھک رہے تھے اور مجھے بھی تھکا رہے تھے۔"

"میں نے اب سے تقریباً تین گھنٹے پہلے آپ کو دیکھا تھا۔ آپ میری طرف گھور کر دیکھ رہے تھے۔ تبھی سے میں گھبرا گیا تھا اور خواہ مخواہ اِدھر سے اُدھر بھٹک رہا تھا کہ کسی طرح آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں لیکن دیکھ لیجیے کہ آپ نے پیچھا کیا چھوڑنا تھا۔ مجھے یہاں تک کھینچ کر لے آئے۔"

اس نے سرہلا کر کہا۔"یہ اچھا ہی ہوا۔ خدا جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔ میں اب تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

میں نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ "آپ کہاں لے جائیں گے کیوں لے جائیں گے؟"

"میں تمہیں اپنا بھتیجا بنا کر تمہاری امی کے پاس' میرا مطلب ہے کہ اپنی بھابی کے پاس لے جاؤں گا۔"

میں نے انکار میں زور زور سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں کبھی نہیں۔ میں امی کو چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا۔ وہ میری محبت اور توجہ کی محتاج ہیں۔"

اس نے بڑے تحمل سے کہا۔ "بیٹے' سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہاری امی جو سینی ٹوریم میں ہیں انہیں تمہاری توجہ کی نہیں' تمہاری محنت سے کمائی ہوئی رقم کی ضرورت ہے' تم جتنی رقم حاصل کرو گے اور جتنا مہنگا علاج کراؤ گے اور انہیں اچھی سے اچھی خوراک پہنچاؤ گے۔ ان کے لیے فائدہ مند ہو گا اور یہ سب کچھ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ تم میری بات مانو۔ میں تمہاری امی کو سینی ٹوریم کے اسپیشل کمرے میں رکھواؤں گا اور ان کا خصوصی علاج کراؤں گا۔"

میں خواب دیکھا کرتا تھا کہ امی اسپیشل وارڈ میں ہیں اور بڑے بڑے ڈاکٹر ان کے آس پاس کھڑے ہوئے ان کا علاج کر رہے ہیں اور خصوصی توجہ دے رہے ہیں۔ میں خیال ہی خیال میں دیکھتا تھا کہ میرے پاس بہت سے روپے آ گئے ہیں اور میں ان کی مدد سے امی کے لیے مہنگی دوائیں اور اچھی سے اچھی خوراک خرید رہا ہوں۔ حشمت بیگ کی زبان سے یہ باتیں سن کر پہلے تو مجھے یقین نہیں آیا۔ پھر میں نے سوچا ہو سکتا ہے اس کا کوئی ایسا کام اٹکا ہوا ہو جو میرے بغیر نہیں ہو سکتا تو شاید اس کے صلے میں یہ مجھے کچھ دینا چاہتا ہے۔ میں نادان تو نہیں ہوں۔ دس جماعتیں پاس کر چکا ہوں۔ انگریزی بھی اچھی طرح بول لیتا ہوں۔ میں نے دکھ مصیبتیں اٹھا کر فاقے کرتے ہوئے دنیا کو بڑی گہری نظروں سے دیکھا ہے۔ میں حشمت بیگ کے رویے کو سمجھ سکتا تھا اور اس کے ارادوں کو بھانپ سکتا تھا۔

حشمت بیگ نے پوچھا۔ "کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ میں تمہاری والدہ کا اچھا اور باقاعدہ علاج کرا سکتا ہوں۔"

"مجھے یقین ہے لیکن آپ یہ بتائیں کہ آپ ایسا کیوں کریں گے کس رشتے سے کریں گے؟"

"انسانی ہمدردی بھی کوئی چیز ہے۔ اسے انسانی ہمدردی سمجھ لو یا پھر انسانوں کے

درمیان کا لین دین سمجھ لو۔ ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ اس ہاتھ سے دیتا ہے تو اس ہاتھ سے اسے کچھ واپس ملے۔ میں جو کچھ بھی تمہیں دوں گا۔ اس کے صلے میں کچھ واپس لوں گا۔"

"آپ کیا واپس لیں گے؟"

اس نے میری طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں لوں گا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"میں اپنی امی کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔"

"تمہاری امی کی ہر طرح حفاظت کی جائے گی۔ ہر طرح ان کا خیال رکھا جائے گا۔ تم موجودہ رہ کر وہ کچھ نہیں کر سکتے جو تمہاری غیر موجودگی میں میرے انتظامات کے ذریعے تمہاری امی کے لیے ہو گا۔ تم دیکھو گے کہ وہ چند مہینوں کے بعد اچھی خاصی صحت مند ہو جائیں گی اور یہ تپ دق کا مرض ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔"

"لیکن میں آپ کے ساتھ کیوں جاؤں؟"

"انسانی ہمدردی کے لیے۔ تمہیں اپنی ماں سے بہت محبت ہے تو یہ سوچو کہ دنیا میں ایک ہی ماں نہیں ہوتی۔ دوسروں کی بھی مائیں ہوتی ہیں۔ اگر تم صاحبزادہ کی ماں کے لیے کچھ کر سکو۔ اس کے دل کی ٹھنڈک بن سکو۔ اس کی آنکھوں کا نور بن سکو تو اس سے بڑی نیکی اور کیا ہو سکتی ہے۔"

میں نے حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ مجھے صاحبزادہ بنانا چاہتے ہیں۔ کیا آپ اس بوڑھی خاتون کو یہ فریب دینا چاہتے ہیں کہ میں ان کا بیٹا عظیم بیگ ہوں؟"

"ہاں' میں یہی چاہتا ہوں کبھی کبھی ایک بیمار کا علاج کرنے کے لیے اور اسے دماغی الجھنوں سے نجات دلانے کے لیے جھوٹ اور فریب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں' نیک نیتی سے کر رہا ہوں۔ میں تمہیں وہاں لے جا کر اپنی بھابی کو ایک نئی زندگی دینا چاہتا ہوں۔"

میں سوچنے لگا کہ جواباً کیا کہنا چاہئے ایسے موقع پر کیا کرنا چاہیے' اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم کشمکش میں مبتلا ہو گئے ہو۔ حالانکہ نیک کام کرنے کے لیے زیادہ سوچنا نہیں چاہیے۔"

"ہاں' سوچنا نہیں چاہیے لیکن بعض حالات میں نیکی کرنے والا گڑھے میں گر پڑتا ہے۔ مجھے سوچنا پڑے گا کہ آخر اس نیکی کا انجام کیا ہو گا۔ آپ کو شاید نہیں معلوم کہ میں

جاسوسی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتا ہوں اور میں یہ دیکھتا ہوں کہ عجیب عجیب ہتھکنڈوں سے جرائم کیے جاتے ہیں۔ اگر میں آپ کے ساتھ نیکی کرنے گیا اور وہاں کوئی گھپلا ہو گیا تو میں بے موت مارا جاؤں گا۔ پھر اس دنیا میں امی بالکل تنہا رہ جائیں گی۔"

"تم مجھے کوئی مجرم سمجھ رہے ہو۔ یہ میری توہین ہے۔ تم نہیں جانتے کہ ہم لوگ کتنے معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم لوگوں نے کبھی چور بدمعاشوں کو اپنی دہلیز تک آنے کا موقع نہیں دیا۔ قانون کے محافظ ہماری عزت کرتے ہیں اور ہمارے ہاں تقریبات میں آتے ہیں تو ہمیں جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ تم یہ کیسے سوچ رہے ہو کہ میں تمہارے ذریعے کوئی جرم کرنا چاہتا ہوں؟"

"انسان کو ہر پہلو سے سوچنا چاہئے' دیکھئے حشمت صاحب میں ایک بات اپنے دل کی بتاتا ہوں اور وہ یہ کہ جب میں بہت زیادہ فاقے کرتا ہوں اور جب امی کی دوا کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہوتے تو میں سوچتا ہوں کہ کوئی چھوٹا موٹا سا جرم کروں اور کچھ رقم حاصل کرلوں۔ ایسے وقت انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ اگر آپ میری مجبوری سے فائدہ اٹھا کر کوئی ہلکا پھلکا سا جرم کرنا چاہتے ہیں تو مجھے صاف صاف بتا دیں۔ شاید میں اپنی امی کی خاطر کچھ رقم حاصل کرنے کے لیے آپ کا ساتھ دے سکوں۔"

حشمت بیگ نے غصے سے میری طرف دیکھا۔ پھر مٹھیاں بھینچ کر جیسے غصے کو برداشت کرتے ہوئے بولے۔ "دیکھو لڑکے' آیندہ ایسی بات زبان پر نہ لانا۔ میں بہت مجبور ہو کر تمہارا سہارا لینا چاہتا ہوں۔ خدا نے تمہیں صاحبزادے کا ہمشکل بنایا ہے۔ اس لیے میں تمہارا سہارا لینے پر مجبور ہوں۔ اپنی بھابی کی زندگی بچانا چاہتا ہوں۔ اگر تم اپنے دماغ سے ایسے غلط خیالات نکال کر نیک نیتی سے میرے ساتھ چل سکتے ہو تو میں تمہیں خوش آمدید کہوں گا اور اس کے صلے میں تمہیں اتنا کچھ ملے گا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔" اس نے زور دے کر کہا۔

میں نے کہا۔ "میں ہمیشہ نیک نیتی سے زندگی گزارتا ہوں کبھی کبھی کوئی جرم کرنے کا خیال آتا ہے تو وہ محض خیال ہوتا ہے۔ ورنہ ہر شریف آدمی مجبور ہو کر غلط انداز سے سوچتا ضرور ہے لیکن اس کی شرافت اسے اجازت نہیں دیتی کہ وہ اس پر عمل بھی کرے۔ اسی لیے آج تک میں عملی طور پر کبھی کوئی غلط کام نہ کرسکا۔ میں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ بتائیں کہ مجھے آپ میری امی کی خاطر کتنی رقم دیں گے؟"

حشمت بیگ نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم رقم دینے کی بات کر

رہے ہو۔ ارے' رقم تو ہم تم سے اپنی ضرورت کے مطابق لیا کریں گے۔ تمہاری امی بھی تمہاری محتاج ہیں۔ کیونکہ تمہارے باپ کا جو کاروبار ہے وہ میرا مطلب ہے کہ صاحبزادے کے والد کا جو کاروبار ہے۔ صاحبزادے کے ہاتھوں میں تھا۔ وہاں کے تمام اہم کاغذات پر اور بنک کے چیکوں پر صاحبزادے کے دستخط کیا کرو گے تو بنک سے رقمیں نکلا کریں گی اور ہم سب کی ضرورتیں پوری ہوا کریں گی۔ تم تو مالک و مختار ہو گے اور اپنی امی کے لیے بھی خرچ کر سکو گے۔ کوئی تم سے حساب کتاب نہیں لے گا۔"

"لیکن صاحبزادے کے دستخط میں کیسے کر سکوں گا۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ کل میں تمہیں اس کے دستخط کی نقل دکھاؤں گا۔ وہ نقل تو ابھی میرے پاس ہے لیکن وہ چھوٹے چھوٹے دستخط ہیں۔ میں ان کے بڑے فوٹوگراف بناؤں گا تاکہ تمہیں سمجھنے میں آسانی رہے اور تم اس دستخط کی باریک سے باریک تفصیل کو ذہن میں محفوظ رکھ کر اس کی کامیاب نقل اتار سکو۔ میرا خیال ہے کہ دو چار روز کی مشق کے بعد تم ہو بہو ویسے ہی دستخط کرنے لگو گے۔"

میں نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے حشمت بیگ کی طرف دیکھا۔ میرا دماغ اندر سے چیخ رہا تھا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے اور مجھ سے کچھ چھپایا جارہا ہے اور مجھے آلۂ کار بنایا جارہا ہے اور میرے ذریعے بنک سے وہ بھاری رقمیں نکلوائی جائیں گی جو صاحبزادے کے اکاؤنٹ میں ہیں۔

حشمت بیگ نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم پھر مجھ پر شبہ کر رہے ہو۔"

"دیکھئے' برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ شبہ کرنے کی بات ہے۔ کیونکہ صاحبزادے کے دستخط کی نقل کرنا' اس کے بنک اکاؤنٹ سے رقمیں نکالنا یہ سب جرم ہے اور میں ایسا کروں گا تو مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں یہ جرم کیوں کر رہا ہوں؟"

"بیٹے' یہ جرم نہیں ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ وہاں میری بھابی کے پاس رہ کر یعنی صاحبزادے کی امی کے پاس رہ کر اس گھر میں زندگی گزارتے ہوئے تمہیں وہاں کے اخراجات بھی پورے کرنے ہوں گے۔ آخر یہ اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے؟"

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ مجھے نیکی کرنا چاہیے۔ میں صاحبزادہ بن کر اس کی امی کی زندگی تو بچالوں گا۔ انہیں زیادہ بیمار ہونے نہیں دوں گا لیکن دستخط کر کے کوئی جرم نہیں کروں گا۔"

"اگر تمہارے دستخط کے ذریعے بھاری رقمیں نکالی جائیں گی اور وہ رقمیں ناجائز کاموں میں لگائی جائیں گی تو تم بیشک دستخط نہ کرنا۔ تم اس گھر میں رہ کر دیکھ لینا کہ اس گھر کے اخراجات کیا ہیں۔ اگر پانچ ہزار روپے ماہانہ اس گھر کے اخراجات ہیں تو تم پانچ ہزار سے ایک روپیہ بھی زیادہ نہ نکالنا خواہ تمہاری امی یا میں یا کوئی بھی کچھ طلب کرے' کچھ زیادہ مانگے تو ہرگز بھی نہ دینا اور اگر تم یہ دیکھ لو کہ اس گھر کے اخراجات پانچ ہزار میں نہیں بلکہ پانچ سو میں پورے ہو سکتے ہیں تو تم پانچ سو روپے سے ایک پیسہ زیادہ نہ دینا۔ یہ سب تمہارے اختیار میں ہو گا۔ ہم تم سے کسی بات کی ضد نہیں کریں گے۔ ہم تو صرف کاروباری ادارے میں جو ہمارے شناسا ہیں۔ انہیں یہ بتانے کے لیے کہ تم وہاں موجود ہو یعنی صاحبزادہ وہاں موجود ہے اور اپنی امی کے زیر سایہ ہے اور اس گھر کے اخراجات برداشت کر رہا ہے اور دفتر کے کام سنبھالے ہوئے ہے۔ ہم صرف دنیا کو دکھانے کے لیے ایسا کریں گے ورنہ تم تو محض نیکی کرنے کے لیے ایک اور امی کے بیٹے بننے کے لیے میرے ساتھ جاؤ گے۔"

وہ بولتا رہا اور میں سنتا رہا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں اس کی باتوں سے قائل ہوتا رہا۔ آخر میں نے کہا۔ "دیکھئے' یہ بہت بڑا کام ہے۔ بڑی ذمہ داریاں آپ مجھے سونپ رہے ہیں۔ پھر یہ کہ پتہ نہیں مجھے اپنی امی سے کتنے دنوں کے لیے جدا ہونا پڑے گا اور ہاں' یہ تو آپ نے بتایا نہیں کہ مجھے کہاں جانا ہو گا۔ کیا اسی شہر میں رہنا ہے؟"

"ہماری رہائش نصیر آباد ہے۔ تمہیں میرے ساتھ وہیں چلنا ہو گا۔"

"نصیر آباد؟" میں نے پریشان ہو کر کہا۔ "وہ تو یہاں سے تقریباً آٹھ سو میل دور ہے۔ میں امی کو چھوڑ کر اتنی دور کیسے جا سکتا ہوں؟"

"بہت سے لوگ دولت کمانے کے لیے ملک سے باہر چلے جاتے ہیں اور برسوں وہاں رہ کر اپنے گھر میں اخراجات کے لیے رقمیں بھیجتے رہتے ہیں۔ اسی طرح تم کر سکتے ہو۔"

"لیکن کوئی بیٹا اپنی ماں کو بیماری میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"بیٹا اگر سعادت مند ہو اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتا ہو تو وہ اپنی ماں کے علاج کی خاطر ہزاروں میل دور جا سکتا ہے تمہیں رقم کی ضرورت ہے۔ کل صبح مجھ سے پانچ ہزار روپے لے کر اپنی امی کو دے دینا۔ اتنی بڑی رقم جب تمہاری امی کے پاس ہو گی تو سمجھ لو کہ وہ بالکل محفوظ رہیں گی۔ انہیں کسی چیز کی کمی نہیں ہو گی۔ پھر تم ہر ماہ جتنی رقم چاہو'

اپنی امی کے پاس بھیجتے رہنا۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

وہ کیا کہہ رہا تھا۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کیونکہ پانچ ہزار کی بات سن کر میرے کان بہرے ہو گئے تھے اور میں آنکھوں کے سامنے صرف سو سو کے نوٹ دیکھ رہا تھا جو کہ میں نے کبھی یکمشت نہیں دیکھے تھے۔ پھر بھی میں نے فوراً ہی ہامی نہیں بھری۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں آج رات بھر سوچوں گا۔ پھر صبح جواب دوں گا۔"

اس نے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بس ایک ہی بستر ہے۔ ہم دونوں کو اس پر گزارہ کرنا ہو گا۔ تم وہاں لیٹ کر رات بھر سوچتے رہو لیکن یہ کپڑے بہت گندے ہیں اور بڑے ہی تھرڈ کلاس ہیں۔ تم انہیں اتار کر ابھی غسل کرو۔ پتہ نہیں کتنے دنوں سے تم نے غسل بھی نہیں کیا ہے۔ میں تمہارے ساتھ سو نہیں سکوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے سوٹ کیس کے پاس گیا اور اس میں سے ایک جوڑا نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میں قد میں تم سے لانبا ہوں اور صحت میں تم سے دوگنا ہوں۔ پھر بھی رات گزارنے کے لیے یہ لباس کافی ہو گا۔ تم غسل کرنے کے بعد اسے پہن لو۔ صبح میں کسی دکان سے تمہارے لیے ریڈی میڈ لباس خرید لوں گا۔"

اس نے ہوٹل کے ملازم کو بلا کر میرے لیے گرم پانی منگوایا۔ جب پانی آگیا تو میں غسل کرنے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد جب میں باتھ روم سے اس کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن کر نکلا تو میرے لیے چائے آگئی تھی۔ اس نے کہا۔ "سردی زیادہ ہے اور تم نے غسل کیا ہے' چائے پی لو۔ ایک کے بجائے دو پیالیاں پیو۔ پھر جب تک چاہے جاگتے رہو اور سوچتے رہو۔ صبح اپنا فیصلہ سنا دینا۔"

میں نے دو پیالیاں چائے پینے کے بعد ایک سگریٹ اس سے طلب کیا۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو مجھ سے سگریٹ لے کر پی لو لیکن جب تم صبح فیصلہ سناؤ گے اور صاحبزادہ بن جاؤ گے تو پھر میرے سامنے کبھی سگریٹ نہیں پیو گے کیونکہ میں تمہارا چچا ہوں اور صاحبزادہ کبھی میرے سامنے سگریٹ نہیں پیا کرتا تھا۔ تمہیں بھی محتاط رہنا ہو گا۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تنہائی سمجھ کر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر سگریٹ پئیں اور کوئی شخص ہمیں دیکھ کر حیران رہ جائے کہ ہم کیسے چچا بھتیجے ہیں۔ دیکھنے والے شبہے میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ وہ سوچ سکتے ہیں کہ تم صاحبزادہ نہیں کوئی اور ہو۔"

"بالکل نہیں' جب میں پوری طرح صاحبزادے کا رول ادا کروں گا تو بھلا کون شبہ

کرے گا۔"

"شبہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ میرے خیال میں صاحبزادہ کبھی سگریٹ نہیں پیتا تھا کیونکہ میں نے کبھی اسے سگریٹ پیتے نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھ سے چھپ کر پیتا ہو۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اگر تم سگریٹ زیادہ نہ پیو تو بہتر ہے اور میرے سامنے تو کبھی اس کا نام ہی نہ لو۔"

میں ایک سگریٹ سلگانے کے بعد بستر پر لیٹ گیا اور سکون سے سوچنے لگا۔ جیسے جیسے میں سوچ رہا تھا ویسے ویسے یقین ہوتا جارہا تھا کہ کوئی فراڈ اس لیے نہیں ہو سکتا کہ بنک اکاؤنٹ کے جتنے چیک ہیں۔ وہ سب میرے پاس رہیں گے اور میں دستخط کیا کروں گا اور میں سوچ سمجھ کر بنک سے رقمیں نکالوں گا۔ کبھی کسی کو ایک پیسہ زیادہ نہیں دوں گا اور اگر میں ایمان داری سے صاحبزادے کا رول ادا کروں گا تو حشمت بیگ میرے ذریعے کوئی اور بے ایمانی نہیں کر سکے گا اور نہ ہی صاحبزادے کی امی کو فریب دے سکے گا۔ اچانک ہی یہ بات میرے دماغ میں آئی کہ صاحبزادے کی جو امی نصیر آباد میں ہے' وہ سوتیلی نہ ہو۔ اگر وہ سوتیلی ہوئیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ بھی حشمت بیگ کے ساتھ مل کر کسی فراڈ میں شریک ہوں۔

یہ خیال آتے ہی میں نے حشمت بیگ سے پوچھا۔ "کیا وہ جو امی ہیں وہ صاحبزادے کی سگی امی ہیں یا سوتیلی؟"

"تمہارے دماغ میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا۔ اچھا میں سمجھا۔ تم ابھی تک اسی پہلو سے سوچ رہے ہو کہ کوئی فراڈ ہو سکتا ہے' ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ تمہیں سوچنے کا حق ہے۔ تم ہر پہلو سے غور کرلو۔ ویسے وہ صاحبزادے کی سگی امی ہیں۔ انہوں نے ہی صاحبزادے کو جنم دیا تھا۔ اس بات کی گواہی وہاں مل جائے گی۔"

میں نے پوچھا۔ "وہاں گواہی کون دے گا؟"

اس نے جواب دیا۔ "یوں تو وہاں ملازم موجود ہیں جو ماں بیٹے کے رشتے کو برسوں سے جانتے ہیں' سب سے اہم ثبوت وہ وصیت نامہ ہے جو صاحبزادے کے والد نے اپنی موت سے قبل لکھا تھا۔ اس وصیت نامہ میں بھی صاحبزادے اور ان کی امی کا خاص طور پر اس طرح ذکر کیا گیا ہے جس سے ان کے سگے رشتوں کا پتہ چلتا ہے' دوسری بات یہ کہ وصیت نامہ لکھنے والا وکیل بھی اس بات کی گواہی دے سکتا ہے۔"

وہ معقول باتیں کر رہا تھا اور ہر قسم کے ثبوت مہیا کرنے کے دعوے کر رہا تھا اب

نصیر آباد پہنچ کر میں ان باتوں کی تصدیق کر سکتا تھا' لہٰذا اس وقت میں مطمئن ہو کر سو گیا۔

دوسری صبح میں اٹھا تو وہ کمرے میں نہیں تھا' اس کا سوٹ کیس وغیرہ رکھا ہوا تھا۔ میں اٹھنے کے بعد باتھ روم میں گیا' پھر وہاں سے واپس آیا تو اس وقت تک بھی وہ واپس نہیں آیا تھا' مجھے تھوڑی دیر اس کے انتظار میں پریشان ہونا پڑا۔ بار بار یہ خیال آتا تھا کہ وہ مجھے ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا ہے اور اب مجھے اس کمرے کا کرایہ دینا ہو گا۔ ہوٹل والے مجھے پکڑیں گے' میں اس کمرے سے باہر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ مجھے ہوٹل والوں سے ڈر لگ رہا تھا۔

مگر یہ سب بے بنیاد خوف تھا' وہ واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا اور اس نے ایک بازو میں کچھ کاغذ کے پیکٹ دبوچ رکھے تھے انہیں لا کر اس نے بستر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ میں نے تمہارے لئے لباس خریدا ہے اسے پہن کر دیکھو۔"

میں نے ایک پیکٹ کھول کر لباس نکالا اور اسے پہن کر دیکھا میرے ناپ کے مطابق ذرا انیس بیس کا فرق تھا اور اتنا فرق چل جاتا ہے۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "بالکل ٹھیک' اب صرف داڑھی بنانے کی ضرورت ہے۔ کسی سیلون میں جا کر شیو کرا لینا اور ہاں یہ مونچھیں بھی منڈوا لینا۔"

میں نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "نہیں' یہ مونچھیں میری امی کو بہت پسند ہیں' میں انہیں صاف نہیں کرا سکتا۔"

"دیکھو' مجبوری ہے۔ تمہیں صاحبزادے کا رول ادا کرنا ہے صرف مونچھیں ہی نہیں منڈوانی ہیں بلکہ اب تمہیں دائیں طرف سے مانگ نکال کر کنگھی کرنی ہو گی۔"

"وہ تو میں کرلوں گا لیکن مونچھیں؟ نہیں' یہ نہیں ہو سکتا۔ ایسی گنجائش نکالی جائے کہ میں مونچھوں کے ساتھ نصیر آباد جاؤں اور وہاں صاحبزادے کی امی مجھے اپنا بیٹا تسلیم کر لیں۔"

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "یہ نہیں ہو سکتا' صاحبزادے کی امی اچھی طرح جانتی ہیں کہ صاحبزادے کو مونچھیں بالکل پسند نہیں تھیں' وہ بالکل کلین شیوڈ رہتا تھا اور تمہیں بھی ایسا ہی رہنا ہو گا۔"

یہ کہہ کر اس نے بریف کیس کو کھولا اور سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ پانچ ہزار روپے ہیں اور یوں سمجھو کہ یہ مونچھیں منڈوانے کا معاوضہ ہے۔"

اتنے سارے نوٹ دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے مونچھیں منڈوانے سے پہلے ہی وہ اپنی جگہ سے جھڑ کر گر چکی ہیں۔ اتنی دولت کے لئے تو آدمی اپنا سر منڈوا کر آدھے منہ پر کالک لگوا کر گدھے پر بیٹھ سکتا ہے، مونچھیں مونڈنا کون سی بڑی بات ہے۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹوں کی وہ گڈی پکڑ لی۔

دوسرے ہی لمحے میرے ہوش اڑ گئے، میں نے گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھا، حشمت کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور ریوالور کا رخ میری طرف تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب تب میں وہ مجھے گولی مار دے گا، میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ "آخر اس کا کیا مطلب ہے؟"

وہ بڑی سفاکی سے بولا۔ "یہ تمہارے لئے ہے اگر تم نے معاہدہ توڑا اور صاحبزادے کی امی کو بیچ منجدھار میں چھوڑا تو میں تمہیں تو قتل نہیں کروں گا لیکن یاد رکھنا کہ تمہاری امی ہمیشہ اس ریوالور کی زد میں رہیں گی، میں تمہاری ماں کو تم سے ہمیشہ کے لئے چھین لوں گا۔"

میں نے لرزتے ہوئے ذرا سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ "آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟"

"ابھی تو دھمکی ہے، اگر تم نے ہمیں دھوکہ دیا اور یہ روپے لے کر فرار ہونے کی کوشش کی تو اس کا برا انجام دیکھو گے۔"

"نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا، میں کیسے بھاگ سکتا ہوں۔ اپنی امی کو لے کر کہاں بھاگ سکوں گا، وہ تو بیمار ہیں، سینی ٹوریم میں ہیں۔"

اس نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں، اسی لئے تو میں تم پر اعتماد کر رہا ہوں کہ تم ابھی جا کر یہ رقم اپنی ماں کو دو گے، اس لئے کہ تمہیں رقم کی ضرورت نہیں ہے۔ جب چاہو گے جتنا چاہو گے میں تمہیں اس وقت تک دوں گا جب تک تم نصیر آباد پہنچ کر صاحبزادے کی جگہ نہیں سنبھال لو گے، اس کے بعد تو تمہارے پاس دولت کی کمی نہیں ہو گی۔"

میں نے پوچھا۔ "میں اپنی امی کو کیا بتاؤں کہ کہاں جا رہا ہوں اور انہیں کیوں چھوڑ رہا ہوں اور کتنے عرصہ کے لئے چھوڑ رہا ہوں۔"

اس نے جواب دیا۔ "یہ بتانا مشکل ہے کہ تم کتنے عرصہ کے لئے صاحبزادے کا رول ادا کرو گے، صاحبزادہ جب بھی واپس آئے گا تم واپس چلے آنا۔ تمہاری امی کو تم مل جاؤ گے اور اس کی امی کو وہ مل جائے گا۔"

"آخر وہ صاحبزادہ گیا کہاں ہے؟"

"یہی ہمیں معلوم ہوتا تو ہم پریشان کیوں ہوتے، پہلے تو ہم نے یہ سوچا کہ وہ بے انتہا دولت مند ہے اس لئے کسی نے اسے اغوا کیا ہے اور ہم سے بڑی رقم کا مطالبہ کیا جائے گا لیکن ایک دو بلکہ چار ماہ گزرنے کے بعد بھی جب کوئی مطالبہ نہیں ہوا تو ہم سمجھ گئے کہ صاحبزادے کی ذہنی رو بہک گئی ہے، ہم اسے چار ماہ سے تلاش کر رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا تم اسے تلاش کرنے کے لئے شہر میں آئے ہو؟"

"ہم نے اس ملک کے ایک ایک گوشے میں اسے ڈھونڈا ہے۔ اس شہر میں آیا تھا کہ تم پر نظر پڑ گئی۔"

اس نے ریوالور کو بریف کیس میں رکھ کر ایک کاغذ پر کچھ لکھا۔ پھر کاغذ کا وہ پرزہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ نصیر آباد کا پتہ ہے۔ تم اپنی امی کو دے دینا تاکہ وہ اس پتے پر خط لکھ سکیں لیکن یاد رکھو کہ یہ وہ پتہ ہرگز نہیں ہے کہ جہاں تمہاری رہائش ہو گی۔ تم صاحبزادے کی امی کے ساتھ رہا کرو گے وہاں اگر تمہاری امی کا خط پہنچا کرے گا تو صاحبزادے کی امی پر سارا بھید کھل جائے گا۔ اس لئے میں احتیاطاً دوسری جگہ کا پتہ دے رہا ہوں۔ اس پتے پر جب بھی تمہاری امی کا خط آئے گا، میں تمہارے پاس وہ خط پہنچا دیا کروں گا۔ اسی طرح تم انہیں وہاں سے خط لکھتے رہو گے اور دونوں ماں بیٹے ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرتے رہیں گے۔ اس طرح تمہیں اطمینان رہے گا۔"

"میں دوبارہ اپنی امی سے کب مل سکوں گا؟"

"جہاں تک ملنے کا تعلق ہے۔ یہ تو تمہاری مرضی پر ہے۔ تم مہینے میں ایک دو بار طیارے کے ذریعے یہاں آسکتے ہو اور امی سے ملاقات کر کے ایک آدھ روز میں واپس جا سکتے ہو۔ صاحبزادے کی امی کو یہ بتایا جاسکتا ہے کہ تم کاروباری دورے پر دوسرے شہر گئے ہوئے ہو۔ یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تمہارے پاس دولت ہو گی تو تم دنیا کے ایک سرے دوسرے تک بھی اپنی امی کے پاس پہنچ سکتے ہو۔"

حشمت بیگ کی اس بات نے مجھے خوش کر دیا۔ میں مطمئن ہو گیا کہ جب کبھی میرا دل چاہے گا۔ میں امی کے پاس ملنے کے لیے آجایا کروں گا۔ میں وہ رقم لے کر سینی ٹوریم کی طرف روانہ ہو گیا۔ حشمت بیگ نے کہا کہ وہ ہوٹل میں ہی میرا انتظار کرے گا اور سینی ٹوریم میں جا کر میری امی کا سامنا نہیں کرے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اکیلے ہی اپنی امی کو ساری باتیں سمجھا کر چلا آؤں۔

☆======☆======☆

سینی ٹوریم کے راستے پر میں ایک سیلون میں رک گیا تھا۔ جب میں وہاں سے سینی ٹوریم اپنی امی کے پاس پہنچا تو وہ مجھے حیرانی سے دیکھنے لگیں کیونکہ میری مونچھیں منڈی ہوئی تھیں اور میں نے دائیں طرف سے مانگ نکالی ہوئی تھی۔ میرا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔ "بیٹے' یہ تم ہو' یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ تم تو پہچانے نہیں جاتے ہو۔"

میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ محبت سے ان کے ہاتھوں کو تھام کر بولا۔ "امی میں آپ کو ایک خوش خبری سنانے آیا ہوں لیکن وہ خوش خبری ایسی ہے کہ کچھ دکھ بھی ہو گا۔"

امی نے میرے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "بیٹا' اگر کوئی خوش خبری تمہارے لیے ہے تو مجھے کوئی دکھ نہیں پہنچے گا۔"

میں نے وہ روپوں کی گڈی نکال کر ان کی طرف بڑھا دی اور ان سے کہا۔ "یہ پانچ ہزار روپے ہیں مجھے ایک جگہ بہت بڑی ملازمت مل گئی ہے اور اس کے لیے مجھے نصیرآباد جانا ہو گا۔"

وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر ہولے ہولے کھانستے ہوئے بولیں۔ "بیٹے' ایسی کیا ملازمت ہے کہ کام شروع کرنے سے پہلے ہی پانچ ہزار روپے مل گئے۔ یہ کوئی معمولی رقم تو ہے نہیں۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "امی میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ اس وقت سے اتنے روپے نہیں دیکھے۔ آپ نے شاید ابا کی زندگی میں دیکھے ہوں۔ ہم اتنے غریب ہیں کہ یہ پانچ ہزار ہمیں بہت زیادہ نظر آتے ہیں لیکن جن لوگوں نے مجھے ملازم رکھا ہے ان لوگوں کے لیے یہ رقم پانچ روپے کے برابر ہے۔ آپ بے فکر رہیں ایسی کوئی اندیشے کی بات نہیں ہے۔"

"بیٹے' اگر کوئی غلط کام نہیں ہے تو تم ضرور جاؤ کیونکہ تمہیں بہت عرصے تک بیروزگار رہنے کے بعد اتنا اچھا موقع مل رہا ہے کہ تم اپنا مستقبل سنوار سکو۔ میری فکر نہ کرو۔ جب اتنی رقم ہے تو میرا اچھا علاج ہو جائے گا اور میں تمہاری خاطر جلد سے جلد صحت یاب ہونے کی کوشش کروں گی اور خوب کھایا کروں گی۔ تمہیں یاد کرتے کرتے تندرست ہو جاؤں گی۔"

"میں اتنی دور جا رہا ہوں مگر آپ فکر نہ کریں' مہینے میں ایک دو مرتبہ ضرور آیا

کروں گا اور آپ سے ملاقات کیا کروں گا۔"

ہم ماں بیٹے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وہ مجھے نصیحتیں کرتی رہیں اور دعائیں دیتی رہیں۔ میں انہیں سمجھاتا رہا کہ انہیں میری طرف سے فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ آخر میں ان سے رخصت ہو کر آگیا۔ جب میں ہوٹل میں پہنچا تو اس وقت تک حشمت بیگ کسی فوٹو گرافر کے ہاں سے صاجزادے کے دستخط کی فوٹو کاپی لے آیا تھا اور وہ فوٹو گراف بڑے سائز کا تھا۔ اس دستخط کی ایک ایک تفصیل نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک دستہ کاغذ بھی لے آیا تھا۔ اس نے ایک قلم میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اب اس دستخط کو دیکھو اور شام تک دستخط کرتے رہو۔ ان سارے کاغذات کو دستخط کرتے کرتے سیاہ کردو۔ مجھے یقین ہے کہ شام تک تم بڑی حد تک اس دستخط کی نقل کرنے لگو گے۔"

میں کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے دستخط کی بڑی سی کاپی رکھی ہوئی تھی۔ میں اسے دیکھ دیکھ کر نقل کرنے لگا۔ شروع میں دشواری ہوتی رہی لیکن میں اس دستخط کی ایک ایک لائن کو اور ایک ایک نقطے کو اور ایک ایک اتار چڑھاؤ کو سمجھتا گیا اور دھیرے دھیرے اس کی نقل کرتا رہا۔ جب تک میں پوری طرح اس کی نقل کرنے میں کامیاب نہ ہو جاتا' اس وقت تک حشمت بیگ مجھے نصیرآباد نہیں لے جا سکتا تھا۔ یہ بات اس نے اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ دستخط نہایت ضروری ہیں۔ اس لیے مجھے بڑی تندہی سے اس کی نقل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

شام تک میں نے بڑی حد تک اس کی نقل کرنا سیکھ لیا۔ حشمت بیگ نے میرے دستخط کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں' یہ اطمینان بخش ہے' بس اب رات کو کھانے کے بعد سونے سے پہلے تک پھر کوشش کرتے رہنا۔ کل دن کو بھی یہ کوشش جاری رہے۔ پھر دوپہر کو میں دیکھوں گا۔ اگر پوری کامیابی ہو جائے اور تم ہو بہو ویسے ہی دستخط کرنے لگو تو پھر کل شام کی فلائیٹ سے ہم نصیرآباد چلے جائیں گے۔"

دوسرے دن میں زندگی میں پہلی بار ہوائی جہاز میں سوار ہوا۔ مجھے عجیب سا لگا اور بہت اچھا لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے واقعی میرے دن پھر گئے ہوں اور میں بہت بڑا آدمی ہو گیا ہوں۔ اتنا بڑا کہ اب ہوائی جہاز میں سفر کرنے لگا ہوں۔ میں نے بڑی حد تک اس دستخط کی نقل کر لی تھی اور حشمت بیگ اس نقل سے مطمئن تھا لیکن میں اندر سے خوف زدہ تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اب بھی کمی رہ گئی ہے اور میرے اور اس کے دستخط میں ایسا فرق ضرور ہے جسے دستخط کے ماہرین پہچان سکیں۔ یہ بات جب میں نے حشمت بیگ سے

کہی تو وہ مسکرا کر بولا۔ "یقیناً تم دونوں کے دستخطوں میں فرق تو ضرور ہو گا جو بظاہر نظر نہیں آ رہا ہے۔ یقیناً ماہرین ہی اس فرق کو پہچان سکتے ہیں لیکن جب ہم بنکوں میں چیک لے کر اس کیش کرانے جاتے ہیں تو وہاں کون سے ماہرین بیٹھے رہتے ہیں۔ دستخط کو بس سرسری طور سے دیکھتے ہیں۔ مطمئن ہوتے ہیں اور رقم ادا کر دیتے ہیں۔ تم اطمینان رکھو۔ تمہیں کوئی بھی جعل ساز نہیں کہہ سکے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "مجھے اپنی نئی ماں کو کیا کہہ کر مخاطب کرنا چاہیے۔"

"ممی۔ صاحبزادہ اپنی ماں کو ممی کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ میں نے دوپہر کو نصیر آباد فون کیا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں تمہاری ممی کو تمہارے آنے کی اطلاع دے دوں انہیں یہ خوش خبری سنا دوں کہ تم مل گئے ہو لیکن۔"

وہ رک کر کچھ سوچنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ "لیکن کیا؟"

"وہ کچھ بیمار ہیں۔ ڈاکٹر نے انہیں دو تین روز تک بستر پر لیٹے رہنے کے لیے کہا ہے اور زیادہ چلنے پھرنے سے منع کیا ہے۔ میں نے سوچا۔ اگر تمہاری آمد کی اطلاع دوں گا تو وہ تمہارے استقبال کے لیے کوٹھی کے باہر تک تو ضرور آئیں گی اور یہ ان کے لیے مناسب نہیں ہے۔"

"کوٹھی میں اور کون لوگ ہیں؟"

"وہاں رشتے داروں میں کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اپنی اپنی کوٹھیوں میں دور دور رہتے ہیں۔ میں ابھی تمہیں رشتہ داروں کے نام اور تم سے جو رشتے ہیں وہ سب بتا دوں گا۔"

مجھے وہ شان و شوکت تو مل ہی چکی تھی لیکن صاحبزادے کا انداز نہیں بن رہا تھا کیونکہ اندر سے میں سہما ہوا تھا۔ میں یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ کوئی جرم نہیں کر رہا ہوں' ایک بیمار عورت کا بیٹا بن کر اس کی زندگی بچا رہا ہوں پھر بھی یہ خوف پتہ نہیں میرے اندر کیوں سمایا ہوا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا اور خدا نہ کرے کہ میں کسی مصیبت میں پھنس جاؤں۔ ایسے ہی خیالات تھے کہ میں پوری آزادی سے اور پورے اطمینان سے وہ انداز اپنا نہیں سکتا تھا جو کہ صاحبزادہ کی خاصیت تھا۔ حشمت بیگ مجھے سمجھاتا جا رہا تھا کہ مجھے کس طرح چلنا چاہیے اور کس طرح زندہ دل نوجوانوں کی طرح کھلنڈرے انداز میں بولنا چاہیے۔ یہ زیادہ مشکل کام نہیں تھا لیکن اس ماحول سے مانوس ہونا پہلے ضروری تھا۔

دو گھنٹے کے بعد ہم نصیر آباد پہنچ گئے۔ حشمت بیگ نے ٹیلیفون پر اپنی آمد کی اطلاع دی تھی اس لیے ڈرائیور کار لے آیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی چونک کر خوشی کا اظہار کیا۔ پھر بڑے ادب سے سلام کیا۔ میں نے بڑے ہی تکبر سے اس کے سلام کا جواب دیا۔ حشمت بیگ نے یہ دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ پھر مجھے آنکھ مار کر انگریزی میں کہا۔ "بہت اچھے۔" پھر اس نے ڈرائیو سے پوچھا۔ "گھر میں کوئی مہمان تو نہیں آیا ہے۔"

ڈرائیور نے اثبات میں سرہلا کر کہا۔ "جی ہاں' جناب' رخسانہ بی بی اپنے والدین کے ساتھ آئی ہوئی ہیں۔ آپ کے آنے کی بات سنی تو وہ لوگ رک گئے ہیں۔"

میں نے دیکھا۔ حشمت بیگ کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ وہ کچھ پریشان ہو کر سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے ڈرائیور سے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ تم کسی ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر آجاؤ۔ میں صاحبزادہ کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں بیٹھ گیا اور اس نے دروازہ بند کیا۔ پھر دوسری طرف سے گھوم کے اسٹیئرنگ سیٹ پر آگیا۔ اس کے بعد کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟"

میں نے انکار میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔"

"بڑی مصیبت ہو گئی۔"

"کیا ہو گیا؟"

"وہ رخسانہ آئی ہوئی ہے۔ اب وہ تم سے کہیں سیر و تفریح کے لیے چلنے کو کہے گی اور تمہیں کار ڈرائیو کرنا ہو گا۔"

"میں انکار کر دوں گا۔"

"انکار کرنے سے بات نہیں بنے گی۔ تم نہیں جانتے۔ وہ تمہاری منگیتر ہے۔"

"کیا؟" میں نے تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔ "میری منگیتر؟"

"ہاں یعنی کہ صاحبزادہ کی منگیتر ہے۔ اس کو تو ہر حال میں خوش رکھنا ہو گا۔ ہم اس کی کسی بات سے انکار نہیں کرتے ہیں اور اس کی ہر خواہش کا احترام کرتے ہیں صاحبزادہ بھی یہی کیا کرتا تھا اور تم بھی یہی کرو گے۔"

"لیکن میں کار کیسے ڈرائیو کروں گا۔"

"کوئی بات نہیں' ابھی تو بہانہ کر دیا جائے گا کہ تم تھکے ہوئے ہو اور اس قدر بیمار

تھے کہ ڈاکٹر نے کار وغیرہ چلانے سے منع کیا ہے۔ میں تمہیں دو تین روز میں ڈرائیونگ سکھادوں گا اور لائسنس تو صاجزادہ کا رکھا ہی ہوا ہے۔"

"رخسانہ کے متعلق کچھ بتایئے۔"

وہ کچھ سوچنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ہچکچارہا ہے۔ پھر اس نے جلد ہی اپنی ہچکچاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اس کے متعلق کیا بتاؤں۔ وہ ایک خوبصورت اور اسمارٹ لڑکی ہے۔ اس کے باپ کی تمام دولت جائیداد اور کاروبار تمہیں ملنے والا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"ایسے کہ اس کا باپ شوگر کا مریض ہے۔ ہمیشہ بیمار رہتا ہے۔ کاروبار سنبھالا نہیں جاتا۔ ان لوگوں کی ضد ہے کہ جلد سے جلد شادی کی جائے تاکہ کاروبار تمہارے حوالے کیا جاسکے۔"

"کیا وہ شادی کی بات کرنے آئے ہیں؟"

"ہاں' میں سمجھ گیا ہوں کہ وہ یہی بات چھیڑیں گے۔"

"پھر کیا ہوگا؟ میری شادی تو رخسانہ کے ساتھ ہو نہیں سکتی۔"

حشمت بیگ نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ پھر مسکرا کر کہا۔ "ہاں' ٹھیک ہے نہیں ہو سکتی لیکن ہم ابھی رخسانہ کے والد کو ٹالنے کی کوشش کریں گے۔ ہماری پوری کوشش یہی ہے کہ صاجزادہ جلد از جلد واپس آجائے۔ ہم اسے تلاش کرنے کے سلسلے میں ذرا بھی کوتاہی سے کام نہیں لے رہے ہیں۔ ہر جگہ ہمارے آدمی پھیلے ہوئے' ہیں اور اسے بڑی تندہی سے تلاش کیا جارہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ جلد ہی مل جائے گا۔ پھر اس کے ساتھ رخسانہ کی شادی کردی جائے گی۔"

"آپ اپنے بیوی بچوں کے متعلق کچھ بتائیں۔"

"میری بیوی مرچکی ہے۔ دس برس ہوگئے۔ میں نے پھر دوسری شادی نہیں کی۔ میری ایک جوان بیٹی شکیلہ تھی جس کی شادی ہوگئی ہے اور اب وہ میری ہی کوٹھی میں رہتی ہے اور میں تمہارے ہاں یعنی صاجزادہ کے یہاں رہتا ہوں۔"

"آپ اپنی کوٹھی چھوڑ کر وہاں کیوں رہتے ہیں؟"

"میری بیٹی سے کچھ ناراضگی ہے۔ اس نے اپنی مرضی سے شادی کی ہے۔ میں نے وہ کوٹھی اس کے حوالے کردی اور اسے چھوڑ کر تمہارے ہاں چلا آیا۔ اب یہیں رہتا ہوں۔"

باتوں کے دوران راستہ کیسے گزر گیا۔ کچھ پتہ نہ چلا کہ کتنے فاصلے پر وہ کوٹھی ہے۔ ہم کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئے تو کار کی آواز سن کر ایک ملازم باہر آیا۔ کار پورچ میں کھڑی ہوئی تو اس نے ادب سے ہمارے لیے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور سلام بھی کیا' میں سر کے اشارے سے جواب دیتا ہوا کار سے اتر کر برآمدے میں پہنچ گیا۔ اسی وقت ایک نہایت ہی حسین اور اسمارٹ لڑکی تیزی سے چلتی ہوئی باہر آئی۔ مجھے دیکھتے ہی پہلے تو ٹھٹک گئی۔ پھر خوش ہو کر تقریباً چیختے ہوئے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ "صاجزادہ کیا تم ہو۔ تم آگئے۔ مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ آخر چار ماہ تک کہاں گم رہے تھے۔"

میں نے اپنی اندرونی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے اور زندہ دلی کو کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے منہ سے صاجزادہ اچھا نہیں لگتا۔ بڑی بوڑھیوں کو صاجزادہ کہنا چاہیے۔"

یہ بات سنتے ہی حشمت بیگ نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور کہا۔ "دیکھو لو' رخسانہ صاجزادے کی زندہ دلی نہیں گئی۔ اب بھی کیسے جواب دے رہے ہیں۔"

رخسانہ نے ایک ادائے ناز سے بل کھاتے ہوئے کہا۔ "جی نہیں' ابھی میں وہی حربہ استعمال کروں تو ان کی چیخیں نکل جائیں گی۔ ساری زندہ دلی بھول جائیں گے۔"

حشمت بیگ ایک دم سے گھبرا کر کبھی مجھے اور کبھی رخسانہ کو دیکھنے لگا۔ پھر جلدی سے بولا۔ "دیکھو' پلیز رخسانہ' وہ چیخنے والی باتیں یاد نہ دلانا۔ ابھی صاجزادے آئے ہیں۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ انہیں کچھ باتیں یاد نہیں رہتیں۔ وقتی طور پر بھول جاتے ہیں اور یہ اس وقت وہ بات بھولے ہوئے ہیں۔ پلیز جب یہ ہنس بول رہے ہیں تو تمہیں بھی ایسی ہی باتیں کرنی چاہئیں۔" یہ کہہ حشمت بیگ نے میرے بازو کو پکڑ لیا۔ پھر رخسانہ سے بولا۔ "میں ابھی صاجزادہ کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اتنے دنوں بعد آئے ہیں نا۔ اس لیے پہلے ان کی ممی سے ملاقات کرادوں۔"

یہ کہہ کر وہ مجھے تقریباً کھینچتے ہوئے رخسانہ کے پاس سے لے گئے۔ ڈرائنگ روم میں اس کے والدین بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک بوڑھا آدمی تھا جو نہایت دبلا پتلا تھا اور دور سے ہی مریض نظر آتا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا۔ "آہا' صاجزادے تم آگئے۔"

اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت بھی اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ میں نے انہیں سلام کیا' وہ دونوں مجھے دعائیں دینے لگے۔ حشمت بیگ کو کسی بات

کی جلدی تھی۔ وہ اندر سے بہت ہی بے چین ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”جناب‘ آپ لوگ تشریف رکھیں۔ چونکہ صاحبزادے بہت دنوں بعد آئے ہیں۔ میں انہیں ابھی ان کی ممی سے ملاتا ہوں اس کے بعد یہ آپ سے اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

ان دونوں نے مجھے ممی سے ملنے کی اجازت دے دی۔ حشمت بیگ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر ڈرائنگ روم کو عبور کرتے ہوئے وہاں سے باہر آئے۔ پھر دوسرے کمرے میں پہنچتے ہی میرا ہاتھ دبا کر آہستگی سے بولے۔ ”بھئی بڑی مصیبت ہے۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ وہ چیخنے والی بات تمہیں بتادوں۔“

”میں خود سوچ رہا ہوں کہ آخر ایسی کیا بات ہے۔ رخسانہ ایسا کون سا حربہ استعمال کرتی ہے کہ صاحبزادہ چیخنے لگتا ہو گا۔“

”وہ ایسے ویسے نہیں چیختا بلکہ اس پر تو دیوانگی طاری ہو جاتی ہے۔ ایسی فلک شگاف چیخیں اس کے حلق سے نکلتی ہیں۔ اس کا منہ کھل جاتا ہے اور اس کی آنکھوں سے‘ چہرے سے ایسی وحشت برسنے لگتی ہے کہ اس کی ممی تو دیکھ نہیں سکتیں۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اس پر چیخنے کا دورہ نہ پڑے۔ اسی لیے ہم گھر کے ایک ایک کونے کی صفائی کرواتے ہیں تاکہ کہیں سے کوئی چھپکلی نظر نہ آئے۔“

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”چھپکلی؟ کیا صاحبزادہ چھپکلی سے ڈرتا ہے؟“

”ہاں‘ اسے اس جانور کو دیکھ کر بڑی گھن آتی ہے اور پتہ نہیں بچپن سے اس کے دماغ میں ایسا کیا خوف سما گیا ہے کہ چھپکلی کو دیکھتے ہی بے تحاشا چیخنے لگتا ہے اور اس وقت تک چیختا رہتا ہے جب تک کہ اس پر بے ہوشی طاری نہیں ہو جاتی۔“

”اچھا تو رخسانہ صاحبزادہ کو چھپکلی سے ڈراتی ہے۔“

”ہاں‘ اس نے ایک ربڑ کی چھپکلی بنوا رکھی ہے۔ جب کبھی اس سے جھگڑا ہوتا ہے تو وہ چھپکلی کو درمیان میں لے آتی ہے اور صاحبزادہ بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ پھر ٹیلیفون کے ذریعے صلح کرلیتا ہے اور رخسانہ سے شکست تسلیم کرلیتا ہے۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا تو رخسانہ چلی آرہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”انکل آپ صاحبزادہ کو یوں کھینچ کر لے آئے جیسے میں ان پر ہی حملہ کرنے والی ہوں۔ بھئی ہمارے درمیان کوئی دشمنی تو ہے نہیں۔ اگر ناراضگی ہو گی تو پھر دیکھا جائے گا۔ ابھی تو دوستی ہے۔ میں انہیں ان کی ممی کے پاس لے چلتی ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ حشمت بیگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہاں ٹھیک ہے‘ چلو ہم سب چلیں۔“

ہم تینوں اس کوٹھی کے مختلف کوریڈورز سے گزرتے ہوئے ایک بہت بڑی خواب گاہ میں داخل ہوئے۔ اس خواب گاہ کی سجاوٹ اور قیمتی سامان دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک بڑے سے پلنگ پر ایک ادھیڑ عمر کی خاتون لیٹی ہوئی تھیں۔ دروازے کی طرف انہوں نے دیکھا تو مجھے دیکھتے ہی ایک دم سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ چیخ کر بولیں۔ ”میرے بچے‘ تم آگئے۔“

حشمت بیگ نے جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”دیکھئے بھابی بس اب اٹھنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ ڈاکٹر نے آپ کو سختی سے چلنے پھرنے کے لیے منع کیا ہے۔ آپ کا بیٹا آپ ہی کے پاس آرہا ہے۔“

اس دوران میں تیزی سے چلتا ہوا اُن کے بیڈ کے قریب پہنچ گیا تھا اور ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میری سمجھ میں اس وقت یہ نہیں آرہا تھا کہ ایک ماں سے کس طرح محبت کا اظہار کروں۔ کیا اسی طرح جس طرح ایک غریب عبدالعلیم اپنی غریب ماں سے کیا کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ امیروں کے گھر میں ماں بیٹے کی محبتوں کے اظہار کچھ اور قسم کے ہوں۔

ہاتھ پکڑتے ہی انہوں نے مجھے کھینچ کر گلے لگا لیا تھا اور پھر میری پیشانی چوم کر کہنے لگیں۔ ”تم کہاں چلے گئے تھے بیٹے‘ یہ تمہاری یادداشت کو کیا ہو جاتا ہے۔ تم اب گھر سے باہر نہ نکلا کرو۔ میں بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو یہاں تمہارے لیے مقرر کروں گی۔ وہ تمہارا علاج کرے گا۔“

حشمت بیگ نے کہا۔ ”بھابی‘ آپ کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ چار مہینے تک غیر حاضر رہنے کے بعد صاحبزادہ کی ذہنی حالت قدرے بہتر ہو گئی ہے۔ اب یہ پہلے کی طرح تمام باتیں نہیں بھولتے ہیں۔“

رخسانہ نے تڑ سے جواباً کہا۔ ”واہ‘ کیسے نہیں بھولتے ابھی تو ایک بات بھول گئے تھے۔ وہی چیخنے والی۔“

ممی نے نے گھور کر رخسانہ کو دیکھا۔ پھر جلدی سے اپنے چہرے پر محبت سمیٹ کر بولیں۔ ”نہیں‘ بیٹی ایسے موقع پر ایسی باتیں یاد نہ دلاؤ‘ تکلیف دہ باتوں کو بھول جانا ہی بہتر ہے۔“

حشمت بیگ نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ صاحبزادہ کو اب تھوڑی دیر آرام کرنے کا

موقع دیا جائے۔ یہ تھکے ہوئے ہیں۔ غسل سے فارغ ہونے کے بعد لباس وغیرہ تبدیل کرکے جب باہر آئیں گے تو ڈنر کا وقت ہو چکا ہو گا۔ اس وقت پھر ہم سب مل کر ایک جگہ بیٹھیں گے اور باتیں کریں گے۔"

ممی نے کہا۔"میرا دل تو نہیں چاہتا کہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو اب اپنی نظروں سے دور کروں لیکن یہ تو دوسرے کمرے میں ہی جانے والی بات ہے۔ اس لیے میں اجازت دیتی ہوں"۔ پھر وہ رخسانہ سے بولیں۔"بیٹی' اب تو صاجزادہ آگیا ہے۔ اب اتنی جلدی واپس نہ جانا۔ اپنی امی اور ابو سے کہو کہ رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔ اچھا وقت گزرے گا۔"

"میں کیسے روک سکتی ہوں۔ ابھی تو یہ میرا گھر نہیں ہوا ہے کہ میں اپنی مرضی سے اپنے والدین کو روکوں۔ آپ کو یا انکل کو جاکر میرے والدین سے کہنا چاہیے۔"

حشمت بیگ نے وہاں سے جاتے ہوئے کہا۔"ہاں' یہ ٹھیک ہے میں ابھی ان سے جا کر کہتا ہوں۔"

وہ چلا تو گیا لیکن یہ بھول گیا کہ مجھے وہ کمرہ دکھانا ہے کہ صاجزادہ کس کمرہ میں رہا کرتا تھا۔ وہ بہت بڑی کوٹھی تھی۔ وہاں بے شمار کمرے تھے۔ یہ سمجھنا کہ میرا کمرہ کون سا ہو گا۔ بڑی مشکل بات تھی۔ میں الجھن میں پڑ گیا۔

ممی نے میرے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔"کیا بات ہے بیٹے' کیا تم مجھے چھوڑ کر اپنے کمرے میں نہیں جانا چاہتے۔"

میں نے فوراً ہی مسکرا کر کہا۔"ہاں' ممی آپ کو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ پتہ نہیں' مجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں یہاں سے چلا گیا تھا۔ بہر حال اب اپنے کمرے میں جا کر غسل تو کرنا ہی ہو گا۔ لباس بھی تبدیل کرنا ہو گا پھر میں جلدی آجاؤں گا۔"

یہ کہہ کر میں وہاں سے اٹھ گیا۔ رخسانہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ اب میں سوچنے لگا کہ اس کمرے سے نکل کر کدھر چلنا چاہیے۔ یہ خیال آیا کہ صاجزادہ کے کمرے میں اس کی تصویر ضرور ہوگی یا پھر حسین عورتوں کی تصویریں ہوں گی۔ یعنی وہ کمرہ ایسا ہو گا جس سے پتہ چل جائے کہ وہ کسی نوجوان کا کمرہ ہے یا اگر وہ سنجیدہ ہوا تو پڑھنے کی کتابیں ضرور ہوں گی۔

کمرے سے نکل کر ممی کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی رخسانہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر ایک طرف کھینچ کرلے جانے لگی۔ میں نے سوچا شاید یہی میرے کمرے کی طرف

رہنمائی کرے گی۔ میں چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگا لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ وہ مجھے ایک ٹی وی لاؤنج میں لے آئی۔ وہاں مجھے دھکا دے کر ایک صوفے پر گراتے ہوئے پوچھا۔"اب یہاں کوئی نہیں ہے' سچ سچ بتادو کہ چار مہینے تک کہاں غائب رہے۔ میرے ابو اور امی کا خیال ہے کہ تم مجھے پسند نہیں کرتے ہو۔ کوئی دوسری لڑکی تمہارے دل میں سماگئی ہے اور تم اسی کی وجہ سے یہ گھر چھوڑ کر چلے گئے ہو"۔

میں نے کہا۔"تمہارے والدین غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں صرف تمہیں چاہتا ہوں۔ میرے جانے کی وجہ بس صرف اتنی سی ہے کہ میں اس وجہ کو خود نہیں سمجھ سکتا۔ بس ذہنی رو بہک گئی تھی اور میں چلا گیا تھا"۔

وہ بولی۔"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا دماغ کیسے کمزور ہو گیا ہے۔ پہلے تو تم بالکل ٹھیک تھے۔ چار ماہ پہلے تمہاری ممی نے اور انکل نے مجھے بتایا کہ تمہارا دماغ کچھ کمزور ہوتا جارہا ہے اور تم اکثر کوئی نہ کوئی بات بھول جاتے ہو۔ میں نے یہ سن کر زیادہ توجہ نہیں دی تھی لیکن میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تمہارا دماغ اتنا بہک جائے گا کہ تم گھر چھوڑ کر بلکہ مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔"

میں نے بے بسی سے کہا۔"میں مجبور تھا۔ دیکھو' رخسانہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

اسی وقت حشمت بیگ کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔"رخسانہ' میں نے تمہارے والدین کو راضی کر لیا ہے وہ اب رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گے۔ صاجزادے کو اپنے کمرے میں جاکر غسل کرنے دو۔ پھر تم دونوں اطمینان سے باتیں کرتے رہنا۔"

میں صوفے پر سے اٹھ گیا۔ رخسانہ صوفے پر بیٹھ گئی' جیسے حشمت بیگ کی مداخلت ناگوار گزاری ہو' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔" میں ابھی واپس آجاؤں گا۔"

یہ کہہ کر میں حشمت بیگ کے ساتھ چلتا ہوا ایک کوریڈور سے گزرنے لگا۔ حشمت بیگ نے آہستگی سے کہا۔"دراصل مجھے یاد آگیا تھا کہ ابھی تمہارے کمرے تک رہنمائی کرنا ہو گی۔ ورنہ تمہیں تو اپنا کمرہ بھی معلوم نہیں ہے۔ اسی لیے میں چلا آیا ہوں۔"

حشمت بیگ میرے ساتھ چلتا ہوا ایک کمرے کے دروازے پر آیا۔ پھر آہستگی سے بولا۔"یہی ہے وہ کمرہ' اندر جاؤ اور میں نے جو کپڑے وہاں خرید کر دیے تھے۔ انہی میں سے کوئی پہن لینا۔ صاجزادہ کا لباس کچھ نہ کچھ ڈھیلا ہو گا کیونکہ وہ صحت مند تھا اور تم ذرا

دبلے ہو۔"

میں دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ وہاں تنہائی میں' میں نے اس کمرے کو بڑے غور سے دیکھا۔ چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ وہاں ایک بڑا سا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ دیوار پر کتابوں کی الماریاں تھیں۔ میں سمجھتا تھا کہ کوئی شوخ مزاج ہو گا۔ کمرے میں حسیناؤں کی تصویریں ہوں گی لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی۔ بہت ہی صاف ستھرا بیڈ روم تھا اور اس کمرے سے صاجزادہ کے ستھرے مذاق کا پتہ چلتا تھا۔

اس وقت میرے دماغ میں کتنی ہی باتیں اور کتنی ہی سوچیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ میں وہاں صاجزادے کا رول ادا کر رہا تھا۔ اس لیے اندر ہی اندر خوف زدہ تھا کہ کہیں کسی غلطی کی وجہ سے پکڑا نہ جاؤں۔ دوسری بات یہ کہ رخسانہ مجھے پہلی ہی نظر میں متاثر کر چکی تھی۔ وہ مجھے اچھی لگ رہی تھی۔ اس کا باتیں کرنے کا انداز' اس کا مسکرانا' اس کا میرے ساتھ چلنا۔ پھر بے تکلفی سے مجھے دھکا دے کر صوفے پر گرا دینا اور بالکل اپنائیت کا اظہار کرنا۔ یہ ایسی باتیں تھیں کہ مجھے پہلے نصیب نہیں ہوئی تھیں۔ اگر آج میں فٹ پاتھ پر چلتا رہتا۔ میرے بدن پر لنڈے بازار کے کپڑے ہوتے اور اُدھر سے کہیں رخسانہ اپنی کار میں گزرتی ہوتی تو کیا مجھے دیکھ کر اسی طرح عاشق ہو جاتی یا اپنائیت کا اظہار کرتی' نہیں' یہ سب دولت کے کھیل تھے۔ تقدیر مجھے ایسے مقام پر لے آئی تھی کہ جہاں سے دولت ہی نہیں ایک اچھی' خوب صورت' اسمارٹ لڑکی کا پیار بھی مجھے مل رہا تھا۔

یہ سب کچھ پانے کے باوجود میرا ضمیر مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ کیا میں ان چیزوں کو ہمیشہ کے لیے اپنا سکتا ہوں۔ یہاں جو دولت ہے وہ ہمیشہ میری نہیں رہے گی اور یہاں جو رخسانہ ہے' اسے بھی میں ہمیشہ کے لیے نہیں اپنا سکوں گا۔ کیونکہ وہ مجھے نہیں' صاجزادہ کو چاہتی ہے اور وہ صاجزادے کی منگیتر ہے اور اسی سے شادی ہونے والی ہے' میں تو ایک ڈمی ہوں۔ بس' تھوڑی مدت کے لیے یہاں لایا گیا ہوں' اس کے بعد شطرنج کے مہرے کی طرح بساط سے ہٹا کر دور رکھ دیا جاؤں گا۔

☆======☆======☆

صبح میں نے غسل کیا تھا۔ اس وقت یہ سوچا کہ غسل کرنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس کمرے کی تلاشی لینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ صاجزادہ کے متعلق کوئی اور ایسی بات میرے سامنے آئے۔ جس کی مدد سے میں صاجزادے کا رول اور اچھی طرح ادا کر سکوں یا یہاں کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کرلوں۔ یہ سوچ کر میں نے دروازے

کو اندر سے بند کر دیا۔ پھر اس کی الماری کھول کر ایک ایک دراز میں رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھنے لگا۔

وہاں بہت کچھ تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی جو میری معلومات میں اضافہ کرتی۔ میں نے شوکیس میں رکھی ہوئی کتابوں کو بھی اِدھر سے اُدھر اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر الماری کے پاس آکر میں نے ایک جوڑا کپڑا نکالا اور اسے پہن کر آزمایا تو وہ کسی قدر میرے بدن پر ٹھیک ہی تھا لیکن صحت کا فرق تھا۔ میں فاقے کرنے والا فٹ پاتھ پر زندگی گزارنے والا ذرا دبلا پتلا تھا اور صاجزادہ یقیناً صحت مند ہو گا کچھ عرصے کے بعد جب میں یہاں رہ کر موٹا ہو جاؤں گا تو شاید یہ کپڑے مجھ پر فٹ آئیں گے۔

میں نے ان کپڑوں کو رکھ دیا۔ پھر اپنے بیگ میں سے ایک جوڑا کپڑا نکال کر اسے پہن لیا۔ میں اس کمرے میں ایک گھنٹہ گزار چکا تھا اور اس ایک گھنٹے میں مجھے غسل سے فارغ ہو کر لباس تبدیل کر لینا تھا۔ سو میں نے کر لیا۔ پھر وہ لباس پہن کر باہر آگیا۔ رخسانہ اسی طرح ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔ "کیا تم ابھی تک یہیں پر ہو؟"

وہ دوسری طرف منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا ناراض ہو' مجھ سے کیا غلطی ہو گئی؟"

"کچھ نہیں' بس مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم کچھ اجنبی اجنبی سے ہو۔ پہلے جیسی بات نہیں ہے۔"

"مجھے بتاؤ کہ پہلے جیسی بات کیسی ہونی چاہیے۔ اگر میں اس پر عمل نہ کروں۔ تب ناراض ہو جانا۔"

وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ "تم نے ابھی تک مجھ سے یہ نہیں کہا کہ چلو' ہم باہر آؤٹنگ کے لیے جائیں۔ یہاں تو اتنے رشتہ داروں میں تنہائی میسر نہیں ہو گی۔ ہم اپنے دل کی باتیں نہیں کہہ سکیں گے۔ تم ڈرائیو کرتے رہنا۔ میں تمہارے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہوں گی۔ بہت ساری باتیں کروں گی۔ تم جب یہاں سے چلے گئے تھے تو میں تمہارے بارے میں بہت سوچتی تھی۔"

"مثلاً کیا سوچتی تھیں؟"

وہ نظریں جھکا کر بولا۔ "یہی کہ تم تنہائی میں مجھے بہت پریشان کرتے تھے۔ تم شادی سے پہلے شوہر بننا چاہتے تھے اور میں انکار کر دیتی تھی۔"

"ہاں‘ یہ تو مجھے یاد آرہا ہے۔ تم اتنی حسین ہو۔ اتنی پُرکشش ہو کہ ہر مرد تمہاری خواہش کرے گا۔"

وہ میٹھی ناراضگی سے بولی۔ "پھر آگئے اپنی اوقات پر دیکھو۔ میں پہلے بھی تم سے کہہ چکی ہوں اور جب تک شادی نہیں ہوگی اس وقت تک یہی کہتی رہوں گی کہ عورت کے پاس ایک ہی سب سے عزیز ترین پونجی ہوتی ہے اور وہ پونجی وہ صرف اپنے شوہر کے حوالے کرتی ہے۔ اس سے پہلے اگر کوئی اس سے ایسی باتیں کرے تو یہ اس کی توہین ہے خدا کے لیے آئندہ ایسی باتیں نہ کرنا۔ میں تمہاری ہوں اور تمہاری ہی رہوں گی۔ شادی کرکے دیکھ لو۔ اگر میں تمہارے ہر حکم پر سر نہ جھکاؤں تو پھر جو چاہو مجھے سزا دے لینا۔"

اس کی باتیں سن کر دل کو بڑا اطمینان ہوا کہ وہ عام ماڈرن لڑکیوں کی طرح بے حیا نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی کو بوائے فرینڈ بناتی ہے۔ صاحبزادہ کو اپنا سب کچھ بتایا تھا لیکن اس پر اپنا سب کچھ نچھاور نہیں کیا۔ یہ غلطی اس نے نہیں کی بلکہ اپنے شوہر کے انتظار میں رہی۔ خواہ وہ شوہر صاحبزادہ ہوتا یا کوئی اور۔

ہم ڈائننگ روم میں گئے تو وہاں کھانا لگ چکا تھا لیکن وہاں صرف میں اور رخسانہ ہی تھے۔ ملازم نے بتایا۔ "مالکن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے رخسانہ بی بی کے والدین ان کے کمرے میں کھانا کھائیں گے۔ وہ لوگ یوں بھی وہاں تنہائی میں کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

یہ کہہ کر ملازم مسکراتا ہوا جانے لگا۔

میں نے کھانے کی پلیٹ اپنی طرف سرکاتے ہوئے رخسانہ سے پوچھا۔ "یہ ملازم کیوں مسکرا رہا ہے؟"

وہ بولی۔ "اب ایسے نادان بھی نہ بنو۔ بھئی تمہاری ممی کے کمرے میں ہماری شادی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ میری امی اور ابو آج یہ طے کرکے آئے ہیں کہ شادی کی تاریخ جلد سے جلد مقرر کی جائے اگر تم آج واپس نہ آتے تو یہ بھی انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ یہ بات ختم کردیں گے۔ پتہ نہیں تم کبھی واپس آؤ گے یا نہیں آؤ گے۔ وہ مجھے کب تک گھر میں بٹھا کر رکھ سکتے ہیں‘ خدا کا شکر ہے کہ تم آگئے۔"

کھانے کے دوران میں سوچنے لگا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ میں تو بے اختیار رخسانہ کی طرف بہتا جا رہا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ میری اوقات کیا ہے اور میں رخسانہ کے قابل ہوں یا نہیں۔ اگر یہ بھید کھل جائے گا تو کیا رخسانہ مجھے کبھی قبول کر سکے گی۔ وہ تو مجھے

دھکے دے کر اپنی کوٹھی سے اور اپنی زندگی سے نکال دے گی۔ مجھے اپنی حیثیت سے بڑھ کر نہیں سوچنا چاہیے۔

کھانا کھانے کے بعد ہم آدھے گھنٹے تک باغیچے میں ٹہلتے رہے۔ کبھی وہ میرا ہاتھ تھام لیتی تھی۔ کبھی میں اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام سبز گھاس پر اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگتا تھا۔ میں نے کہا۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے کار ڈرائیو کرنے سے منع کیا ہے۔ انشاء اللہ دو چار روز کے بعد پھر میں ڈرائیونگ کرنے لگوں گا تو ہم کہیں گھومنے کے لیے جائیں گے۔ اس وقت تک کے لیے برا نہ منانا۔"

وہ مسکراتی رہی اور رخصتی کے وقت بھی میری طرف بار بار دیکھتی رہی۔ پھر وہ اپنے والدین کے ساتھ چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد حشمت بیگ نے کہا۔ "اپنی ممی کے کمرے کی طرف چلو۔ وہاں ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"وہ ضروری باتیں کیا ہیں‘ آپ مجھے یہیں بتادیں تاکہ میں تیار ہو کر ممی کے پاس جاؤں۔"

اس نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "ٹھیک ہے پہلے ہمارے درمیان بات ہونا چاہیے آؤ ہم یہاں بیٹھیں۔"

ہم وہاں سے چلتے ہوئے لان میں بچھی ہوئی کرسیوں پر آکر بیٹھ گئے۔ پھر اس نے کہا۔ "تمہیں صاحبزادہ بنا کر یہاں لاتے وقت میں نے وہ نہیں سوچا تھا جو اب یہاں ہونے والا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا ہونے والا ہے؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "تمہاری شادی رخسانہ سے ہونے والی ہے۔"

"نہیں‘ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اپنی امی سے مشورہ کیے بغیر ایسا نہیں کر سکتا۔"

"تمہاری امی اب تم سے سینکڑوں میل دور ہیں۔ یہاں جو تمہاری ماں ہے وہی تمہیں مشورہ دے رہی ہے اور اسی کی مرضی سے یہ ہو رہا ہے۔ میں تو انہیں سمجھا رہا تھا کہ وہ جلد بازی نہ کریں لیکن وہ کہتی ہیں کہ تمہارے پاؤں میں زنجیریں ڈالنے کے لیے یہی مناسب ہے کہ جلد سے جلد تمہاری شادی کر دی جائے تاکہ آئندہ تم گھر چھوڑ کر کہیں نہ جا سکو۔"

"وہ اگر ایسا سوچتی ہیں اور ایسا چاہتی ہیں تو میں کیا کروں۔ میں تو اپنی امی سے مشورہ کیے بغیر ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔"

"تمہارا نقصان بھی کیا ہے۔ رخسانہ اتنی خوبصورت ہے' اتنی دولت مند ہے کہ تمہاری امی یقیناً اسے بہو بنانے میں فخر محسوس کریں گی۔"

"وہ بعد میں فخر محسوس کریں گی مگر پہلے تو میرا فرض ہے کہ میں انہیں اپنی پسند سے آگاہ کروں۔ رخسانہ سے ملاقات کراؤں۔ وہ دیکھیں گی۔ اپنی رضامندی ظاہر کریں گی پھر مجھے شادی کرنے میں انکار نہیں ہو گا۔"

"دیکھو صاحبزادے اس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ اپنا مستقبل بنانے کا سب کو حق پہنچتا ہے۔ جب تم ایک شاندار مستقبل بناؤ گے اور دولت مند بن جاؤ گے تو تمہاری امی کو ذرہ برابر بھی انکار نہیں ہو گا۔ اس بات کو سمجھو اور جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں۔ اس پر عمل کرتے جاؤ۔"

"آپ کے کہنے کے مطابق میں یہاں بیٹا بن کر چلا آیا۔ میں انہیں ماں سمجھ رہا ہوں۔ ممی کہہ رہا ہوں۔ میں انہیں ایک نئی زندگی دینا چاہتا تھا لیکن ایک دل کی مریضہ کو ماں بنانے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں ان کی مرضی سے شادی بھی کرلوں۔"

"میں پوچھتا ہوں۔ آخر انکار کیوں ہے؟"

"اور میں کہتا ہوں کہ انکار کیوں نہ ہو۔ یہ شادی ہے ساری زندگی کا رشتہ ہے۔ کوئی کھیل تو نہیں ہے۔"

"تم اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ بتاؤ کہ کیا رخسانہ اس قابل نہیں ہے کہ ساری زندگی تمہاری شریک حیات ہی رہے اور تم اس کے ساتھ ایک اچھی ازدواجی زندگی گزار سکو۔ کیا تم ایسا نہیں سمجھتے ہو۔"

"میں سمجھتا ہوں۔"

"پھر تمہیں کیا انکار ہے؟"

"میں اب کیسے سمجھاؤں کہ کیا انکار ہے۔ بس میں اتنا جانتا ہوں کہ میں نے اپنی امی کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کیا اور یہ تو بہت بڑا کام ہے۔"

وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "اچھا۔ ایسا کرو کہ فوراً ہی انکار نہ کرو۔ ابھی اپنی ممی کے پاس جاکر ان سے باتیں کرو۔ وہ جو کہتی ہیں' اسے مانتے جاؤ پھر آج رات بھر ٹھنڈے دماغ سے غور کرنا اور رخسانہ کو تصور میں لاکر دیکھنا کہ اس میں کس بات کی کمی ہے اور تم اسے چھوڑ کر کیا ایسی حماقت کر سکتے ہو کہ اتنی دولت اور شاندار مستقبل سے ہاتھ دھو بیٹھو۔ یہ ساری باتیں تمہارے غور کرنے کے لیے ہیں اور اس سلسلے میں تمہیں فوراً ہی کوئی فیصلہ

نہیں سنانا چاہیے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

میں اس کے ساتھ ممی کے پاس گیا۔ وہاں میں ایک گھنٹے تک ان کے ساتھ سر کھپاتا رہا۔ وہ اپنی کہتی رہیں میں اپنی سناتا رہا۔ آخر مجھے اس بات کا خیال رکھنا تھا کہ وہ دل کی مریضہ ہیں اور ان کے دل کو ٹھیس نہیں پہنچانا ہے۔ لہٰذا میں ان کا دل رکھنے کے لیے ان کی بات مان کر اپنی خواب گاہ میں واپس آگیا۔ وہاں تنہائی میں' میں نے سوچا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں تو محض ایک نیکی کرنے آیا تھا۔ اب اس نیکی کے ساتھ ایک خوب صورت دوشیزہ مجھے مل رہی تھی اور وہ بھی اس طرح کہ میرے نام سے نہیں' صاحبزادہ کے نام سے حاصل ہو رہی تھی اور یہ سراسر دھوکہ ہوتا کہ میں صاحبزادے کے نام سے نکاح پڑھاتا۔ مذہب کی رو سے وہ میری جائز بیوی نہ ہوتی لیکن وہ مجھے اپنا جائز شوہر سمجھ کر اپنا سب کچھ مجھ پر لٹا دیتی۔ یہ گناہ ہوتا اور میں دھوکے سے اسے لوٹتا رہتا۔

پھر میرے ایک دل نے یہ سمجھایا کہ اس دنیا میں لوٹ کھسوٹ کے ذریعے ہی آدمی بڑا بنتا ہے۔ یہ اتنے سارے دولت مند کبھی ایمان داری سے اتنی دولت نہیں کما سکتے۔ اس دولت کے پیچھے جھوٹ اور بے ایمانی چھپی رہتی ہے۔ اگر میں اس وقت' اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھاؤں گا تو بعد میں بہت پچھتاؤں گا اور اس وقت میرے دل پر چھرے چلیں گے۔ جب میں یہ دیکھوں گا کہ میں فٹ پاتھ پر رینگ رہا ہوں اور میرے سامنے سے رخسانہ ایک شاندار کار میں بیٹھ کر جارہی ہے اور مجھ پر ایک حقارت کی نظر ڈالتے ہوئے گزر رہی ہے۔ اس وقت محبت کی جگہ نفرت اور حقارت دیکھ کر میں برداشت نہ کر سکوں گا اور اس وقت مجھے احساس ہو گا کہ میں نے حماقت کی تھی کہ اتنا شان دار موقع گنوا دیا تھا۔

جب انسان نیکی اور بدی کے درمیان کھڑا ہوتا ہے اور کبھی نیکی کی طرف اور کبھی بدی کی طرف ڈولتا رہتا ہے تو بدی میں زیادہ کشش ہوتی ہے۔ وہ زیادہ اپنی طرف کھینچتی ہے اور زیادہ دلائل پیش کرتی ہے کہ اسی طرف جھکنا زیادہ مناسب ہے۔ اس وقت شیطان نے میرے آگے ایک حسین دوشیزہ کو چارے کے طور پر پیش کیا تھا اور اس کے ساتھ اس کی بیشمار دولت کو بھی میرے سامنے رکھا تھا۔ میں اس نادر موقع کی اہمیت کو سمجھ رہا تھا لیکن ایک خیال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں تو صاحبزادہ بنا ہوا ہوں۔ جب اصل صاحبزادہ آئے گا۔ تب میری کیا اہمیت رہ جائے گی۔ نہ رخسانہ میری رہے گی نہ اس کی دولت۔ میں پھر فٹ پاتھ پر پہنچ جاؤں گا یا زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ حشمت بیگ میری

خدمات کے سلسلے میں مجھے اور پانچ دس ہزار روپے دے دے گا۔

پھر میں نے سوچا کہ اس انداز میں سوچنے سے کام نہیں چلے گا۔ دراصل مجھے جرم کی نوعیت کو سمجھنا ہو گا کہ جو کچھ ابھی میں کر رہا ہوں وہ کیا جرم نہیں ہے۔ میں ایک ماں کی زندگی بچانے آیا ہوں لیکن اس کا بیٹا بن کر دھوکا دے رہا ہوں۔ اگر اس کا بیٹا بننے سے اس کی زندگی بچ سکتی ہے تو اس کے جعلی دستخط کرنا کہاں کی شرافت ہے۔ یہ تو سراسر ظلم ہی ہے۔

اور جب یہ جرم ہی ٹھہرا اور جب میں صاجزادہ کے سارے چیکوں پر دستخط کر سکتا ہوں تو اس کی دلہن پر محبت کی مہریں نہیں لگا سکتا۔ جرم تو یہ بھی ہو گا اور وہ بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے جرم پر پردہ ڈالنے اور اسے نظرانداز کرنے کے لیے میں یہ کہہ دوں کہ میں ایک ماں کی زندگی بچا رہا ہوں تو اس سے میں بے قصور نہیں ٹھہرایا جا سکوں گا۔ کبھی گرفت میں آؤں گا تو کوئی مجھے بے قصور نہیں سمجھے گا۔ میں جرم کر رہا ہوں لہٰذا ہر حال میں مجرم ہی کہلاؤں گا۔ سوچتے سوچتے میں اس کمرے کے اندر گھٹن محسوس کرنے لگا۔ وہاں سے باہر آگیا۔ اب میں حشمت بیگ سے ملنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ ممی کے کمرے کے پاس سے گزرتے وقت میں ٹھٹک گیا۔ کیونکہ اس کمرے کا دروازہ کھول کر حشمت بیگ باہر آ رہا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ پھر جلد ہی پلٹ کر کمرے کے اندر دیکھنے کے بعد اس نے دوبارہ میری طرف دیکھا اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارے سے خاموش رہنے کی تاکید کی۔ اس کے بعد دروازے کو بند کر کے وہ دبے قدموں میرے پاس آیا اور پھر مجھے وہاں سے لے کر آگے بڑھ گیا۔ ایک کوریڈور میں پہنچنے کے بعد اس نے آہستگی سے کہا۔ "تمہاری ممی کی طبیعت اچانک ہی خراب ہو گئی تھی ابھی میں انہیں نیند کی دوا کھلا کر آرام سے سلا کر آ رہا ہوں۔ تم ابھی تک کیوں جاگ رہے ہو۔"

میں نے بھی آہستگی سے جواب دیا۔ "میں کیا کروں۔ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ میں سوچتے سوچتے تھک گیا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

اس نے میرے شانے کو دبا کر کہا۔ "وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ میں تمہیں عقل کی بات سمجھا رہا ہوں بیوقوف نہ ہو۔ جو دولت مند اور خوب صورت لڑکی تمہارے حصے میں آ رہی ہے اس سے انکار نہ کرو۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ مجھے انکار نہیں کرنا چاہیے لیکن ایک سوال کا

جواب دیجیے۔ اگر صاجزادہ واپس آجائے گا تو پھر میرا کیا بنے گا۔ یہ دولت تو بہر حال صاجزادہ کی ہے لیکن وہ دلہن کس کی ہو گی جو اس کے آنے تک میری رہے گی۔"

وہ سر ہلا کر بولا۔ "یہ تم نے اچھا سوال کیا۔ میں تمہیں اس کا ایک ہی جواب دے سکتا ہوں کہ شاید صاجزادہ کبھی واپس نہ آئے۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا' پھر پوچھا۔ "کیا مطلب' وہ واپس کیوں نہیں آئے گا؟"

"میں کیا بتاؤں۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو اتنے عرصے تک غائب نہ رہتا۔ پھر گھر سے دور رہنے کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔ اب تک ہم یہی سمجھ رہے ہیں کہ اس کی ذہنی رو بہک گئی تھی۔ اس لیے وہ چلا گیا ہے پھر ایک دن واپس آجائے گا لیکن یہ ذہنی رو کب تک بہکتی ہے۔ وہ مکمل پاگل تو نہیں تھا۔ ہوش مندی کی باتیں کرتا تھا کبھی کبھی بہک جاتا تھا۔ کیا اب وہ ذرا بھی ہوش مند نہیں رہا ہو گا۔ یہ سب باتیں جب میں سوچتا ہوں تو میرے دل کے اندر سے یہ آواز آتی ہے کہ صاجزادہ اب زندہ نہیں ہے اور وہ کبھی واپس نہیں آئے گا اور بھابی کو جب یہ معلوم ہو گا تو وہ اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکیں گی۔ میں انہیں یہ صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں اس کا ہمشکل بنا کر بھیج دیا اور تمہارے ذریعے ایک عورت کی جان بچ رہی ہے۔"

میں نے پریشان ہو کر کہا۔ "یہ تو ٹھیک ہے۔ میں نے بھی سنا ہے کہ ہر آدمی کی زندگی میں ایک نہ ایک بار کوئی سنہری موقع آتا ہے اگر وہ موقع وہ گنوا دے تو پھر کہیں کا نہیں رہتا۔ میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔ میں آپ کی باتوں پر عمل کرنا چاہتا ہوں لیکن اندر سے میں بے اطمینانی محسوس کر رہا ہوں۔ عجیب سی بے چینی ہے۔"

"یہ بے چینی رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی۔ اس بے چینی کو محبت میں بدل دو۔ رخسانہ کی محبت میں۔ جاؤ جا کر اپنے بستر پر لیٹ جاؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ آج تمہیں نیند نہ آئے تم بے سکون رہو اور رخسانہ کے تصور میں گم ہو جاؤ۔ اسے دیکھتے رہو اور خدا کا شکر ادا کرتے رہو کہ وہ تمہیں ملنے والی ہے۔ تم اس کی چاہت میں بالکل ہی ڈوب جاؤ گے۔ اسی کی تمنا کرنے لگو گے تو تمہارے اندر کی بے اطمینانی خودبخود ختم ہو جائے گی۔ جاؤ۔ شاباش اب آرام سے لیٹ کر رخسانہ کو یاد کرو۔"

☆======☆======☆

وہ مجھے میرے کمرے کے دروازے تک پہنچا کر چلا گیا۔ میں نے وہ رات واقعی

جاگتے ہوئے' سوچتے ہوئے اور تصور میں رخسانہ کو دیکھتے ہوئے گزار دی۔ صبح کے قریب نیند آئی اور میں دن کے دس بجے تک سوتا رہا۔ اس کے بعد حشمت بیگ نے ہی آکر مجھے جگایا۔ "یہ سونے اور وقت گنوانے کا موقع نہیں ہے۔ ابھی یہاں رہ کر تمہیں صاحبزادہ کی بہت سی باتوں کو بہت سے کاموں کو سیکھنا ہے' اب دفتر بھی جانا ہے۔ وہاں اس کا کاروبار سنبھالنا ہے' وہاں اس کے کاغذات وغیرہ کا مطالعہ کرنا ہے۔ پھر یہ کہ رخسانہ سے بھی رابطہ قائم رکھنا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ تمہیں ڈرائیونگ سیکھنی ہے۔ ابھی تم پر بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔ کم سے کم سویا کرو۔"

اس دن سے میں نے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا اور ان پر عمل کرنا شروع کیا۔ حشمت بیگ مجھے کاروبار کے گر سمجھاتا تھا لیکن وہ کاروبار بڑا ہی دردسری والا تھا۔ ان کے بے شمار مال بردار ٹرک تھے جو ایک شہر سے دوسرے شہر جایا کرتے تھے۔ ان سب کا حساب حشمت بیگ کے پاس ہوتا تھا اور ان کی آمدنی کا بھی صحیح حساب اسے ہی معلوم تھا۔ میں نے دو چار دن میں ہی بیزاری ظاہر کر دی۔ انہی دنوں رخسانہ نے ضد کی کہ مجھے اس کے باپ کے ساتھ اس کی دکان پر بیٹھنا چاہیے۔ شہر کے بہت بڑے بازار میں اس کے باپ کی بہت بڑی جیولری کی دکان تھی اور اگر صاحبزادہ لکھ پتی تھا تو رخسانہ کا باپ کروڑ پتی تھا۔ ان کے ہاں بننے والے ایک سے ایک ڈیزائن کے زیورات ملک سے باہر بھی جاتے تھے اور بڑی بڑی دولت مند عورتیں وہاں سونے اور ہیرے جڑے ہوئے زیورات خریدنے کے لیے آیا کرتی تھیں۔ میں نے اس کاروبار کو آسان سمجھا۔ پھر رخسانہ کی خوشی بھی منظور تھی۔ اسے خوش رکھنے کے لئے میں اس کے ہاں جاکر زیادہ بیٹھنے لگا۔ اس کے والد نے کہا۔ "بیٹا۔ اس کاروبار میں بھی بڑی ہیرا پھیری ہوتی ہے۔ میں رفتہ رفتہ تمہیں سمجھاؤں گا کہ اصلی سونے میں کھوٹ کس طرح ملایا جاتا ہے اور گاہکوں کو بیوقوف کس طرح بنایا جاتا ہے۔ پھر یہ کہ اسمگل کیا ہوا سونا ہم کیسے حاصل کرتے ہیں۔ یہ سب کاروبار تمہیں سیکھنا ہے اور ترقی کرنا ہے۔"

ان دنوں میری نظروں کے سامنے دو دولت مند گھرانے تھے۔ ایک صاحبزادہ کا خاندان۔ دوسرا رخسانہ کا اور دونوں ہی دولت مند گھرانے ہیرا پھیری سے دولت حاصل کرتے تھے اور کس طرح سماج میں ان کی عزت بنی ہوئی تھی اور شریفوں کا خاندان کہلاتا تھا اور وہاں کے تمام افراد معزز کہلاتے تھے۔ یہ تمام حقیقتوں کو دیکھ کر مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں نے غلطی نہیں کی اور اب جو کچھ بھی کر رہا ہوں وہ دنیاداری کے لحاظ سے بالکل

درست ہے اور مجھے امیر کبیر بننے کے لیے ایسے ہی جھوٹ اور فریب سے کام لینا ہوگا اور وہ بھی اس طرح کہ دوسرے دولت مندوں کی طرح میری بھی عزت بنی رہے اور میری بھی شرافت کا ڈنکا بجتا رہے۔

ایک ہفتے کے اندر میں نے دو اہم کام کیے ایک تو یہ کہ ڈرائیونگ سیکھ لی۔ رات کو کھانے کے بعد حشمت بیگ مجھے گاڑی میں بٹھا کر لے جاتا تھا۔ پھر سنسان راستوں پر مجھے کار چلانا سکھاتا تھا۔ دو ایک روز تو بڑی دشواری پیش آئی۔ پھر رفتہ رفتہ میں نے اپنی ذہانت سے اچھی طرح اسٹیئرنگ کو کنٹرول کرنا اور کار چلانا سیکھ لیا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ صاحبزادہ کے کام کو سنبھالنے سے انکار کر دیا۔ میں نے ممی کے سامنے حشمت بیگ سے کہہ دیا کہ اس کاروبار میں بڑی ہیرا پھیری ہے اور آئے دن چالان وغیرہ ہوتا رہتا ہے۔ پھر یہ کہ کون سا مال کس شہر میں جا رہا ہے۔ کتنے ٹرک کس شہر میں ہیں اور کتنے ٹرک ایسے ہیں جو مختلف شہروں سے گزر رہے ہیں اور ابھی راستے میں ہیں۔ اپنی کسی منزل تک نہیں پہنچے۔ ہر ایک کا حساب اور ان پر جو مال لادا گیا ہے اس کی ذمہ داریاں سنبھالنی پڑتی ہیں۔

اگر بات یہیں تک ہوتی تو میں کسی طرح اس کام کو سنبھال لیتا لیکن اچانک ہی ایک دن پولیس والے مجھے گرفتار کرنے کے لیے آگئے۔

معلوم ہوا کہ ایک ٹرک جو نصیرآباد سے فیض آباد کی طرف جا رہا تھا وہ سرحدی علاقے کی طرف سے گزرتے وقت بارڈر پار کرنے لگا تھا۔ پولیس چوکی کے آدمیوں نے اسے روک لیا۔ اس کی تلاش لی گئی تو کچھ ایسا مال نکلا جو ہمارے ملک سے اسمگل کیا جا رہا تھا۔

ایک پولیس آفیسر مجھے گرفتار کرنے آیا تھا لیکن حشمت بیگ نے مجھے چھپا لیا اور اس پولیس آفیسر سے کہا۔ "صاحبزادے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ صرف ان ٹرکوں کے مالک ہیں۔ اگر کوئی ٹرک ڈرائیور مالک کی عدم موجودگی میں یا اس کے انجانے پن میں ایسا مال اپنے ٹرک میں اٹھا لیتا ہے اور اسے دوسری جگہ پہنچا دیتا ہے جو غیر قانونی ہے تو اس میں مالک کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس ٹرک ڈرائیور کو گرفتار کرنا چاہیے اور اسے سزا ملنی چاہیے۔"

آفیسر یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھا لیکن حشمت بیگ نے سمجھا بجھا کر اس کی مٹھی گرم کرنے کے بعد اسے وہاں سے رخصت کر دیا پھر وہاں دفتر میں بیٹھ کر ٹیلی فون کے ذریعے پتہ نہیں کتنے بڑے بڑے افسروں سے رابطہ قائم کرتا رہا اور موجودہ کیس کے

متعلق باتیں کرتا رہا۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ جو ٹرک ڈرائیور گرفتار ہوا تھا اسے بھی ضمانت پر چھڑا لیا گیا ہے۔

قانون کی نظر میں، میں قابل گرفت نہیں رہا لیکن میں نے حشمت بیگ کے سامنے غصہ ظاہر کیا۔ "یہ تو مجرمانہ زندگی گزارنے پر آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں۔ آپ نے تو کہا تھا کہ کسی قسم کا گھپلا نہیں ہو گا۔"

حشمت بیگ نے کہا۔ "بیٹے یقین کرو کہ ہم اس معاملے سے بالکل غافل تھے اور ہم نہیں جانتے تھے کہ ٹرک ڈرائیور کون سا مال اپنے ٹرک میں اٹھا کر لے جا رہا ہے یہ اس کی بدمعاشی تھی، بہرحال ہم ٹرک ڈرائیور سے نمٹ لیں گے لیکن ہم اسمگلر نہیں ہیں، اس بات کا یقین کرو۔"

اس نے مجھے سمجھا کر منا کر پھر اپنے ساتھ رہنے پر راضی کر لیا، ویسے رہنا تو مجھے تھا کیونکہ ایک طرف امی بڑے آرام و آسائش کی زندگی گزار رہی تھیں۔ ان کا باقاعدہ علاج ہو رہا تھا، دوسری طرف رخسانہ میرے دل و دماغ پر چھا رہی تھی۔ میں اب وہاں سے، اس ماحول سے نکل نہیں سکتا تھا۔

ہماری شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی تھی، ایک ماہ کے بعد رخسانہ میری دلہن بن کر آنے والی تھی یہ خوش خبری میں اپنی امی کو نہیں سنا سکتا تھا۔ حشمت بیگ نے سختی سے منع کیا تھا، ان کا خط پہنچتا تھا پھر حشمت بیگ وہ خط مجھے پہنچاتا تھا میں اس کا جواب لکھ کر حشمت بیگ کے حوالے کرتا تھا اور وہ اسے لے جا کر پوسٹ کر دیتا تھا۔ ایک بار میں نے حشمت بیگ کی غیر موجودگی میں دفتر کے ٹیلی فون سے سینی ٹوریم کے لئے ایک ٹرنک کال بک کرائی جو میری امی کے نام تھی میں نے امی سے باتیں کیں، انہیں اپنی خیریت سے آگاہ کیا اور ان کی خیریت پوچھی۔ ہم دونوں ماں بیٹے بہت خوش تھے اور میں نے ان سے کہا تھا کہ ایک آدھ ہفتے میں، میں ان سے ملاقات کرنے کے لئے آؤں گا۔

شادی کے لئے دو ہفتے رہ گئے، میں نے محسوس کیا کہ حشمت بیگ کوئی فریبی آدمی نہیں ہے اور وہ میرے ساتھ کوئی فراڈ نہیں کر رہا ہے۔ میں جتنی اچھی زندگی گزار رہا ہوں اتنا اچھا موقع مجھے کبھی نصیب نہیں ہو گا۔ میری اب یہی خواہش ہونے لگی تھی کہ میں ہمیشہ کے لئے صاحبزادہ بن کر اسی جگہ رہ جاؤں اور رخسانہ کی زلفوں کی چھاؤں میں ساری زندگی گزار دوں۔

شادی سے دس دن پہلے میں جہانگیر آباد کے سینی ٹوریم میں، اپنی امی سے ملنے کے

لئے گیا، رخسانہ مجھ سے الگ نہیں رہنا چاہتی تھی لیکن میں نے ایک ضروری کام کا بہانہ کیا اور اس سے کہا کہ صبح کی فلائٹ سے جاؤں گا اور شام کی فلائٹ سے رات ہوتے ہی واپس آ جاؤں گا۔ وہاں امی مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں کیونکہ میرے چہرے پر اچھی خاصی تبدیلی آ گئی تھی، میں ذرا سا صحت مند ہو گیا تھا، چہرہ بالکل پھول کی طرح کھل رہا تھا، اور امی کئی بار مجھے چوم چوم کر میری بلائیں لے لے کر کہہ رہی تھیں کہ مجھے کسی کی نظر نہ لگے اور میں کسی مصیبت میں نہ پڑوں۔ مجھے دعائیں دے رہی تھیں، میں اندر ہی اندر یہ سوچ کر کڑھ رہا تھا کہ اپنی زندگی کی بہت بڑی خوشی کی بات امی کو نہیں سنا سکتا۔ میں آنے والی زندگی کے بارے میں نہیں بتا سکتا کہ دس دن بعد ان کی بہو میری زندگی بننے والی ہے اور وہ کتنی حسین اور کتنی دولت مند ہے، امی کو میں خوش خبری سنا نہیں سکتا تھا۔

میں امی سے مل کر شام کی فلائٹ سے واپس آ گیا، رخسانہ ایئرپورٹ پر مجھے لینے آئی تھی۔ ہم وہاں سے تفریح کرتے ہوئے اپنی کوٹھی کو پہنچے، رخسانہ نے ضد کی کہ میں رات کا کھانا اس کے ساتھ کھانے کے بعد گھر واپس جاؤں، وہ مجھے اس قدر چاہتی تھی، ایسی محبت کا اظہار کرتی تھی، ایسی ادائیں دکھاتی تھی کہ سینے میں میرا دل لوٹ پوٹ ہونے لگتا تھا، میں سوچتا تھا کہ کاش کہ صاحبزادہ اب کبھی واپس نہ آئے۔ رخسانہ میری زندگی میں آئے تو واپس نہ جائے، میں یہی دعا مانگتا تھا۔

بعض حالات میں انسان بہت ہی زیادہ خود غرض ہو جاتا ہے، میں جو نیکی کرنے کے لئے آیا تھا اور ممی کے سامنے صاحبزادہ بنا ہوا تھا، یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ صاحبزادہ اگر ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائے گا یا حشمت بیگ کے شبہ کے مطابق مر چکا ہو گا تو ایک ماں کو جب یہ پتہ چلے گا تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ ایسی کوئی صورت نہیں تھی کہ ممی کو صاحبزادہ مل جاتا اور مجھے رخسانہ ہمیشہ کے لئے مل جاتی۔ رخسانہ کو پانے کے لئے مجھے ممی کی ممتا کے سائے سے گزرنا تھا اور میں گزر رہا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد رخسانہ مجھے میری کوٹھی تک یعنی صاحبزادہ کی کوٹھی تک چھوڑنے آئی، ہم بڑی پیاری پیاری باتیں کرتے رہے، وہ بڑی محتاط تھی اور نیک مشرقی لڑکی کی طرح اپنے آپ کو صرف اپنے شوہر کی ملکیت سمجھتی تھی۔ میں اس کے اس کردار سے بہت متاثر تھا اور اس طرح اس نے میرے دل میں بڑی جگہ بنالی تھی۔ کبھی کبھی میں پریشان ہو کر ندامت سے سوچتا تھا کہ اتنی پارسا اور شریف زادی کو میں دھوکہ دینے والا ہوں صاحبزادہ کے نام پر سہاگ کی سیج پر حاصل کرنے والا ہوں اور یہ گناہ بھی ہے، جرم بھی

ہے اور اس کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے ضرور ملے گی۔

☆======☆======☆

گھر پہنچ کر میں نے ممی سے ملاقات کی انہوں نے اپنی عادت کے مطابق میری پیشانی چوم کر مجھے دعائیں دیں پھر کہا۔ "بیٹے' اتنی دیر کے لئے میری نظروں سے اوجھل نہ رہا کرو' صبح کے گئے اب آئے ہو میرا دل گھرا رہا تھا۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "ممی اب میری دماغی حالت بالکل درست ہے میں کہیں بھاگ کر نہیں جاؤں گا' اب آپ ہی کے قدموں میں رہوں گا۔"

وہ بولیں۔ "بیٹے' شادی کے لئے بہت سی رقم کی ضرورت ہے' میرے اکاؤنٹ میں جو پیسے ہیں ان میں سے میں خرچ کر رہی ہوں کچھ اپنے اکاؤنٹ سے بھی مجھے رقم دو۔"

میں نے کہا۔ "کتنی رقم چاہئے؟"

وہ بولیں۔ "کم از کم پچیس ہزار کا ایک چیک لکھ دو' باقی ضرورت ہو گی تو بعد میں دیکھا جائے گا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے تکیہ کے نیچے سے وہ چیک بک نکالی جو صاحبزادہ کے نام پر تھی۔ ممی یہ چیک بک اپنے پاس رکھتی تھی' اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو صاحبزادہ کی ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ اس کے ہاتھ میں چیک بک یا دوسرے اہم کاغذات دے دیئے جاتے اور ان کا خیال نہ رکھا جاتا' دوسری بات یہ کہ پچھلے دنوں جب کہ صاحبزادہ یہاں موجود تھا تو اس نے اپنے اکاؤنٹ سے کافی رقم نکال لی تھی اور اِدھر اُدھر روپے اڑا دیئے تھے' شاید عیاشی میں ایسا کیا تھا۔ اسی لئے ممی احتیاطاً وہ چیک بک اپنے پاس رکھتی تھی۔ جب پیسے نکالنے ہوتے تو اس چیک بک کے ایک صفحہ پر وہ رقم لکھ کر دستخط کر دیتا تھا۔

اس رات بھی میں نے پچیس ہزار کی رقم لکھ کر نیچے دستخط کر دیئے اور وہ چیک بک ممی کے حوالے کر دی۔ مجھے نہ تو صاحبزادہ کے اکاؤنٹ سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی کاروبار سے' اسی لئے میں کاروبار سے تو ہاتھ اٹھا ہی چکا تھا۔ وہ سارا کاروبار حشمت بیگ سنبھال رہا تھا اور میں صرف اتنا کام کرتا تھا کہ ضرورت کے وقت چیک پر دستخط کر دیتا تھا لیکن یہ ضرور معلوم کرتا تھا کہ رقم نکالنا کس قدر ضروری ہے اگر بے حد ضروری ہوتا تو میں ایسا کرتا تھا۔

آخر کار شادی کا دن آ پہنچا' کوٹھی میں بڑی دھوم دھام ہو رہی تھی' کتنے ہی رشتہ دار دوسرے شہروں سے آئے ہوئے تھے۔ نئے نئے رشتہ داروں سے میرا تعارف ہو رہا

تھا۔ اس طرح کہ حشمت بیگ پہلے ہی بتا دیتا تھا کہ کون سا رشتہ دار کہاں سے آیا ہے' اس کا نام کیا ہے اور اس کا میرے ساتھ کیا رشتہ ہے۔ وہ اس معاملے میں بڑا محتاط تھا اور پہلے ہی سے مجھے سب کچھ سمجھا دیتا تھا۔ مجھے ان رشتہ داروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی میں تو اپنی الجھنوں میں تھا ایک طرف دل رخسانہ کی طرف کھنچا جاتا تھا دوسری طرف ضمیر اندر سے چیخ چیخ کر کہتا تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہے اور غلط طریقے سے مجھے رخسانہ کو اپنانا نہیں چاہئے۔ میں اسی کشمکش میں دولہا بن کر رخسانہ کی کوٹھی میں پہنچ گیا وہاں وہ وقت بھی آ گیا جب قاضی نے نکاح پڑھایا اور صاحبزادہ کے نام سے رخسانہ کو منسوب کیا اور ایجاب و قبول کے لئے میں وہاں جسمانی طور پر موجود تھا' نکاح میں نے قبول کیا اور نکاح ہوا صاحبزادہ سے۔

رخصتی سے پہلے مجھے زنان خانے میں بلوایا گیا وہاں عورتوں کی کچھ رسمیں ادا کرنی تھیں۔ اسی بھیڑ میں میرے رشتے کی کچھ سالیاں موجود تھیں۔ ایک سالی نے مذاقاً کہا۔ "ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہمارے دولہا بھائی کتنے دلیر ہیں' کیوں نہ دلہن کے پاس ایک چھپکلی لا کر رکھ دی جائے۔"

چھپکلی کا ذکر سنتے ہی میری ساس نے ڈانٹ کر اس لڑکی سے کہا۔ "خبردار ایسی باتیں نہ کرنا' یہ خوشی کا موقع ہے اور تم چاہتی ہو کہ دولہا میاں خوفزدہ ہو کر یہاں بے ہوش ہو جائے۔ بھئی' یہ تو بچپن کی عادت ہے' یہ خوف بچپن سے سمایا ہوا ہے اب یہ بیچارہ کیا کرے' اس کا مذاق اس طرح نہیں اڑانا چاہئے۔"

دوسری بوڑھی عورتوں نے بھی لڑکیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کرایا اور ایسا مذاق کرنے سے منع کیا۔ اگر وہ بزرگ خواتین ان لڑکیوں کو ایسا کرنے سے نہ روکتیں تو شاید مجھے وہاں صاحبزادہ بن کر چیخنا چلانا پڑتا اور مارے دہشت کے بے ہوش ہونے کی ایکٹنگ کرنی پڑتی۔ بہرحال میں وہاں سے رخسانہ کو اپنی دلہن بنا کر صاحبزادہ کی کوٹھی میں اور پھر اس کوٹھی سے صاحبزادہ کی خواب گاہ میں لے آیا۔ اس وقت تک ضمیر نے مجھے اچھی طرح کچل کر رکھ دیا تھا۔ میں اپنے ضمیر سے شکست تسلیم کر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امی نے مجھے بچپن ہی سے یہ تعلیم دی تھی کہ کبھی کسی کو دھوکہ نہ دینا اور جھوٹ کے سہارے زندگی نہ گزارنا' ایمانداری کی زندگی میں تکلیفیں تو ہوتی ہیں مگر ایک نہ ایک دن راحت بھی ملتی ہے۔

امی کی یہی تعلیم اس وقت آڑے آ رہی تھی اور مجھے سیدھا راستہ دکھا رہی۔

میرے ہاتھ دلہن کا گھونگھٹ الٹ کر اس کا چہرہ دکھانے سے انکار کر رہے تھے ' کیونکہ وہ چہرہ نکاح ہو جانے کے باوجود میرے لئے پرایا تھا ' میں اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ میں نے سہاگ کی سیج کے قریب پہنچ کر رخسانہ کو دیکھا وہ سرخ لباس میں گٹھڑی بنی سر جھکائے گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی اور اس انتظار میں تھی کہ میں اس کا گھونگھٹ اٹھا کر اس کے حسین چہرے کو دیکھوں گا ' اس کی تعریفیں کروں گا اور محبت کے خزانے اس کی جھولی میں ڈال دوں گا ' پھر ساری زندگی اسی طرح محبت میں گزرے گی ' پتہ نہیں وہ بیچاری کیسے کیسے خواب دیکھ کر آئی تھی۔

میں نے گھبرا کر کہا۔ "رخسانہ ' میں تمہارا گھونگھٹ اٹھانے سے پہلے ایک بہت بڑی حقیقت کا انکشاف کرنا چاہتا ہوں ' مجھے امید ہے کہ تم بڑے صبر و تحمل سے سنو گی۔"

وہ گھونگھٹ کے اندر ذرا سا کسمسائی مگر خاموش رہی کیونکہ نئی نویلی دلہن تھی کچھ بول نہیں سکتی تھی۔ میں نے کہا۔ "قصہ یہ ہے کہ ایک ایسی ماں ہے جس کو دل کا دورہ پڑتا ہے اس کا جوان بیٹا کہیں گم ہو گیا تھا پھر ڈاکٹروں نے کہا کہ ماں کی زندگی بچانے کے لئے اس کے بیٹے کو تلاش کرنا ضروری ہے لوگوں نے اسے بہت تلاش کیا۔ بالآخر ہوا یہ کہ اس کا اپنا بیٹا تو نہ ملا اس کا ایک ہمشکل مل گیا۔ اس طرح اس ہمشکل آدمی کو عورت کا بیٹا بن کر اس کے پاس آنا پڑا اور اسے اپنی ماں بنانا پڑا لیکن پھر ہوا یوں کہ اس ماں نے گھر میں بہو لانے کی ضد کی اور وہ نوجوان جو بیٹا بنا ہوا تھا ایسے مرحلے سے گزرنے لگا کہ وہ اپنی ماں کی پسند کی ہوئی لڑکی سے شادی کرنے سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ لڑکی اسے دل و جان سے پسند تھی"۔

میں نے دیکھا وہ پھر ذرا کسمسائی تھی ' میری باتیں سن کر اس کے اندر یقیناً بے چینی پیدا ہو گئی تھی اور وہ جلد از جلد معلوم کرنا چاہتی ہو گی کہ میں یہ قصہ کیوں سنانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا۔ "وہ نوجوان اپنی ہونے والی دلہن کو سارا راز بتانا چاہتا تھا لیکن ایک قباحت تھی اور وہ یہ کہ اگر دلہن اور اس کے گھر والوں کو پتہ چلتا تو یہ بات اس ماں تک پہنچ جاتی جو ایک پرائے بیٹے کو اپنا بیٹا سمجھ رہی تھی پھر اسے دل کا دورہ پڑتا اور وہ اپنے بیٹے کے صدمے سے زندہ نہ رہ سکتی۔"

اچانک رخسانہ نے اپنے ہاتھوں سے گھونگھٹ کو الٹ دیا ' پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو ' یہ قصہ کیوں سنا رہے ہو؟"

"اس لئے سنا رہا ہوں کہ اب تک تم کسی حد تک سمجھ گئی ہو اور زیادہ وضاحت

سے یہ بتا دوں کہ میں صاحبزادہ نہیں ہوں بلکہ اس کا ہمشکل ہوں اور صاحبزادہ بن کر ایک ماں کی زندگی بچا رہا ہوں۔ میں نے سوچا کہ لگے ہاتھوں تمہاری جیسی حسین عورت بھی مجھے مل رہی ہے تو نکاح پڑھا لینا چاہئے اور تمہیں حاصل کر لینا چاہئے لیکن اس کمرے میں آ کر میں نے سوچا کہ یہ گناہ ہے اور تمہارے ساتھ سراسر دھوکہ ہے ' تم اتنی نیک اور پارسا ہو کہ تم نے کبھی تنہائی میں مجھے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا۔ تمہاری جیسی پاکیزہ لڑکی کو میں گناہ کی دلدل میں دھکیل نہیں سکتا تھا اس لئے یہ راز فاش کر رہا ہوں۔ اگر تم نے یہ بات اس کمرے سے باہر کسی سے کہہ دی تو ادھر اس ماں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی دوسری بات یہ کہ میں یہاں سے نکال دیا جاؤں گا ' میری اپنی امی سینی ٹوریم میں زیر علاج ہیں ان کے علاج کے لئے بھی پھر مجھے رقم نہیں ملے گی اور میں انہیں اچھی خوراک نہیں پہنچا سکوں گا میرے ساتھ بھی اپنی بہت سی مجبوریاں ہیں۔"

وہ میری باتیں سن رہی تھی اور میرے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی ' میں نے پوچھا۔ "تم اس طرح کیا دیکھ رہی ہو ' اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے تم چاہو تو صاحبزادہ کے پورے خاندان کو اس دھوکہ دہی کے الزام میں ذلیل کر سکتی ہو اور مجھے بھی یہاں سے دھکے دے کر نکال سکتی ہو اور اس نکاح کو ناجائز قرار دے سکتی ہو۔"

اس نے گھونگھٹ کو اپنے اوپر سے نوچ کر ایک طرف پھینک دیا ' پھر سیج سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "یہ نکاح نہیں ' فریب ہے بہت بڑا فریب ہے ' میں اسی وقت اپنے گھر جاؤں گی۔"

میں ایک دم سے گھبرا گیا ' دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کا راستہ روکتے ہوئے بولا۔ "اگر سچائی کی اسی طرح قدر ہوتی ہے اور میری نیکی کا یہی انعام ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ کوئی گناہ نہیں کیا ' تمہیں گناہ سے بچانے کے لئے سچ بول دیا تو کیا تم مجھے یہاں سے بدنام کر کے جاؤ گی ؟ کیا میری ماں سینی ٹوریم میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گی ' صاحبزادہ کی ممی دل کے مرض میں مبتلا ہو کر اور اس راز کے انکشاف کے بعد صدمہ نہ سہہ کر مر جائے گی ' کیا تم اتنے سارے لوگوں کی زندگیوں سے کھیل کر یہاں سے جانا چاہتی ہو؟"

وہ میرے چہرے کو غور سے دیکھنے لگی ' پھر ذرا نرم پڑ کر بولی۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "میں نے جو نیکی تمہارے ساتھ کی ہے ' اس کا بدلہ چاہتا ہوں ' اب تم سوچو کس طرح اس کا بدلہ دے سکتی ہو؟"

وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ "میں مہندی رچا کر دلہن کا جوڑا پہن کر کیسے کیسے سپنے دیکھتی

ہوئی یہاں تک آئی تھی' تم نے ان خوابوں کی بڑی بھیانک تعبیر بتائی ہے' میرا دماغ اس وقت الجھا ہوا ہے میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ تمہاری شرافت آڑے آ رہی ہے ورنہ کرنے کو تو میں ابھی ایسا ہنگامہ کروں کہ صاجزادہ کا پورا خاندان ہمیشہ یاد رکھے گا کہ کس رخسانہ سے پالا پڑا تھا۔"

میں نے التجا کی۔ "دیکھو رخسانہ' جوش اور جذبے میں آ کر کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا جس سے بعد میں تمہیں بھی افسوس ہو۔"

"ہاں' یہی سوچ رہی ہوں۔ مجھے سوچنے سمجھنے کے لئے تھوڑا وقت چاہئے تم اس وقت میرے جیون ساتھی نہیں ہو' میرے مجازی خدا نہیں ہو' ایک اجنبی ہو۔ اس لئے میرے کمرے سے چلے جاؤ' مجھے رات بھر سوچنے کا موقع دو۔"

"ٹھیک ہے کہ میں اجنبی ہوں لیکن میں نے اپنی شرافت کا ثبوت بھی دیا ہے' اسی شرافت کا واسطہ دے کر میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے اس کمرے سے باہر جانے کے لئے نہ کہ۔ باہر جاؤں گا تو حشمت بیگ اور ممی وغیرہ کیا سوچیں گے' مجھ سے طرح طرح کے سوال کریں گے اور میں کسی سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مجھ سے دور گئی پھر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہاں سے مجھے دیکھنے لگی۔ وہ رہ رہ کر میری طرف دیکھتی تھی اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتی تھی۔

اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے' اب آہستہ آہستہ یہ بات میری سمجھ میں آ رہی ہے کہ واقعی تم نے کتنی بڑی نیکی میرے ساتھ کی ہے' تم نے دھوکے سے مجھ برباد نہیں کیا پھر یہ کہ بدستور صاجزادہ بن کر تم میرے مجازی خدا بھی بن جاتے اور میرے ابو کے کاروبار کے مالک بھی بن کر رہ سکتے تھے لیکن تم نے نہ دولت کا لالچ کیا نہ مجھ جیسی عورت کا' میں تمہاری قدر کرتی ہوں۔"

میں اس سے دور ایک صوفے پر بیٹھ کر بولا۔ "رخسانہ ہم دونوں مہذب ہیں اور تہذیب کی حد میں رہ کر یہ رات اس کمرے میں ایک ساتھ گزار سکتے ہیں۔"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولی۔ "ہاں گزار سکتے ہیں اور ایک دوسرے کی بھلائی کے لئے بھی سوچ سکتے ہیں مثلاً تم نے میری بھلائی کے لئے سوچا' اس پر عمل کیا اور مجھے اپنی ناجائز دلہن بنانے سے پرہیز کیا۔ اب میرا فرض ہے کہ میں تمہاری بھلائی کے لئے سوچوں' تم یہی چاہتے ہو نا کہ میں نہماری نیکی کا بدلہ دوں؟"

"ہاں' میں یہی چاہتا ہوں۔"

"میں سوچ رہی ہوں کہ اگر تم صاجزادہ نہیں ہو تو پھر صاجزادہ کہاں گیا ہے؟"

"یہی بات میں بھی سوچتا رہتا ہوں' حشمت بیگ کا خیال ہے کہ صاجزادہ اب اس دنیا میں نہیں ہے' اگر وہ زندہ ہوتا تو اب تک گھر لوٹ کر آ چکا ہوتا۔ اس کی ذہنی حالت اتنی خراب نہیں تھی۔ کبھی کبھی وہ باتیں بھول جایا کرتا تھا۔"

رخسانہ نے پھر تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "ہاں' ادھر میں چند نے ماہ پہلے اس میں یہ عادت دیکھی کہ وہ اکثر کچھ باتیں بھول جایا کرتا تھا ورنہ بچپن سے تو وہ بالکل ٹھیک تھا اور اچھی خاصی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہم ایک ساتھ کتنا ہی وقت گزار چکے ہیں۔ میں نے کبھی اس کی ذہنی حالت تشویشناک نہیں دیکھی۔ اب پتہ نہیں چار پانچ ماہ پہلے اسے کیا ہو گیا تھا کہ وہ کچھ بھول جایا کرتا تھا' پھر پتہ چلا کہ وہ گھر سے چلا گیا ہے۔" ایسے کہتے کہتے وہ چونک گئی' کچھ دہشت زدہ سی ہو کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا کہیں اسے قتل تو نہیں کیا گیا ہے؟"

میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "کسے قتل کیا گیا ہے؟"

"اسے ہی' صاجزادے کو۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے قتل کر کے کہیں دفنا دیا گیا ہو' کہیں پھینک دیا گیا ہو' اس کی لاش ایسی مسخ کر دی گئی ہو کہ وہ پہچانا نہ جاتا ہو اور اس کی جگہ تمہیں یہاں لایا گیا ہو؟"

میں نے کہا۔ "مجھے یہاں لانے والا حشمت بیگ ہے اور وہ مجھے ایسا قاتل اور جلاد نظر نہیں آتا۔"

"مجرم باہر سے مجرم نظر نہیں آتے' اوپر سے شرافت کا لبادہ اوڑھے رہتے ہیں۔ حشمت بیگ کے خلاف میں زیادہ بول نہیں سکتی لیکن میری ذاتی رائے اس کے متعلق اچھی نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ اپنی جوان بیٹی کو صاجزادے سے بیاہنا چاہتا تھا اور مجھے راستے کا کانٹا سمجھتا تھا' سامنے تو اس نے کبھی میری مخالفت نہیں کی لیکن اس کا رویہ' اس کا مزاج بتاتا تھا کہ وہ صاجزادے اور میری شادی کی حمایت میں نہیں ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ حشمت بیگ نے مجھے اپنی بیٹی اور صاجزادہ کے راستے سے ہٹانے کے لئے تمہیں صاجزادہ بنایا ہو اور تم سے شادی کرانے کے بعد اب وہ اپنی بیٹی کی شادی صاجزادہ سے کرانا چاہتا ہو؟"

میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کیونکہ صرف تمہیں راستے سے ہٹانے کے لئے وہ اتنا بڑا ڈرامہ نہیں کھیل سکتا کہ مجھے ایک دوسرے شہر سے صاحبزادہ بنا کر لائے اور تمہیں اور تمہارے پورے خاندان کو اتنا بڑا دھوکہ دے پھر یہ کہ وہ مجھے بتا چکا ہے کہ اس کی بیٹی شکیلہ کی شادی ہو چکی ہے۔ شکیلہ نے چونکہ اپنی مرضی سے شادی کی ہے اس لئے وہ اپنی بیٹی سے نہیں ملتا ہے اور اس کی بیٹی اس کی کوٹھی میں شاید اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے اور حشمت بیگ ادھر نہیں جاتا' ہماری ہی کوٹھی میں رہتا ہے۔"

رخسانہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "شکیلہ کی شادی ہو گئی ہے' ہم اتنے قریبی لوگ ہیں ہمیں تو اس بات کا علم نہیں ہے کہ شکیلہ نے شادی کی ہے۔"

"شاید اس لئے علم نہ ہو کہ شکیلہ نے اپنی مرضی سے چھپ کر شادی کی ہے اور یہ حشمت بیگ کو ناپسند ہے' اسی لئے وہ تمام لوگوں سے بات چھپا رہا ہو۔"

رخسانہ نے چونک کر پوچھا۔ "کیا شکیلہ نے صاحبزادے سے شادی کی ہو گی؟"

"نہیں۔" میں نے یقین سے کہا۔ "حشمت بیگ کو صاحبزادے اور اپنی بیٹی کا رشتہ منظور تھا پھر وہ ناپسند کیسے کرتا' شکیلہ نے کسی اور سے شادی کی ہے اگر صاحبزادے سے شادی کی ہوتی اور وہ اس شہر میں موجود ہوتا تو اپنی ممی سے کیوں دور رہتا۔ ہم حشمت بیگ پر شبہ کر سکتے ہیں کہ وہ کسی قسم کا فراڈ کر سکتا ہے اور ہم لوگوں کو کسی نہ کسی قسم کا نقصان پہنچا سکتا ہے لیکن ممی کے بارے میں ایسا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ وہ ممتا کی ماری ہیں انہیں صرف اپنا بیٹا چاہئے' دولت جائیداد کی ہوس نہیں ہے۔ یہاں اللہ کے فضل سے سب کچھ ہے صرف ایک بیٹا نہیں ہے اور میں بیٹا بن کر ان کی تسلی کر رہا ہوں۔"

رخسانہ اپنے سر کو تھام کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر سوچنے لگی۔ اس کے چہرے سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ بڑی الجھنوں سے گزر رہی ہے' کتنی ہی سوچیں اس کے دماغ میں آ رہی ہوں گی اور وہ کسی ایک نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہو گی۔ میں نے کہا۔ "حشمت بیگ کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں نقلی صاحبزادہ ہوں' اب دوسری تم ہو جو اس راز کو سمجھ رہی ہو۔ پہلے تو تمہیں اس نتیجے پر پہنچنا ہے کہ کل صبح کے بعد کیا میں اسی طرح صاحبزادہ بنا رہوں گا یا یہ سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا؟"

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارا نقصان نہیں ہونے دوں گی' تمہارے لئے جو کچھ بھی کر سکتی ہوں' کروں گی۔"

میں نے کہا۔ "شکریہ' میں تم سے ایسی ہی توقع رکھتا ہوں۔"

وہ بولی۔ "میں سوچ رہی ہوں کہ ہمیں اس معاملے کی گہرائی کو ٹٹولنا ہو گا کہ آخر یہ کیا تماشہ ہے' بے شک تم نیکی کرنے آئے ہو۔ ایک ماں کو زندگی دے رہے ہو' جو کہ تمہاری ماں نہیں ہے لیکن پتہ نہیں کیوں میرا دل اندر سے کہہ رہا ہے کہ تم اس نیکی کے بدلے کسی بہت بڑی مصیبت میں پھنسنے والے ہو۔ حشمت بیگ مجھے اچھا آدمی نظر نہیں آتا ہمیں بڑی خاموشی سے ٹٹولنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وہ چاہتا کیا ہے اور تمہیں کب تک یہاں صاحبزادہ بنا کر رکھنا چاہتا ہے' اس دوران ہم کوشش کریں گے کہ اپنے طور پر صاحبزادہ کو کہیں تلاش کر سکیں۔"

میں نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھی تدبیر ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ تم دنیا والوں کی نظروں کے سامنے میری شریک حیات بنی رہو' تبھی ہم ایسا کر سکتے ہیں۔"

اس کی نگاہیں جھک گئیں' وہ سوچ میں پڑ گئی تھی میں نے پوچھا۔ "رخسانہ' ایک سوال کرتا ہوں اس کا جواب دو تاکہ اس جواب کو ہمیشہ یاد رکھوں اور اپنی حیثیت کو پہچانتا رہوں۔ یوں دیکھا جائے تو میری حیثیت کچھ بھی نہیں ہے' میں ایک بیروزگار آدمی تھا بس نیکی کے لئے یہاں چلا آیا۔ اب میں نہیں جانتا کہ میرا انجام کیا ہو گا لیکن اتنا سمجھتا ہوں کہ جب سے تمہیں دیکھا ہے مجھے یہ دنیا بڑی خوبصورت نظر آنے لگی ہے تمہاری خاطر میرا جی چاہا کہ یہاں سے کبھی نہ جاؤں۔ میں تمہیں چاہنے لگا ہوں' کیا تم اس چاہت کا جواب محبت سے دے سکتی ہو' کیا تم میری شریک حیات بن سکتی ہو؟"

اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "میں ابھی اس بات کا جواب نہیں دے سکتی' بے شک تم نے مجھے اپنی نیکی اور شرافت سے متاثر کیا ہے' میں تمہاری عزت کرتی ہوں لیکن تم سے پہلے میں صاحبزادہ کو چاہتی تھی۔ میں پہلے یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ صاحبزادہ کے ساتھ کیا ہوا ہے' وہ کہاں گم ہو گیا ہے اور اس نے میری خبر کیوں نہیں لی اگر وہ دانستہ مجھے نظر انداز کر رہا ہو اور میرے علاوہ کسی اور کو چاہتا ہو تو پھر میں تمہارے متعلق سوچوں گی اور فیصلہ کروں گی۔"

اس کی باتیں سن کر امید بندھ گئی کہ اس کے دل میں میرے لئے گنجائش ہے اور وہ کسی بھی موقع پر میری طرف مائل ہو سکتی ہے۔ وہ رات ہم نے بڑی شرافت سے گزاری' رخسانہ کو ایک ہی کمرے میں نیند نہیں آ رہی تھی کیونکہ جو کچھ بھی ہو میں اجنبی

تھا' اس کا مجازی خدا نہیں تھا اس لئے میں نے مشورہ دیا تھا کہ میں بستر باتھ روم میں لے جا کر بچھاؤں گا اور وہاں سو جاؤں گا۔ رخسانہ باتھ روم کا دروازہ باہر سے بند کر دے گی اور آرام سے کمرے میں سوئے گی اس طرح یہ اندیشہ نہیں رہے گا کہ میرے اندر شیطان جاگے گا تو میں باتھ روم سے نکل کر آ سکوں گا۔ وہ محفوظ رہے گی' چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور وہ رات ہم نے گزار دی۔ دوسرے دن ولیمہ کی شاندار تقریب تھی رشتہ داروں کے علاوہ شہر کے بڑے بڑے معزز لوگ اس دعوت میں شریک ہوئے تھے ان میں کاروباری لوگ بھی تھے' ڈاکٹر' وکیل' انجینئر وغیرہ بھی آئے ہوئے تھے۔ ایک فیملی ڈاکٹر سے میرا تعارف کرایا گیا وہ میری ممی کا پہلے علاج کیا کرتا تھا اب ممی دوسرے ڈاکٹر کے زیر علاج تھیں' شاید اس لئے کہ اس فیملی ڈاکٹر کی دواؤں کا اثر ان پر نہیں ہوا تھا میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا آپ ممی کے مرض کی تشخیص نہیں کر سکے؟"

ڈاکٹر نے مسکرا کر حشمت بیگ کو دیکھا پھر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری ممی دراصل وہمی زیادہ ہیں میں یقین سے کہتا ہوں کہ انہیں کوئی بیماری نہیں بس وہم ایسی چیز ہے کہ انسان کو بیمار بنا دیتا ہے۔"

حشمت بیگ نے مجھے اس سے مزید گفتگو کا موقع نہیں دیا' یہ کہہ کر ایک طرف لے گیا کہ چلو میں تمہیں دوسروں سے متعارف کراؤں۔ وہ ایک طرف لے جا کر دور ایک آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہ جو بلو رنگ کے سوٹ میں نظر آ رہا ہے اور جس کی نکٹائی بھی بلو ہے اور اس کے سر پر برائے نام بال ہیں وہ کبھی صاجزادہ کے والد کا وکیل خاص ہوا کرتا تھا اس بات کو یاد رکھنا کہ اگر وہ تم سے ملے تو تم اجنبی نہ بن جانا بس رسمی سی گفتگو کرنے کے بعد اس سے کترا جانا۔"

میں نے وہی کیا تھوڑی دیر بعد میرا سامنا اس سے ہوا تو اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے شادی کی مبارکباد دی اور کہا۔ "میں تمہیں اپنے ہاں دعوت دیتا ہوں کل شام کو کسی وقت اپنی ممی' اپنی دلہن کے ساتھ میرے گھر آؤ میں چاہتا ہوں کہ ...."

اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی' اچانک ہی حشمت بیگ چیختا ہوا اور تقریباً دوڑتا ہوا میرے پاس آیا پھر میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "صاجزادے' تمہاری ممی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے' جلدی چلو۔"

☆======☆======☆

میں فوراً ہی وہاں سے پلٹ کر حشمت بیگ کے ساتھ چلتا ہوا کوٹھی کے اندر داخل

ہوا اندر عورتوں کی بھیڑ تھی وہ سب ن سب مجھے دولہا سمجھ کر دیکھ رہی تھیں۔ میں ان کے درمیان سے گزرتا ہوا اپنی ممی کے کمرے میں پہنچا تو وہ اپنے پلنگ پر سرہانے کی طرف ٹیک لگائے نیم دراز تھیں اور چہرے سے تھکی تھکی سی اور پژمردہ سی لگ رہی تھیں۔ میری طرف دیکھ کر وہ مسکرائیں پھر بولیں۔ "بیٹے' کوئی بات نہیں ہے اب میری طبیعت سنبھل گئی ہے۔ میں اس خوشی کے موقع پر تمہیں پریشان نہیں دیکھنا چاہتی۔ بس اب تم اپنی دلہن کے پاس جاؤ۔"

میں نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں آپ کے پاس بیٹھوں گا۔"

انہوں نے میرے گال پر ہلکی سی تھپکی دے کر کہا۔ "پگلے کہیں کے اب تو تم پر تمہاری دلہن کا حق ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ مجھے خوشی ہو گی۔ اگر تم دونوں اچھی ازدواجی زندگی گزارو۔ میری دعائیں تم دونوں کے ساتھ ہیں۔ جاؤ بیٹے' دلہن کے ساتھ جاؤ۔ دلہن کے ساتھ جاؤ اور مہمانوں سے ملتے رہو۔ ورنہ لوگ کیا کہیں گے۔"

میں وہاں سے رخسانہ کے پاس آ گیا۔ وہ اپنی بے تکلف سہیلیوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی سہیلیوں نے مذاق کرنا شروع کیا۔ میں تھوڑی دیر تک ان سے جواباً مذاق کرتا رہا۔ پھر رخسانہ کا ہاتھ پکڑ کر ان کے درمیان سے یہ کہتے ہوئے لے گیا کہ بھئی اب تمہاری سہیلی پر میرا حق ہے۔ مجھے بھی کچھ باتیں کر لینے دو۔

میں اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھتا ہوا ایک طرف باغیچے میں پہنچا اور اس سے بولا۔ "یہاں تو کچھ عجیب چکر ہے۔"

رخسانہ نے پوچھا۔ "کیا کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔"

"نہیں' معلومات تو نہیں لیکن وہ ان کا ایک پرانا فیملی ڈاکٹر یہ کہتا ہے کہ ممی کو دل کا عارضہ نہیں ہے۔ کوئی ایسا مرض نہیں ہے جو تشویش ناک ہو۔ دراصل ممی کے دماغ میں وہم نے جڑ پکڑ لی ہے۔"

"ہاں' وہم سے تو آدمی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی انہیں دورہ بھی پڑتا ہو اور یہ محض وہم کی وجہ سے ہو۔"

"ہاں' یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ حشمت بیگ کبھی کسی کے پاس بہت دیر تک مجھے گفتگو کرنے کا موقع نہیں دیتا ہے۔ وہ ڈاکٹر کے پاس سے بھی مجھے گھسیٹ کر لے گیا تھا۔ پھر سابق وکیل سے میں باتیں کر رہا تھا کہ وہاں سے بھی وہ مجھے

یہ کہہ کر لے گیا کہ ممی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے میں ممی کے پاس پہنچا تو وہ کچھ بیمار سی نظر آرہی تھیں لیکن بالکل ٹھیک تھیں۔ انہوں نے پھر واپس مجھے تمہارے پاس بھیج دیا۔ بس میں اِدھر اُدھر چکرا رہا ہوں اور کوئی بھی بات پلے نہیں پڑ رہی ہے۔"

رخسانہ نے پوچھا۔ "کیا تم نے شکیلہ سے ملاقات کی؟"

"شکیلہ؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "کون شکیلہ کیا تم حشمت بیگ کی بیٹی کے متعلق پوچھ رہی ہو؟"

"ہاں۔ اسی کے متعلق۔ وہ ادھر دیکھو۔ گلابی ساڑھی پہنے ہوئے ہے اور جس کے بال بہت لانبے ہیں پیچھے کمر کے نیچے تک بکھرے ہوئے ہیں کم بخت اتنی خوبصورت لگ رہی ہے۔"

میں نے اس کے اشارے کے مطابق ادھر دیکھا تو ایک نہایت ہی حسین دوشیزہ نظر آئی۔ وہ گلابی ساڑھی میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ساڑھی پہننے کا انداز نہایت ہی دلکش تھا اور اس کی زلفیں واقعی اتنی گھنی اور اتنی لمبی تھیں کہ زندگی کا لمبا سفر ان کے سائے میں طے کیا جا سکتا تھا۔ میں اسے دیکھ کر سمجھ گیا کہ صاجزادہ تو اس پر ہزار جان سے مرمٹا ہو گا۔

رخسانہ نے کہا۔ "دور سے کیا دیکھ رہے ہو۔ قریب جاؤ۔ وہ تمہیں ضرور مخاطب کرے گی۔ کیونکہ وہ صاجزادہ سے عشق کرتی تھی۔"

میں نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تعجب ہے کہ حشمت بیگ نے شکیلہ سے میرا تعارف نہیں کرایا؟"

رخسانہ نے کہا۔ "تمہارے بیان کے مطابق باپ بیٹی میں کشیدگی ہے۔ اس لیے باپ نے بیٹی سے تعارف نہیں کرایا ہو گا۔"

"پھر بھی حشمت بیگ بہت محتاط رہنے والا ہے۔ وہ دور ہی سے شکیلہ کی طرف اشارہ کر کے مجھے بتا سکتا تھا کہ مجھے اس کی طرف سے بھی محتاط رہنا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ شکیلہ کبھی مجھے مخاطب کرے تو میں اسے اجنبی سمجھوں۔"

رخسانہ نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم اس کے سامنے جاؤ۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ میں یہاں کھڑی رہوں گی۔"

میں اس کی ہدایت کے مطابق آگے بڑھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ادھر گیا۔ جہاں وہ چند لڑکیوں کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ ان میں کچھ نوجوان لڑکے بھی شامل تھے۔ میں ان

کے قریب سے گزرنے لگا تو ایک لڑکی مجھے مخاطب کیا۔ "ہیلو۔ دولہا میاں۔ ایسی بھی کیا بے رخی ہم سے کترا کر جا رہے ہیں۔"

میں رک کر مسکرانے لگا۔ پھر میں نے کہا۔ "بے رخی کی بات نہیں ہے۔ اتنے سارے مہمان ہیں اور سبھی سے تھوڑی تھوڑی دیر باتیں کرنا پڑتی ہیں۔ اگر ایک ہی جگہ ٹھہر گیا تو پھر دوسروں کو شکایت ہو گی۔"

ایسا کہنے کے دوران میں نے شکیلہ کی طرف دیکھا۔ شکیلہ میری طرف سے انجان بنی منہ پھیرے کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے اس کا یہ رویہ عجیب سا لگا۔ میں معذرت چاہنے کے بعد ان کے پاس سے آگے بڑھ گیا۔

میں نے مرد حضرات کی بھیڑ میں گم ہو کر وہاں سے شکیلہ کو دیکھا۔ اب وہ ان لڑکی اور لڑکوں کی بھیڑ میں نہیں تھی۔ وہاں سے نکل کر وہ کوٹھی کے پورچ کی طرف جا رہی تھی۔ میں دور ہی دور سے اس کا تعاقب کرتا ہوا لوگوں کی آڑ لیتا ہوا اس پر نظر رکھے ہوئے بڑھتا رہا۔ پورچ کے ایک موٹے ستون کے پاس رک گیا۔ کیونکہ وہ بھی ایک کار کے پاس رک گئی تھی اور ایسے ہی وقت حشمت بیگ کوٹھی کے اندر سے نکل کر باہر آرہا تھا۔ دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے کے سامنے لمحے بھر کے لیے ٹھٹک گئے۔ پھر حشمت بیگ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر قریب آتے ہوئے پوچھا۔ "تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

وہ بے بسی سے بولی۔ "ڈیڈی' میں کیا کروں۔ میں تو ایک چیک کیش کرانے بنک کی طرف جا رہی تھی کہ رضیہ سلطانہ مل گئی۔ اس کے ساتھ اس کے والدین بھی تھے۔ وہ ضد کرنے لگے کہ انہیں اس کوٹھی کا پتہ بتایا جائے۔ بلکہ انہیں یہاں پہنچایا جائے۔ میں رضیہ سلطانہ کو کسی طرح ٹال سکتی تھی لیکن اس کے والدین کو ٹال نہ سکی۔ میں نے سوچا کہ ان کی کار میں بیٹھ کر اس کوٹھی کے سامنے تک آؤں گی' انہیں بتا کر یہاں سے چلی جاؤں گی اور اندر لوگوں سے سامنا نہیں کروں گی۔"

حشمت بیگ نے غصے سے پوچھا۔ "تو پھر یہاں کیوں نظر آرہی ہو؟"

"آپ سنیے تو سہی۔ خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔ یہاں دنیا بھر کے رشتہ دار ہیں۔ دوست احباب ہیں۔ ہمارے سب کے جانے پہچانے ہیں۔ ان سے خلاق و مروت کا ایسا ناتہ ہے کہ ان سے دور نہیں جایا جا سکتا۔ جب آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ تو دو باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ یہی حال یہاں آکر ہوا۔ کیے بعد دیگرے کتنے ہی رشتہ داروں نے مجھے پکڑ کر اپنی اپنی طرف بلایا۔ پھر شکایتیں کرنے لگے کہ میں آج کل نظر نہیں آتی ہوں۔ اب کر

طرح کترا کر یہاں آئی ہوں کہ یہاں ڈرائیور ہو گا تو میں اس سے کہوں گی کہ میری کوٹھی تک پہنچا دے۔"

"اچھی بات ہے۔ تم یہاں ٹھہرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ ڈرائیور کہاں ہے۔ میں ابھی بلا کر لاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف جانے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ سرونٹ کوارٹر میں ڈرائیور موجود ہو گا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے دیکھا۔ شکیلہ میری طرف پشت کیے کھڑی ہوئی تھی۔ میں آہستہ سے چلتا ہوا کار کی دوسری طرف آیا۔ پھر میں نے اچانک ہی مخاطب کیا۔ "ہیلو' شکیلہ۔"

وہ ایک دم سے اچھل کر پلٹ گئی۔ پھر مجھے دیکھنے لگی میں نے مسکرا کر کہا۔ "ایسی بھی کیا بے رخی۔ تم مجھ سے انجان کیوں بن رہی ہو۔"

وہ کچھ بدحواس سی ہو گئی۔ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے میں اصل میں بہت ہی الجھن میں ہوں۔ مجھے دراصل بنک جانا تھا اور یہاں آ کر پھنس گئی ہوں۔"

"تو ایسی بھی کیا بات ہے۔ میں تمہیں بنک تک ڈراپ کر سکتا ہوں۔ وہاں سے تمہیں کوٹھی کی طرف لے جاؤں گا۔"

"نہیں' مجھے صرف بنک تک جانا ہے۔"

میں نے کار کا درواہ کھولتے ہوئے کہا۔ "آؤ' بیٹھو۔"

وہ پھر ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "تم کیوں تکلیف کر رہے ہو۔ دلہن کو چھوڑ کر میرے ساتھ جاؤ گے۔ تو یہ سب لوگ کیا کہیں گے۔"

"کچھ نہیں کہیں گے۔ تم میرے انکل کی بیٹی ہو۔ میرا تمہارا گہرا رشتہ ہے۔ کیوں' اور رخسانہ کو میں سمجھتا ہوں۔ وہ تمہارے ساتھ جانے پر برا نہیں منائے گی۔ پھر دیر بھی کتنی لگنی ہے۔ آؤ چلو' میں تمہیں ڈراپ کر کے فوراً ہی واپس آجاؤں گا۔" یہ کہہ کر میں نے پھر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ کترا کر جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ بیٹھتے ہوئے بولی۔ "ڈیڈی ڈرائیو کو بلانے گئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ آجائیں۔ کیوں نہ میں ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤں۔"

میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "میری بھی تو کچھ خوشی ہے۔ چاہتا ہوں کہ تھوڑا سا وقت تمہارے ساتھ گزاروں کیا مجھے یہ خوشی پوری

کرنے کا حق نہیں ہے؟"

وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی تھی اور اب میں اسے کوٹھی کے احاطے سے باہر نکال کر کھلی سڑک پر ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "اوہو اب تو بنک کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ وہاں جانا فضول ہے۔ کیوں نہ میں تمہیں کوٹھی میں ڈراپ کر دوں۔"

وہ ایک دم سے گھبرا گئی۔ جلدی سے بولی۔ "نہیں میں ابھی کوٹھی میں نہیں جانا چاہتی۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیوں جھوٹ بول رہی ہو۔ تم اتنی بڑی دعوت چھوڑ کر واپس جا رہی ہو تو یقیناً وہ یاد آرہے ہوں گے۔ تم نے انہیں کوٹھی میں تنہا چھوڑ دیا ہو گا۔"

وہ میری طرف حیرانی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کون۔ تم کس کی باتیں کر رہے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "تمہارے شوہر کی بات کر رہا ہوں۔ تم انہیں اپنے ساتھ دعوت میں کیوں نہیں لے کر آئیں۔"

"میں ضروری نہیں سمجھتی تھی۔ ایک تو ان کو طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ میں تمہارے یہاں آنا جانا پسند نہیں کرتی ہوں۔ آج بڑی مجبوری یہ ہوئی کہ رضیہ سلطانہ اور اس کے والدین مجھے زبردستی لے آئے۔ وہاں دوسرے رشتہ داروں نے بھی مجھے گھیر لیا تھا"۔

"جب اتنی دور لے آیا ہوں تو کوٹھی تک بھی پہنچا دوں گا۔"

وہ تقریباً چیختے ہوئے بولی۔ "نہیں' میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میں کہتی ہوں گاڑی روک دو' ورنہ میں شور مچانا شروع کر دوں گی۔"

میں نے سہم کر گاڑی روک دی۔ کیونکہ اس کی ایسی حرکتوں سے راہ چلنے والے مجھے کوئی مجرم یا اغوا کرنے والا شخص سمجھ کر گھیر لیتے تو پٹائی شروع کر دیتے۔ بہرحال وہ گاڑی رکتے ہی دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ میں نے دروازے کو بند کیا۔ پھر وہاں سے گھوم کر واپس اپنی کوٹھی میں مہمانوں کے درمیان چلا آیا۔

رخسانہ نے مجھے دیکھتے ہی میرے قریب آ کر آہستگی سے پوچھا۔ "کیا ہوا' اس کے ساتھ کہاں گئے تھے؟"

میں آہستہ آہستہ ساری باتیں بتانے لگا۔ وہ سب کچھ سننے کے بعد سر ہلا کر بولی۔

"مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔ اس نے جان بوجھ کر تمہیں گاڑی روکنے کے لئے

کہا تھا اور راستے میں اتر گئی تھی۔ وہ تمہیں اپنی کوٹھی تک لے جانا نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی اپنے شوہر سے ملانا چاہتی تھی۔ اس کا شوہر آخر کون ہو سکتا ہے اور جیسا کہ میرا مشاہدہ ہے اور میں پہلے بھی اس کی حرکتیں دیکھ چکی ہوں۔ یہ صاجزادہ پر ڈورے ڈال رہی تھی۔ یقیناً اس نے صاجزادے سے ہی شادی کی ہے اور کسی مصلحت کی بنا پر اسے اپنی کوٹھی میں چھپا کر رکھا ہے۔"

میں نے اس پہلو پر بحث کرنے کے لئے پوچھا۔ "اگر صاجزادہ وہاں شکیلہ کا شوہر بنا ہوا ہے تو وہ اپنی ماں سے دور کیوں ہے اور اپنی ماں سے کیوں چھپ رہا ہے؟"

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "کوئی ایسی ہی مجبوری ہو گی۔ کوئی ایسا گناہ صاجزادہ سے سرزد ہو گیا ہو گا' یا کسی جرم کا وہ مرتکب ہوا ہو گا جس کے تحت وہ مجبور ہو کر شکیلہ اور اس کے باپ کے اشاروں پر ناچ رہا ہو۔ ہمیں اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہئے۔"

"مثلاً کیا کرنا چاہئے؟"

"کچھ تو کرنا ہی چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ تم یہاں صاجزادہ بن کر ان کی ممی سے نیکی کرتے رہو اور ادھر وہ کسی مصیبت میں پھنسا ہوا ہو اور اگر مصیبت میں نہ ہو تب بھی یہ تو دیکھنا ہی چاہئے کہ آخر یہ سب کھیل کیا کھیلا جا رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس کا تو ایک ہی راستہ ہے کہ ہم شکیلہ کی کوٹھی میں جا کر دیکھیں اور اس کے شوہر سے ملنے کی کوشش کریں۔"

"جب وہ انکار کر چکی ہے اور راستے ہی میں تمہاری گاڑی سے اتر گئی ہے تو وہ کبھی اپنی کوٹھی میں نہ تو آنے کی اجازت دے گی' نہ اپنے شوہر سے ملنے کا موقع دے گی۔ اس کا طریقہ بس یہی ہے کہ چوری چھپے اس کوٹھی میں داخل ہوا جائے اور حقیقت معلوم کی جائے۔"

رات گیارہ بجے تک آہستہ آہستہ تمام مہمان رخصت ہو گئے۔ وہ رشتہ دار جو دوسرے شہروں سے آئے تھے وہ کوٹھی کے مختلف کمروں میں جا کر سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ رخسانہ نے کہا۔ "کل سے شادی اور ولیمہ کی ایسی دھوم دھام ہو رہی ہے کہ میرا سر بری طرح دکھنے لگا ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ آج رات تمہارے ساتھ شکیلہ کی کوٹھی تک جاؤں گی لیکن اب میری ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ کیا تم تنہا وہاں جا سکتے ہو؟"

"وہاں جانا تو ہو گا۔ کچھ نہ کچھ تو معلوم کرنا ہی ہو گا۔ میں تنہا چلا جاؤں گا۔ تم آرام کرو اور انشاء اللہ ایک آدھ گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔"

رات کے ایک بجے میں چپ چاپ کوٹھی سے نکلا' مہمان تقریباً سو چکے تھے یا سونے والے تھے۔ جو جاگ رہے تھے ان میں سے کسی نے دیکھا بھی تو زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہی سمجھا گیا کہ میں باہر کسی کام سے جا رہا ہوں۔ میں پورچ میں کھڑی ہوئی کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

شہر کی سڑکیں ویران ہو گئی تھیں۔ کہیں کہیں اکا دکا گاڑیاں نظر آ جاتی تھیں' میں تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا شکیلہ کی کوٹھی کے سامنے پہنچ گیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے وہاں سے گیٹ کو پھلانگ کر کوٹھی کے احاطے میں داخل ہونا پڑے گا لیکن جب میں کار کو ایک طرف روک کر پیدل چلتا ہوا گیٹ کے پاس پہنچا تو اسے تھوڑا سا کھلا ہوا پایا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ ایسی لاپروائی کیسے کی جاتی ہے کہ مین گیٹ کو کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ میں اس گیٹ میں داخل ہو کر دبے قدموں چلتا ہوا کوٹھی کے دروازے تک جانے لگا۔ میرے دل میں ایک طرح سے ڈر بھی تھا کہ میں پکڑا جاؤں گا تو کیا ہو گا۔ پھر رخسانہ کی بات یاد آئی تھی کہ میں کوئی جرم نہیں کر رہا ہوں اپنے ہی چچا کے گھر میں داخل ہو رہا ہوں اور مجھے اس کا حق ہے' میں کوئی بھی بہانہ کر سکتا ہوں۔

میرا خیال تھا کہ کسی پائپ وغیرہ کے ذریعے چڑھ کر کوٹھی کی چھت پر پہنچنا ہو گا لیکن یہ دیکھ کر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ کوٹھی کا دروازہ کھلا ہوا تھا' اس کا ایک پٹ بالکل ایسے کھول دیا گیا تھا جیسے مجھے خوش آمدید کہا جا رہا ہو۔ میں جھجکتا ہوا دروازے کے پاس پہنچا۔ اندر بالکل سناٹا تھا' ویرانی تھی' کوئی نظر نہیں آ رہا تھا' کسی کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میں نے دروازے پر کھڑے ہو کر سوچا میں کوئی جرم کرنے تو آیا نہیں ہوں اس لئے گھبرانے کی کیا بات ہے اور چوری چھپے داخل ہونے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ میں باقاعدہ شکیلہ کو آواز دے کر اندر جا سکتا ہوں اگر اس نے اعتراض کیا تو میں ضد کروں گا کہ اس کے شوہر سے ملاقات کر کے ہی واپس جاؤں گا۔ یہ سوچ کر میں نے دروازے پر دستک دی' کوئی جواب نہ ملا۔ پھر مجھے خیال آیا تو کال بیل کا بٹن دبایا۔ کوٹھی کے اندر دور تک گھنٹی کی آواز سنائی دی لیکن جواب میں کوئی آواز مجھے نہیں سنائی دی۔ تب میں کچھ پریشان سا ہوا کہ بات کیا ہے۔ میں آہستہ آہستہ قدم بڑھتا ہوا کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا اور ایک کوریڈور میں پہنچا۔ کوریڈور کے دوسری طرف ایک کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ادھر سے آہستہ آہستہ کسی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں دبے قدموں آگے بڑھتے

ہوئے اس آواز کو سننے لگا' کوئی عورت تھی۔ کراہتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "ہاں' میں بُری طرح زخمی ہوں' مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔ خدا کے لئے جلدی ایمبولینس لے کر آیئے اور مجھے طبی امداد پہنچایئے۔ ہاں وہی پتہ جو میں نے بتایا ہے' جلدی آیئے۔"

میں اس وقت کھڑکی کے پاس پہنچ گیا تھا۔ میں نے اندر دیکھا تو وہی گلابی ساڑھی والی فرش پر اوندھی پڑی ہوئی تھی اور ٹیلی فون کا کریڈل چھوٹی سی میز کے اوپر تھا اور ریسیور نیچے پڑا ہوا تھا۔ میں نے پہچان لیا کہ وہ شکیلہ ہے۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور اسے آوازیں دیتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ پھر میں نے قریب پہنچ کر دیکھا تو وہ آنکھیں بند کئے ہوئے تھی۔ میں نے اسے جھنجھوڑا۔ تو اس نے جواب نہیں دیا پھر میں نے اسے سیدھی طرح لٹایا تو ایک دم اچھل کر پیچھے چلا گیا۔ کیونکہ اس کا سینہ خون سے تربتر تھا۔ کسی نے چاقو سے اس پر حملہ کیا تھا اور وہ بُری طرح زخمی ہو کر آنکھیں بند کئے پڑی تھی' میں نے آواز دی۔ پھر قریب جا کر اسے جھنجھوڑا تو وہ بالکل ہی بے حس و حرکت نظر آئی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر چھوڑا تو اس کا ہاتھ فرش پر گر پڑا۔ تب میں سمجھ گیا کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی۔ کسی نے اسے ہلاک کر دیا ہے۔

میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ میں نے پہلے کبھی ایسا منظر نہیں دیکھا تھا اس لئے میرے دل پر بُری طرح خوف طاری ہو گیا تھا۔ میں الٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے وحشت زدہ نظروں سے اس لاش کو دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر آ گیا۔ میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا' بھاگو یہاں سے بھاگ جاؤ' ورنہ قتل کے الزام میں بُری طرح پھنسنے والے ہو۔

وہاں سے میں بے تحاشہ بھاگنے لگا۔ کوریڈور سے گزر کر ڈرائنگ روم کو عبور کر کے کوٹھی کے باہر آیا۔ وہاں سے میں احاطے سے گزرنے کے بعد اپنی کار کے پاس آیا جلدی سے دروازہ کھول کر سٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھا۔ پھر اسے سٹارٹ کر کے یہ جا اور وہ جا۔ حالانکہ میں نے نئی نئی ڈرائیونگ سیکھی تھی اس کے باوجود میں اتنی تیزی سے کار چلا رہا تھا جیسے کئی برس کا ڈرائیونگ کا تجربہ ہو۔

☆------☆------☆

میں کوٹھی کے سامنے پہنچا تو چوکیدار نے گاڑی کے لئے بڑا سا گیٹ کھول دیا۔ میں ڈرائیو کرتا ہوا کوٹھی کے پورچ میں پہنچا' وہاں دو تین مہمان بیٹھے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "صاحبزادے کہاں سے آ رہے ہو؟ عجیب بات ہے' ہمیں بھی نیند نہیں آ رہی ہے اور تمہیں بھی نہیں آ رہی ہے۔"

ایک نے کہا۔ "ابھی نئی دلہن آئی ہے' انہیں تو نیند بالکل نہیں آئے گی۔"

یہ سن کر سب ہنسنے لگے' میں اندر سے کتنا پریشان تھا اور میرے چہرے پر کیسی گھبراہٹ ظاہر ہو رہی تھی ان ہنسنے بولنے والوں نے یہ نہیں سمجھا۔ میں جلدی سے ان کے پاس سے گزرتا ہُوا کوٹھی کے اندر داخل ہوا تو حشمت بیگ ادھر سے آ رہا تھا' اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ "یہ تم اتنی رات کو کہاں گئے تھے اور کہاں سے آ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "میں ذرا ہوا خوری کے لئے گیا تھا۔ گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" یہ کہہ کر میں اس سے کترا کر جانا چاہتا تھا کہ اس نے آواز دی۔ "کیا بات ہے؟ اگر کوئی پریشانی ہو تو مجھے بتاؤ کیونکہ تمہارے چہرے سے پریشانی صاف ظاہر ہو رہی ہے۔"

"کوئی خاص بات نہیں۔ وہ ذرا رخسانہ سے یونہی ناراضگی ہو گئی تھی۔ میں ابھی جا کر اسے منا لوں گا۔"

یہ بہانہ بنا کر میں اس سے پیچھا چھڑا کر اپنی خواب گاہ میں آیا۔ وہاں رخسانہ میری منتظر تھی۔ "وہاں شکیلہ کی کوٹھی میں تو اس کا قتل ہو گیا ہے۔"

وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی' اچھل کر بیٹھ گئی' اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کس کا قتل ہُوا ہے۔"

"وہی شکیلہ کا' پتہ نہیں کس نے قتل کر دیا ہے۔ جس وقت میں وہاں پہنچا تو وہ ریسیور ہاتھ میں پکڑے کسی کو کہہ رہی تھی کہ اسے فوراً طبی امداد پہنچائی جائے۔ میں جب

وہاں پہنچا تو اس وقت تک وہ فون کرنے کے بعد بالکل ساکت ہو گئی تھی' اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اسے سیدھا کیا تو پتہ چلا کہ کسی نے اس پر چاقو سے حملہ کیا تھا۔ وہ لہو میں ڈوب رہی تھی اور بالکل بے حس و بے حرکت ہو گئی تھی۔ میں اس کی لاش کو چھوڑ کر وہاں سے بھاگتا ہُوا یہاں آیا ہوں۔"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "اسے کس نے قتل کیا ہو گا' کیا تم اس کے شوہر سے ملے تھے؟"

"مجھے تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ میں نے اس کے شوہر کو نہیں دیکھا' ہو سکتا ہے کہ وہاں کسی دوسرے کمرے میں کوئی موجود ہو لیکن میں تو دہشت زدہ ہو گیا تھا اور اس قتل کے الزام سے بچنے کے لئے وہاں سے بھاگتا ہُوا آ گیا ہوں۔ وہاں ٹھہرنا تو مناسب نہیں تھا۔"

بے چاری رخسانہ میرے لئے پریشان ہو گئی۔ اندیشہ ظاہر کرنے لگی کہ کوئی مجھے اس قتل کے الزام میں پھنسانا چاہتا تھا اور اگر ایسا بھی نہ چاہتا ہو تو میں اس واردات والی جگہ سے ہو کر آیا ہوں' کسی نے مجھے دیکھا ہو گا تو خواہ مخواہ قاتل سمجھا جاؤں گا۔ میں بھی یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا اور یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر شکیلہ کا قتل کیوں ہُوا اور کس نے کیا۔

اس رات ہماری آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔ رات کے تین بجے ہم نے کوٹھی کے باہر کار کے سٹارٹ ہونے اور وہاں سے روانہ ہونے کی آواز سنی۔ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "اتنی رات کو باہر کون جا سکتا ہے' میں ابھی دیکھ کر آتا ہوں۔"

رخسانہ بھی اٹھ کر میرے ساتھ ہو گئی۔ ہم دونوں اپنے کمرے سے باہر آئے تو کوٹھی میں اچھے خاصے لوگ مرد عورتیں سبھی جاگے ہوئے تھے' ہم نے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے تو ایک عزیز نے بتایا کہ حشمت بیگ کی لڑکی شکیلہ کا قتل ہو گیا ہے۔ اس کے پڑوسی نے اطلاع دی ہے۔ ابھی ابھی تمہاری ممی اور انکل حشمت بیگ یہاں سے گئے ہیں۔ دیکھیں واپس آ کر کیا خبر سناتے ہیں۔ خوشی کے گھر میں اتنا بڑا المیہ ہو جائے یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ اللہ سب کو ایسے حادثوں اور وارداتوں سے محفوظ رکھے۔

ان کی باتیں سننے کے بعد ہم اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔ میں بری طرح سہما ہوا تھا' رخسانہ نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔"

"رخسانہ' اب میری سمجھ میں ایک ایک بات آ رہی ہے اور وہ یہ کہ میرے لئے یہ سب جال بچھایا گیا تھا۔ مجھے صاحبزادہ بنا کر یہاں لایا گیا ہے اور مجھے اسی قتل کے الزام میں پھنسایا جائے گا۔"

وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولی۔ "تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ بھلا کون تم پر قتل کا الزام لگا سکتا ہے' کس نے تمہیں وہاں قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے؟ جب تک کوئی چشم دید گواہ نہ ہو اس وقت تک قانون یہ تسلیم نہیں کرتا کہ کوئی قاتل ہے۔ تمہارا کوئی چشم دید گواہ نہیں ہے۔ تمہیں اطمینان رکھنا چاہئے۔"

رخسانہ کی یہ باتیں سن کر مجھے بڑا اطمینان ہُوا۔ واقعی چشم دید گواہ کوئی نہیں تھا اور اگر وہاں کوئی چھپا بھی ہو تو اس کی گواہی یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ میں نے وہاں جا کر قتل کیا تھا۔ کیونکہ وہاں چھپنے والے کو بھی اس کی معقول وجہ پیش کرنی ہو گی کہ وہ وہاں کیوں چھپا ہُوا تھا۔ میں نے اپنے ذہن پر زور ڈال کر سوچا تو یاد آیا کہ اس وقت ایسی کوئی فلش لائٹ بھی نظر نہیں آئی تھی کہ جس سے یہ شبہ ہوتا کہ کسی نے میری تصویر بھی اتاری ہے۔ واقعی مجھے پریشان نہیں ہونا چاہئے تھا۔

اس رات ہم سو نہ سکے۔ اطمینان ہونے کے باوجود نیند آنکھوں سے اڑ گئی تھی۔ رخسانہ نے ایک گھنٹے بعد شکیلہ کی کوٹھی کے فون نمبر پر رابطہ قائم کیا۔ وہ حشمت بیگ یا ممی سے معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ادھر کسی سپاہی نے ریسیور اٹھایا تھا اور اس نے بتایا کہ یہاں وہ لوگ نہیں ہیں۔ جس لڑکی پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اسے پولیس کی نگرانی میں ہسپتال لے جایا گیا ہے۔

یہ سن کر اور اطمینان ہوا کہ شکیلہ ابھی مری نہیں تھی۔ اس میں زندگی کے آثار تھے' تبھی ہسپتال لے جایا گیا ہو گا۔

رخسانہ نے دوبارہ ٹیلی فون پر رابطہ قائم کرتے ہوئے اس ہسپتال کا نام پوچھا جہاں شکیلہ کو لے جایا گیا تھا۔ پھر اس نے ٹیلیفون کے ذریعے اپنے والدین کو اس واردات کی اطلاع دی اور ان سے کہا کہ اس کے لئے ایک کار بھیج دی جائے۔

تھوڑی دیر بعد کار اس کوٹھی میں پہنچ گئی۔ رخسانہ مجھے ساتھ لے کو اس ہسپتال کی طرف روانہ ہوئی۔ ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ شکیلہ کے بچنے کی امید ہے یا نہیں اور اگر اسے ذرا بھی ہوش آیا ہے تو اس نے قاتل کا نام تو ضرور بتا دیا ہو گا یا کوئی نہ کوئی نشاندہی ضرور کی ہو گی۔

جب ہم ہسپتال پہنچے تو صبح ہونے والی تھی۔ ادھر سے رخسانہ کے والدین دوسری کار میں پہنچ گئے تھے۔ ہم سب انکوائری کاؤنٹر سے معلوم کرنے کے بعد اس وارڈ میں گئے جہاں شکیلہ کو رکھا گیا تھا اور جہاں پولیس والوں کا پہرہ تھا۔ کسی نے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ حشمت بیگ ایک برآمدے میں ٹہل رہا تھا اور وہیں ایک کرسی پر ممی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہاں چار سپاہی اور ایک پولیس انسپکٹر بھی تھا اور وہ لوگ آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی حشمت بیگ نے چیخ کر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہے صاحبزادہ اسی نے میری بیٹی کو قتل کیا ہے۔“

اس کی بات سن کر میں ٹھٹک گیا' ایک دم سے گھبرا گیا۔ پولیس والوں نے میری طرف دیکھا' پھر تیزی سے آگے بڑھے۔ جتنی دیر میں میں سنبھلتا اتنی دیر میں دو سپاہی میرے آس پاس کھڑے ہو گئے تھے اور انہوں نے میرے بازوؤں کو پکڑ لیا تھا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں' میں نے آپ کی بیٹی کو قتل نہیں کیا ہے۔“

انسپکٹر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اس پر قاتلانہ حملہ کر کے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ مر چکی ہے لیکن اس میں جان باقی تھی۔ اس نے پولیس والوں کو اطلاع دی تھی کہ اسے طبی امداد پہنچائی جائے۔ پھر وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ہم اسے یہاں لے آئے۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے۔ بالآخر وہ تھوڑی دیر کے لئے ہوش میں آئی تو ہم نے اس سے بیان لیا اور اس کا بیان کیسٹ میں ریکارڈ بھی کیا۔ اس نے صاف طور پر کہا ہے کہ اس کے قاتل تم ہو اگر تمہارا نام صاحبزادہ ہے۔“

میں نے فوراً ہی پوچھا۔ ”کیا اس نے یہی کہا تھا کہ اسے صاحبزادے نے قتل کیا۔“

انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ”ہاں' اس نے کہا تھا کہ وہ اس وقت پورے ہوش و حواس میں ہے اور یہ بیان دے رہی ہے کہ اسے صاحبزادے نے قتل کیا ہے۔ وہ صاحبزادہ جو اکرم بیگ کا لڑکا ہے' کیا تمہارے والد کا نام اکرم بیگ نہیں ہے؟“

تب میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”نہیں میرا نام عبدالعلیم ہے اور میرے والد کا نام کلیم اللہ تھا' میں صاحبزادہ نہیں ہوں۔“

حشمت بیگ نے آگے بڑھ کر غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ ”جھوٹ نہ بولو۔ تم قتل کے الزام سے بچنے کے لئے اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اکرم بیگ کے بیٹے عظیم بیگ ہو اور تمہیں صاحبزادہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔“

میں نے بھی جواباً چیخ کر کہا۔ ”تم جھوٹ نہ بولو۔ تم مجھے صاحبزادہ بنا کر یہاں لائے

تھے اور مجھے اس ہمدردی کے لئے مجبور کیا تھا کہ میں ایک ماں کی زندگی بچانے کے لئے اس کا بیٹا بن جاؤں' کیونکہ یہ بوڑھی خاتون اپنے بیٹے کی جدائی کا صدمہ برداشت نہیں کر رہی ہیں' میں ایک نیکی اور ہمدردی کی خاطر صاحبزادہ بن کر یہاں آ گیا تھا۔“

رخسانہ کے والد نے غصے سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میاں صاحبزادے کیا باتیں کر رہے ہو۔ اگر تم صاحبزادہ نہیں ہو' اگر تم ان خاتون کے ساتھ نیکی کرنے آئے تھے تو میری بیٹی کے ساتھ تم نے کون سی نیکی کی ہے۔ اگر تم صاحبزادہ نہیں ہو تو تمہیں کیا حق پہنچتا تھا کہ تم صاحبزادہ کے نام سے میری بیٹی کے ساتھ نکاح پڑھاؤ۔“

رخسانہ نے کہا۔ ”ابو' آپ ان پر ناراض نہ ہوں۔ یہ ایک نہایت ہی شریف اور ایماندار شخص ہیں۔ انہوں نے شادی کی رات مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ صاحبزادہ نہیں ہیں' میں ان کی دلہن نہیں ہوں اور یہ میرے مجازی خدا نہیں ہیں۔ ہم دونوں کل رات سے محض دو دوستوں اور دو شریف انسانوں کی طرح ایک ساتھ رہے ہیں۔“

رخسانہ کی ماں نے کہا۔ ”بیٹی تم یہ کیسی بے شرمی کی باتیں کر رہی ہو' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم ایک ایسے شخص کے ساتھ جو تمہارا شوہر نہ ہو' اس پر اعتبار کرتی ہو۔ اس کے ساتھ کل سے تنہا رہ رہی ہو............“

”امی یہ اس قابل ہیں کہ ان پر اعتماد کیا جا سکے۔ انہوں نے صاحبزادہ کی امی کے ساتھ نیکی کی ہے۔ ان کو بتایا گیا تھا کہ یہ دل کی مریضہ ہیں' اگر ان کو بیٹا جلدی واپس نہ ملا تو یہ زندہ نہیں رہ سکیں گی۔ یہ ایک خاتون کی زندگی بچانے کے لئے بیٹا بن کر اس گھر میں آ گئے تھے لیکن انہوں نے کسی کو جانی یا مالی نقصان نہیں پہنچایا۔ نہ ہی صاحبزادہ کی ممی کو اور نہ مجھے۔ اگر یہ چاہتے تو مجھے تباہ و برباد کر سکتے تھے۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔ میں ان کی احسان مند ہوں اور ان کی عزت کرتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ آپ بھی ان کی قدر کریں۔“

حشمت بیگ نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ”واہ کیا قدر کی جا رہی ہے۔ رخسانہ اگر تمہیں معلوم ہوا تھا کہ یہ اصلی صاحبزادہ نہیں ہے' اس کا کوئی ہمشکل ہے تو تمہارا فرض تھا کہ تم ہمیں اطلاع دیتیں۔ کیا تم یہ نہیں سوچ سکتی تھیں کہ وہ کوئی بہت بڑا فراڈ کرنے آیا ہے اور جو تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے کسی کو جانی یا مالی نقصان نہیں پہنچایا تو میرے دل سے پوچھو کہ اس نے میری بیٹی کو قتل کر کے کیا جانی نقصان پہنچایا ہے یا نہیں اور اس کے

علاوہ یہ پتہ نہیں، چیک بک وغیرہ پر دستخط کر کے کتنا فراڈ کر چکا ہو گا۔ اب تو ہمیں شروع سے حساب کرنا ہو گا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ممی کی طرف پلٹ گیا۔ وہ گم صم بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے ممی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "بھابی، آپ خاموش کیوں بیٹھی ہیں۔ ادھر اس شخص کی طرف دیکھئے۔ یہ جو اب تک آپ کا بیٹا بنا ہوا تھا، اب کہہ رہا ہے کہ یہ آپ کا بیٹا نہیں ہے۔ کیا آپ اسے پہچان سکتی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ مائیں ہزاروں روپ میں بھی اپنی اولاد کو پہچان لیتی ہیں۔ کیا آپ پہچان سکتی ہیں۔"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا کر کہا۔ "ہاں، میرا بیٹا خواہ کسی بھی روپ میں رہے، کسی رنگ میں رہے، کسی انداز میں رہے میں اسے ہزاروں لاکھوں میں پہچان سکتی ہوں۔ یہ میرا بیٹا ہے اور میں اپنے بیٹے سے کہتی ہوں کہ اپنے باپ کا نام تبدیل نہ کرو۔ تمہارے باپ کا نام اکرم بیگ تھا اور یہ نہایت ہی غلط بات ہے کہ تم اپنی ولدیت سے انکار کرو۔ اس طرح مجھے گالی پڑے گی۔"

ہم آپس میں بحث کر سکتے تھے۔ ایک دوسرے کی مخالفت میں بڑھ بڑھ باتیں کر سکتے تھے۔ جھگڑا کر سکتے تھے لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ نتیجے پر تو قانون پہنچاتا ہے۔ اس لئے پولیس انسپکٹر ہم سب کو تھانے لے گیا۔ وہاں ہمارا بیان باری باری لیا گیا۔ مجھے اپنے بیان میں یہ کہنا پڑا کہ میں آج پچھلی رات ایک بجے اپنی کوٹھی سے نکل کر شکیلہ کی کوٹھی کی طرف گیا تھا اور جانے کی وجہ بھی بتائی تھی کہ اس پر کچھ شبہ تھا اور ہم یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آخر اس کا شوہر کون ہے اور وہ ہم رشتہ داروں سے کترا کر کیوں رہتی ہے۔

بیان لینے کے بعد سب کو چھوڑ دیا لیکن مجھے حراست میں رکھا گیا۔ کیونکہ میرے خلاف مقتولہ نے بیان دیا کہ صاحبزادہ ولد اکرم بیگ نے اس پر.......... قاتلانہ حملہ کیا تھا اور دوسری بات یہ کہ رات کے ایک بجے میرا گھر سے نکلنا، شکیلہ کے ہاں جانا ان کے شبہات کو تقویت پہنچا رہا تھا۔ اس لئے مجھے حوالات میں رکھا گیا اور وہاں سے کسی دن جیل بھیجا جانے والا تھا۔ میں نے رخسانہ کو بلا کر کہا۔ "دیکھو، میرا اس دنیا میں میری امی کے سوا کوئی نہیں ہے۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں اپنی ماں کا باقاعدہ علاج کرا سکتا پھر میں اتنی رقم کہاں سے لاؤں گا کہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے مقدمہ لڑ سکوں۔ اگر تم میرے لئے کچھ کر سکتی ہو، تو ضرور کرنا۔ میں اس احسان کا بدلہ کسی طرح

چکانے کی کوشش کروں گا۔"

رخسانہ مجھے تسلیاں دے کر چلی گئی کہ وہ میرے لئے ضرور کچھ کرے گی۔ ممی وہاں سے جاتے وقت بہت رو رہی تھیں اور مجھ سے محبت کا اظہار کر رہی تھیں۔ میں نے سلاخوں کے پیچھے سے نفرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "ممی، اب تو آپ کو ممی کہنا بھی مجھے برا لگ رہا ہے۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو رہا ہے۔ اگر میری جگہ آج آپ کا بیٹا ہوتا اور اس پر الزام لگایا جاتا تو آپ اسے بیٹا ماننے سے انکار کر دیتیں لیکن آپ مجھے قانون کے ہتھے چڑھانے اور مجھ پر الزام ثابت کرنے کے لئے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میں آپ کا اور اکرم بیگ کا بیٹا ہوں، آپ مجھے اپنا بیٹا کہہ رہی ہیں۔ حالانکہ آپ اچھی طرح سمجھ گئی ہیں کہ میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں۔ بیٹا آپ کا وہی تھا جس نے شکیلہ کو قتل کیا تھا اور اتنے عرصے تک اسی شہر میں ہی چھپا ہوا تھا۔"

ممی نے روتے ہوئے کہا۔ "بیٹے، تم کچھ بھی کہو۔ میں تمہاری ماں ہوں اور تم میرے بیٹے ہو۔ میں ساری عمر تمہارے لئے روتی اور تڑپتی رہوں گی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اولاد کی خاطر قانون کو دھوکہ دوں۔ میں ایک .... پُرامن شہری ہوں اور جرائم کے خلاف گواہی دینا اور قانون کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔"

وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے وہاں سے حشمت بیگ کے ساتھ چلی گئیں۔ میں سلاخوں کے پیچھے ناکردہ جرم کی سزا پانے کے لئے تنہا رہ گیا۔ اب نہ تو کوئی دولت مند ماں تھی نہ چچا تھا، نہ دنیا بھر کے رشتہ دار تھے۔ رخسانہ سے تو بیوی کے رشتے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا اور کوئی محبت کی امید بھی نہیں تھی کہ وہ محبت کے جذبے سے میرے پاس دوبارہ آئے گی۔ ہمدردی کی توقع رکھ سکتا تھا اور یہ توقع صحیح ثابت ہوئی۔ وہ دوسرے دن بھی مجھ سے ملنے آئی۔ باہر کیا ہو رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا۔ اسی نے بتایا کہ شکیلہ کے کمرے سے بہت کچھ برآمد ہوا ہے۔ ایسی چیزیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ صاحبزادہ وہاں رہا کرتا تھا اور ایک نکاح نامہ بھی ملا ہے جس کی رو سے صاحبزادہ اور شکیلہ دونوں میاں بیوی تھے۔ ان کی شادی ہو چکی تھی۔

میں نے کہا۔ "پھر تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصلی صاحبزادہ اسی شہر میں اور شکیلہ کی کوٹھی میں چھپا ہوا تھا اور اس کی ممی کے پاس اب انکار کی گنجائش نہیں ہو گی کہ ان کا بیٹا وہ ہے جو اب تک چھپا ہوا ہے۔"

رخسانہ نے کہا۔ "عبدالعلیم تم نہیں جانتے کہ یہ لوگ کتنے مکار ہیں۔ وہ صاحبزادہ

کی ممی یہ کہہ رہی ہیں کہ تمھی ان کے بیٹے ہو اور تم نے ہی چھپ کر شکیلہ سے شادی کی تھی اور یہ بات ماں سے چھپائی تھی اور دوسری شادی مجھ سے کرلی ہے۔"

میں نے نفرت سے کہا۔ "میں اسے ایک معزز ماں کا درجہ دے رہا تھا۔ اس کا احترام کر رہا تھا۔ مگر وہ ایک نہایت ہی ذلیل عورت ثابت ہو رہی ہے۔ اپنے بیٹے کو بچانے کے لئے مجھے قتل کے الزام میں ملوث کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ اسی لئے اس طرح کے جھوٹے بیانات دے رہی ہے۔"

رخسانہ نے مجھے تسلی دی۔ "تم فکر نہ کرو۔ ہم تمہارے لئے یہاں کے سب سے قابل اور تجربہ کار وکیل کی خدمات حاصل کریں گے اور اس سے مشورہ کریں گے کہ تمہیں بچانے کے لئے وہ کیا کر سکتا ہے۔"

وہ تسلیاں دے کر جانے لگی۔ میں نے آواز دی۔ "رخسانہ' رک جاؤ۔ ایک بات میرے دماغ میں آ رہی ہے اور وہ یہ کہ جب میں نے تم سے نکاح پڑھایا تو صاحبزادہ کے نام سے میں نے نکاح نامہ پر دستخط کئے تھے۔ شکیلہ سے جو نکاح پڑھایا گیا' اس نکاح نامے پر صاحبزادہ نے خود اپنے ہاتھ سے دستخط کئے ہوں گے۔ میرے اور اس کے دستخط میں کچھ نہ کچھ تو فرق ضرور ہو گا۔ اس طرح یہ ثابت ہو جائے گا اور ممی کا یہ بیان غلط ثابت ہو گا کہ میں نے ہی شکیلہ سے چھپ کر شادی کی تھی بلکہ یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہم دو مختلف آدمی ہیں۔ ایک نے تم سے اور دوسرے نے شکیلہ سے شادی کی تھی اس طرح اس صاحبزادے کا ایک الگ وجود بھی ثابت ہو گا اور ممی کا بیان بھی غلط ہو جائے گا۔"

وہ چلی گئی۔ شام کو پھر اپنے والدین کے ساتھ واپس آئی۔ اس وقت ان کے ساتھ ایک پولیس آفیسر بھی تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ڈبہ تھا۔ وہ تھانیدار کو ساتھ لے کر میرے پاس آیا میں سلاخوں کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ اس پولیس آفیسر نے کہا۔ "میں نے یہاں صاحبزادہ کے تمام رشتہ داروں سے اور کاروباری لوگوں سے دریافت کیا ہے اور شہر میں جتنے لوگ جانتے ہیں' ان میں سے کچھ لوگوں سے بھی یہ معلوم کیا تو پتہ چلا کہ صاحبزادہ چھپکلی سے ڈرتا تھا اور اسے دیکھتے ہی اس کی چیخیں نکل جاتی تھیں۔ اس پر بیہوشی طاری ہو جاتی تھی۔ اگر تم صاحبزادہ نہیں ہو تو اس ڈبے کو کھولو۔ اس کے اندر چھپکلی ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اس سے ڈرتے ہو یا نہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے وہ ڈبہ سلاخوں کے درمیان سے گزار کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے اس ڈبے کو لیا اور اسے کھول کر دیکھا۔ اس کے اندر ایک چھپکلی تھی اور ڈبے کی

ایک دیوار سے چپکی ہوئی تھی۔ ڈبہ کھلتے ہی وہ تیزی سے رینگتی ہوئی اوپر ڈبے کے ڈھکن تک آئی۔ میں اسی طرح ڈبے کو پکڑے کھڑا رہا اور مسکراتے ہوئے دیکھتا رہا۔

پولیس آفیسر نے مسکرا کر سرہلاتے ہوئے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ ڈبے کو اب بند کر دو۔"

میں نے ڈبے کو بند کر دیا اور اسے اس کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد وہ تھانیدار کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔

ان کے جانے کے بعد رخسانہ نے خوش ہو کر کہا۔ "اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تم ممی کے وہ بیٹے نہیں ہو جو چھپکلی سے ڈرتا ہے اور چیخیں مار کر بیہوش ہو جاتا ہے۔ ہم کل وکیل کے ساتھ کورٹ میں جائیں گے اور وہاں سے تمہارے لئے ضمانت کی درخواست پر اجازت لے کر آئیں گے تو انشاء اللہ تمہیں فیصلہ ہونے تک رہائی ملے گی اور تم ہمارے ساتھ رہو گے۔ ہم تمہارا مقدمہ لڑیں گے۔"

"رخسانہ' تم بہت اچھی ہو۔ جو کچھ تم میرے لئے کر رہی ہو شاید میں اس کا بدلہ کبھی نہ دے سکوں۔ میری حیثیت ہی کیا ہے۔ ویسے ان حالات میں مجھے امی بہت یاد آتی ہیں۔ وہ ہمیشہ دعائیں دیا کرتی تھیں کہ مجھ پر کوئی مصیبت نہ آئے اور اگر مصیبت آئے بھی تو سر سے گزر جائے۔ مجھے پتہ نہ چلے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے ساتھ کچھ ایسے ہی ہو رہا ہے۔ مصیبتیں آ رہی ہیں اور تمہارے ذریعے گزرتی جا رہی ہیں۔ وہ یقیناً سینی ٹوریم کے بیڈ پر پڑی ہوئی میرے لئے دعائیں مانگ رہی ہوں گی۔ حالانکہ انہیں پتہ بھی نہیں ہے کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔"

اس نے کہا۔ "اگر تم کہو تو میں تمہاری امی سے جا کر ملوں اور انہیں تمام حالات بتا دوں۔"

میں نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں ایسا کبھی نہ کرنا۔ وہ بیمار ہیں اور انہیں کسی قسم کا صدمہ نہیں پہنچنا چاہیے۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ میں قتل کے کیس میں ملوث ہو گیا ہوں تو ان کا سکون برباد ہو جائے گا اور وہ فکر میں مبتلا ہو جائیں گی' ایسی صورت میں صحت یاب ہونے کے بجائے اور زیادہ ان کی صحت بگڑتی جائے گی۔" یہ کہہ کر میں نے ایک سرد آہ بھری بس جی چاہتا تھا کہ جلد سے جلد یہ مصیبت ٹل جائے اور میں اپنی ماں کے پاس پہنچ جاؤں۔ اب مجھے پتہ چل رہا تھا کہ میں غریب تھا' فاقے کرتا تھا اور بہت سی مصیبتیں اٹھاتا تھا لیکن ماں کی ممتا کے سائے میں' ان کی نظروں کے سامنے اور ان کی

آغوش میں مجھے اتنا سکون ملتا تھا کہ میں وہ سکون دولت مندوں کی دنیا میں .... کبھی نہ حاصل کر سکا۔

☆======☆======☆

دوسرے دن مجھے ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ اب پولیس والوں کو اصلی صاجزادے کی تلاش تھی۔ پتہ نہیں' وہ کہاں چھپا ہوا تھا کہ قانون کی نظروں میں نہیں آ رہا تھا۔ رخسانہ مجھے اپنے ہاں لے گئی۔ اپنی کوٹھی کے سامنے ہی انیکسی میں رہنے کی جگہ دی' وہ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ میرے ساتھ تینوں وقت کھانا کھاتی تھی اور میرے سونے' اٹھنے' بیٹھنے اور دوسری ضروریات کا پورا پورا خیال رکھتی تھی۔ ایک بار وہ میرے ساتھ امی سے ملنے کے لئے سینی ٹوریم بھی گئی۔ وہاں امی نے اسے دیکھ کر بہت سی دعائیں دیں۔ انہوں نے بتایا کہ ایک رات انہوں نے بہت ہی بھیانک خواب دیکھا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ میں پھانسی کے تختے پر کھڑا ہوا ہوں اور میرے گلے میں پھندا ڈالا جا رہا ہے۔ اچانک ہی ان کی آنکھ کھل گئی۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ امی اسی بیماری میں اٹھ کر سجدے میں گر پڑیں اور گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگیں کہ ان کے بیٹے کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

جب وہ ایسا کہہ رہی تھیں تو میں تعجب سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ انہوں نے وہی دن' وہی رات بتائی تھی جس دن ہمارا ولیمہ ہوا تھا اور جس رات میں شکیلہ کی کوٹھی میں گیا تھا اور اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ ٹھیک ایسے ہی وقت جبکہ میں پھنسنے کے لئے جا رہا تھا' امی نے سجدے میں پہنچ کر میرے لئے دعائیں مانگی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ ماں کی دعائیں ہیں جو اثر دکھا رہی ہیں۔

لیکن دعاؤں کا تعلق روحانیت سے ہے اور دواؤں کا تعلق مادیت سے۔ کوئی بھی دعا جب قبول ہوتی ہے اور اپنا اثر دکھاتی ہے تو اس کے لئے مادی ذرائع تلاش کرتی ہے۔ مثلاً یہ کہ امی کی دعائیں اس طرح قبول ہوئیں کہ صاجزادے نے شکیلہ کو پوری طرح چاقو سے حملہ کر کے اسے قتل نہیں کیا تھا' اسے جان کنی کی حالت میں چھوڑ دیا تھا۔ اگر وہ بھرپور انداز میں حملہ کر کے اسے قتل کر دیتا اور وہ بیان دینے کے لئے کچھ دیر تک زندہ نہ رہتی تو پھر یہ ثابت کرنا مشکل ہو جاتا کہ صاجزادہ نے ہی اسے قتل کیا ہے اور صاجزادہ کی ولدیت اکرم بیگ ہے۔

ایک رات کھانے کے بعد میں انیکسی میں بیٹھا اپنے حالات پر غور کر رہا تھا کہ رخسانہ آ گئی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے۔ کیا تمہیں نیند نہیں آ رہی ہے؟"

"ہاں' نیند نہیں آ رہی ہے۔ تم بھی تو جاگ رہے ہو۔ میں نے سوچا۔ تھوڑی دیر تم سے باتیں کر لوں۔"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دروازے پر تھی۔ میں نے کہا۔ "اندر آ جاؤ۔" وہ اندر آئی تو میں نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ وہ ذرا کسمسانے لگی۔ میں نے کہا۔ "دیکھو' رخسانہ' اب میں تمہارے لئے کوئی غیر نہیں رہا۔ تم میرے لئے اتنا کچھ کر رہی ہو اور اتنی محبت سے پیش آ رہی ہو کہ اب تمہارے دل کی دھڑکنوں کو میں اچھی طرح سمجھنے لگا ہوں۔"

وہ سر جھکا کر کسی قدر شرماتے ہوئے بولی۔ "صرف میں ہی نہیں' امی اور ابو بھی تمہیں پسند کرنے لگے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ مقدمہ جلد ختم ہو جائے اور مجرم اپنے انجام کو پہنچے اور تم ہمیشہ کے لئے قتل کے الزام سے بری کر دیئے جاؤ۔"

اس کی یہ بات ختم ہوتے ہی دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ ہم دونوں نے گھوم کر دیکھا تو ایک دم سے چونک گئے۔ وہاں صاجزادہ ہاتھ میں چاقو لئے کھڑا ہوا تھا۔ چاقو کھلا ہوا تھا اور خون آلود تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے' داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں عجیب وحشت برس رہی تھی۔

رخسانہ اسے دیکھتے ہی مارے خوف کے مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے الگ کر کے اپنے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ نہیں' یہ قاتل تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ میں تمہارے لئے ڈھال بن کر رہوں گا۔"

لیکن میں غلط کہہ رہا تھا کیونکہ دروازے پر کھڑے ہوئے صاجزادہ کے رویے سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ہمیں نقصان پہنچانے آیا ہے کیونکہ وہ بہت ہی تھکا ہوا سا' مجبور اور بڑا ہی بے بس نظر آ رہا تھا۔ کچھ کمزور نڈھال سا لگ رہا تھا اور چوکھٹ کا سہارا لئے کھڑا تھا۔ رخسانہ کو خوفزدہ ہوتے دیکھ کر اس نے بڑی ہی نرم آواز میں کہا۔ "رخسانہ یہ عبدالعلیم سچ کہتا ہے۔ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکوں گا اور نہ کبھی پہنچاؤں گا۔ میں تمہارا اور عبدالعلیم کا مجرم ہوں۔ میں اعتراف کرنے آیا ہوں اور جو کچھ کہوں گا اسے تم دونوں بڑے تحمل سے سن لو۔ اس کے بعد پولیس والوں کو اطلاع دے دینا۔ وہ مجھے آ کر یہاں سے گرفتار کر کے لے جائیں گے۔ اس کوٹھی کے باہر سڑک کے کنارے جو کار کھڑی ہوئی ہے اس میں حشمت بیگ کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ میں نے اسے قتل کر دیا ہے۔"

میں نے چونک کر پوچھا۔ "کیا تم نے حشمت بیگ کو بھی قتل کر دیا۔ آخر کیوں؟"
"میں کیا بتاؤں کہ میں کیا تھا اور کیا ہو گیا۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے کے اندر آیا۔ پھر بولا۔ "تم دونوں مجھ سے دور بیٹھ جاؤ۔ کیونکہ میرے ہاتھ میں چاقو ہے اور تم دونوں خوفزدہ ہو۔"

ہم اس سے دو کھڑے رہے۔ وہ ایک کرسی پر جھکے ہوئے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میرے والد نے مرنے سے پہلے وصیت لکھی تھی کہ میں ان کے دوست کی بیٹی رخسانہ سے شادی کروں۔ وہ رخسانہ کے والد کو بہت چاہتے تھے۔ دونوں میں بہت دوستی تھی اور اس دوستی کو مستحکم کرنے کے لئے وہ مجھے اور رخسانہ کو شادی کے بندھن میں باندھنا چاہتے تھے لیکن ممی کو یہ پسند نہیں تھا۔ وہ رخسانہ کے خاندان والوں سے چڑتی تھیں۔ پھر یہ کہ حشمت بیگ انہیں بہکاتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک بات میں رخسانہ کے سامنے صاف طور سے کہہ دوں کہ میں شکیلہ کو بے حد چاہتا تھا۔ اس سے محبت کرتا تھا اس لئے میں ممی کی حمایت میں یہ سوچتا تھا کہ میری شادی رخسانہ سے نہیں شکیلہ سے ہو لیکن شکیلہ سے شادی کرنے کا یہ نقصان ہوتا کہ میں ساری جائیداد سے محروم ہو جاتا۔ میرے والد نے سختی سے وصیت نامے میں یہ تاکید کی تھی کہ اگر میں شادی سے انکار کروں تو ان کا کاروبار اور کاروبار سے ہونے والی آمدنی اور جتنی جائیداد ہے' وہ سب کچھ میرے والد کے وکیل کی تحویل میں رہے گا اور اس کاروبار سے مجھے آمدنی کی مناسبت سے پانچ ہزار روپے سے لے کر دس ہزار روپے ماہوار تک اخراجات کے لئے ملا کریں گے۔ یعنی میں بالکل ہی محتاج ہو کر رہ جاتا۔ پانچ دس ہزار میرے لئے کچھ بھی نہیں تھے۔ مجھے ہر ماہ اخراجات کے لئے بڑی بڑی رقموں کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ میں اپنے کاروبار سے ہی پورا کر سکتا تھا۔

ممی اور انکل حشمت بیگ تدبیریں سوچ رہے تھے کہ کس طرح ساری دولت جائداد کاروبار میرے ہاتھ میں آئے گا اور میں رخسانہ کے بجائے شکیلہ سے شادی کر سکوں گا۔

اِدھر میں اور شکیلہ اس قدر ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے کہ ایک رات ہم جذبات میں بہہ گئے۔ دوسری صبح شکیلہ نے رو رو کر مجھے بُرا بھلا کہا اور ضد کی کہ میں فوراً ہی اس سے نکاح پڑھانے لوں۔ ورنہ وہ مجھ سے آئندہ بات بھی نہیں کرے گی۔ میں اس کا دیوانہ تھا۔ اس میں بس ایک ہی خرابی تھی کہ وہ بہت جلد غصے میں آ جاتی تھی اور زبان دراز تھی۔ مجھ سے اکثر جھگڑا کرتی تھی۔ میری کسی بات کو برداشت نہیں کرتی تھی لیکن وہ اس

قدر حسین تھی کہ میں اس کے حسن کے آگے سب کچھ بھول جاتا تھا۔ بہرحال میں نے چپ چاپ اس سے نکاح پڑھا لیا۔ نکاح پڑھانے کے بعد یہ بات ہم نے ممی اور انکل کو بتائی تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ ہم ہنی مون منانے کے لئے یہاں سے دور پہاڑی علاقے میں چلے گئے اور تین ماہ بیس دن تک ہم نے ممی اور انکل کو کوئی خط نہیں لکھا۔ خوب عیش و عشرت میں دن گزارتے رہے۔ جب ہم واپس آئے تو انکل نے بتایا کہ ایک منصوبہ بنایا جا رہا ہے' اس کے مطابق عمل کرنا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے جہانگیر آباد میں ایک ایسے نوجوان کو دیکھا ہے جو تقریباً میرا ہم شکل ہے۔ اگر اسے صاحبزادہ بنا کر یہاں لایا جائے اور ممی اسے اپنا بیٹا تسلیم کر لیں اور اسی نقلی صاحبزادے کا رخسانہ کے ساتھ نکاح پڑھا دیا جائے تو اس نکاح نامے کی رُو سے وہ وکیل مجبور ہو جائے گا کہ تمام دولت اور جائیداد اور کاروبار صاحبزادہ کے نام منتقل کر دے اور اس طرح میں اپنے والد کی تمام دولت کا حقدار بن جاتا اور اپنی مرضی سے اسے خرچ کر سکتا تھا۔"

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے صاحبزادے سے پوچھا۔ "لیکن تمہارے انکل حشمت بیگ اس کاروبار کو کیسے سنبھالتے تھے؟"

صاحبزادہ نے کہا۔ "وہ کاروبار تو وکیل کی نگرانی میں ہوتا تھا اور انکل کی حیثیت محض مینجر کی تھی اور میرے بینک میں جو اکاؤنٹ تھا اس کا تعلق میرے مرحوم والد کی دولت سے نہیں تھا۔ امی نے مجھے تقریباً ستر ہزار روپے مختلف اوقات میں دیئے تھے۔ جسے میں نے بینک میں رکھا تھا لیکن ہوتا یہ تھا کہ تم یونین بینک کے چیک پر رقم لکھ کر دستخط کرتے تھے اور وہ چیک انکل حشمت بیگ کیش کرانے لے جاتے تھے۔ دراصل بات یہ ہے کہ یونین بینک میں میرا کوئی اکاؤنٹ ہے ہی نہیں۔ میرا اکاؤنٹ حمید بینک میں ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ میں حمید بینک کے چیک پر اتنی ہی رقم لکھ کر جتنی کہ تم لکھتے تھے۔ اپنے دستخط کرتا تھا۔ پھر انکل اسے کیش کرا کر لے آتے تھے۔ تم یہ سمجھتے تھے کہ تمہارے یونین بینک کے چیک پر دستخط کرنے کی وجہ سے رقم مل گئی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تو پھر حشمت بیگ نے مجھ سے تمہارے دستخط کی مشق کیوں کرائی تھی۔ میں دن رات تمہارے دستخط کی مشق کرتا رہا تھا۔"

اس نے کہا۔ "وہ چاہتے تھے کہ کسی حد تک تم دستخط کرنا سیکھ جاؤ۔ شاید کسی موقع پر یہ کام آ جائے لیکن تم نقل کرنے میں ناکام رہے تھے۔ اس لئے ہمیں یہ چال چلنی پڑی۔ ویسے ولیمے کے دوسرے دن وکیل نے تمہیں بلایا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ وصیت

نامہ پڑھ کر سنانے والا تھا اور اس وصیت نامے کی رو سے تمام کاروبار اور دولت و جائیداد کے کاغذات میرے حوالے کرنے والا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ میں صبح انکل حشمت بیگ اور ممی کے ساتھ وکیل کے پاس جاؤں گا اور اس سے پہلے تمہیں اور رخسانہ کو رخسانہ کے میکے روانہ کر دیا جائے گا۔ تاکہ تم لوگوں کو پتہ نہ چلے کہ ہم وکیل کے پاس جا کر کیا کر رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "جو شخص تمہارا فیملی ڈاکٹر تھا اس نے ولیمے کے دن مجھے بتایا کہ تمہاری ممی کو دل کی بیماری نہیں ہے۔ محض ان کا وہم ہے۔ کیا یہ درست ہے؟"

صاحبزادہ نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ "ہاں' ممی کو کوئی بیماری نہیں تھی۔ وہ خواہ مخواہ دل کی مریضہ اس لئے بنی ہوئی تھیں کہ تم نیکی اور ہمدردی کے جذبے سے آؤ اور انہیں بیماری سے بچانے کے لئے' صدمات سے بچانے کے لئے ان کے بیٹے بن کر رہو۔"

میں نے پھر ایک سوال کیا۔ "کیا تم لوگوں نے یہ نہیں سوچا کہ آخر میں کب تک تمہارا رول ادا کرتا رہوں گا۔ کبھی نہ کبھی مجھے یا رخسانہ کو یا رخسانہ کے خاندان والوں کو اس فراڈ کا علم ہو جائے گا۔"

"ہم نے سب کچھ سوچ لیا تھا۔ ہم ہر حالت میں اپنی دولت اور جائیداد اور کاروبار پر قبضہ جمانا چاہتے تھے جو میرے والد نے میرے لئے چھوڑا تھا۔ جب وکیل وہ سب کچھ ہمارے حوالے کر دیتا تو پھر رفتہ رفتہ ہم اس جائیداد کو فروخت کر دیتے اور ساری دولت کو دوسرے شہر کے بینکوں میں منتقل کر دیتے اور میں شکیلہ کو ساتھ لے جا کر وہاں رہتا۔"

"اور تمہاری ممی اور تمہارے انکل؟"

اس نے جواب دیا۔ "انکل کا ارادہ تھا کہ وہ میرے کاروبار کو اپنے نام پر برائے نام خرید لیتے۔ اس کاروبار سے میرا نام ہٹا دیا جاتا۔ پھر اسے اسی شہر میں منتقل کر دیا جاتا جہاں میں شکیلہ کے ساتھ رہائش اختیار کرتا۔ رہ گئیں ممی تو انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ سارے معاملات طے پا جانے کے بعد جب ہم منتقل ہو جائیں گے تو وہ اپنی بہو سے یعنی رخسانہ سے جھگڑا کر کے اور اس سے ناراض ہو کر اور نقلی صاحبزادے کو چھوڑ کر وہاں سے چلی آئیں گی اور انہیں اطلاع نہیں دیں گی۔ بعد میں وہ تلاش کرتے رہیں۔ آخر میں یہی سوچا جائے گا کہ ماں ناراض ہو کر چلی گئی ہے۔ چونکہ تم ان کے سگے بیٹے نہیں ہو' اس لئے انہیں زیادہ تلاش نہیں کرو گے یا ان کی ناراضگی کی پروا نہیں کرو گے۔ رخسانہ ان سے جلی کٹی رہے گی' اس لئے وہ تمہیں اس کا موقع بھی نہیں دے گی۔"

میں نے کہا۔ "یہ منصوبے تو بڑے اچھے تھے۔ پھر ان پر عمل کیوں نہیں ہو سکا؟"

اتنی دیر میں رخسانہ نے پہلی بار زبان کھولی اور صاحبزادے سے پوچھا۔ "تم نے شکیلہ کو کیوں قتل کر دیا جبکہ تم اسے بے حد چاہتے تھے؟"

صاحبزادہ نے ایک گہری سانس لی۔ پھر کہا۔ "میں یہی بتانے تمہارے پاس آیا ہوں اور شاید میں عدالت میں یہ بات نہ کہہ سکوں کیونکہ ایسا کہتے یا سوچتے وقت ہی میرا خون غصے سے کھولنے لگتا ہے۔ ہوا یہ کہ ولیمے کی رات میں چپ چاپ کوٹھی کے پچھلے دروازے سے اپنی ممی سے ملنے آیا تھا کیونکہ اس رات یہ طے پایا تھا کہ دوسرے دن وکیل کے پاس ہم کو جانا ہے یا نہیں' مجھے اس بات کا اندیشہ نہیں تھا کہ کوئی مجھے اصلی یا نقلی صاحبزادہ کی حیثیت سے پہچانے گا۔ میں تو بالکل تمہارا ہمشکل ہوں اور اچھا لباس پہنا ہوا تھا۔ وہاں اگر کوئی مجھے دیکھ بھی لیتا تو دولہا میاں سمجھتا۔ بہرحال جب میں کوٹھی کے پچھلے حصے سے امی کے کمرے کی طرف گیا تو وہاں میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس کی میں توقع نہیں کر سکتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ انکل حشمت بہت ہی اچھے آدمی ہیں اور میری ممی کی عزت بھابی اور ماں کی طرح کرتے ہیں۔ لیکن ان کی باتوں سے یہ پتہ چلا کہ وہ میرے ابو کے وقت سے ہی ان کے اعتماد کو دھوکہ دیتے آ رہے تھے۔ یہ بات ایسی تھی کہ میں برداشت نہ کر سکا۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ اگر میرے پاس پستول ہوتا یا چاقو ہوتا تو میں اسی وقت ان دونوں کے ٹکڑے کر دیتا لیکن اس وقت تو میں غصے میں کھولتا ہوا اور بھنبھناتا ہوا وہاں سے واپس آ گیا۔

جب میں شکیلہ کے پاس پہنچا تو اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ "کیا بات ہے' غصے میں نظر آ رہے ہو' کہاں سے آ رہے ہو؟"

میں نے چیخ کر کہا۔ "بکواس مت کرو۔ تمہارا باپ نہایت ہی ذلیل اور کمینہ انسان ہے۔ آج میں نے اس کا اصلی روپ دیکھ لیا ہے۔"

اسے بھی غصہ آ گیا۔ اس نے کہا۔ "دیکھو' میرے باپ کو گالی نہ دینا۔ میں یہ برداشت نہیں کروں گی۔ آخر تم کیا سمجھ کر میرے باپ کو ذلیل اور کمینہ کہہ رہے ہو؟"

میں نے اسے بتایا کہ ابھی میں اپنی آنکھوں سے کیا دیکھ کر آ رہا ہوں۔ اس پر اس نے کہا۔ "تو یوں کہو نا کہ صرف میرا باپ نہیں بلکہ تمہاری ماں بھی کمینی ہے۔"

اس کے منہ سے یہ بات سنتے ہی میں اپنے آپ میں نہ رہا۔ تڑا تڑ اسے مارنا شروع کر دیا۔ وہ بھی ضد کی پکی تھی اور زبان دراز تھی۔ وہ مجھے جواباً گالیاں دینے لگی اور چیخنے

لگی۔ تب اچانک ہی پھل کاٹنے والا چاقو میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور اٹھا کر اس پر حملہ کیا۔"

یہ کہہ کر اس نے سر جھکا لیا اور اپنے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر جذباتی انداز میں بولا۔ "میں ایک ایک کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ جب تک حشمت بیگ کو بھی ہلاک نہیں کروں گا اس وقت تک خود کو قانون کے حوالے نہیں کروں گا۔ میں ان .... بے غیرتوں کو اس زمین پر زندہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ آج میں نے اتنے دنوں کے بعد اسے بھی ٹھکانے لگا دیا ہے۔ اس کی لاش باہر کار کے اندر پڑی ہوئی ہے اور میری ممی............"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ میں نے اس کی طرف بڑے افسوس کے ساتھ دیکھا اور پوچھا۔ "کیا تم نے اپنی ممی کو بھی ہلاک کر دیا؟"

اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں میں نے ایسا نہیں کیا۔ ہاں' کئی بار ایسا سوچا کہ جس نے میرے باپ کے اعتماد کو دھوکہ دیا ہے' میں اس عورت کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا لیکن میں کیا کروں وہ صرف عام عورت ہی نہیں' میری ماں بھی ہے جس نے مجھے دودھ پلایا ہے۔ میں بہت کچھ ان کے خلاف سوچنے کے باوجود ان کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکا۔ تب یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ انہیں تو ایسی موت مارنا چاہئے کہ دشمنوں کو بھی وہ موت نصیب نہیں ہوئی ہو گی اور وہ یہ کہ وہ زندہ رہیں گی اور اپنی آنکھوں کے سامنے مجھے عدالت میں دیکھیں گی اور میری سزائے موت کا حکم سنیں گی اور پھر یہ بھی ایک دن انہیں پتہ چلے گا کہ میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہوں۔ ایک ماں کے لئے اس سے بڑی اذیتناک زندگی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے سامنے اس کا جوان بیٹا قتل کے الزام میں پھانسی کی سزا پائے۔ یہی ان کے لئے کافی ہے۔ میں جانتا ہوں۔ وہ مجھے بہت چاہتی ہیں' بہت پیار کرتی ہیں' میری سزائے موت کا جب حکم سنیں گی تو شاید زندہ نہ رہ سکیں۔ اچھا ہے۔ کسی صورت سے مر جائیں گی اس زمین کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

ایسا کہتے وقت اس کے ہاتھ سے خون آلود چاقو چھوٹ کر فرش پر گر پڑا تھا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے ہم نے دیکھا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور ہچکیاں لے رہا تھا۔ ننھے سے بچے کی طرح سسک رہا تھا۔ اس کی ماں نہیں تھی جو اسے گود میں چھپا کر اسے اپنی ممتا کے سائے میں رکھ کر اس کے آنسو پونچھتی۔ اسے اپنی دھڑکنوں سے لگا کر تحفظ کا احساس دلاتی کہ بیٹا' میں تمہاری ماں ہوں

اور ماں کا رشتہ بہت ہی مقدس ہوتا ہے۔ اسے گالی نہیں دینا چاہئے لیکن بعض عورتیں اس رشتے کو بھی گالی بنا دیتی ہیں۔

تھوڑی دیر تک میں اور رخسانہ گم صم کھڑے رہے۔ انیکسی کے اس کمرے میں گہرا سناٹا تھا۔ صرف کبھی کبھی اس کے سسکنے کی آواز ابھرنے لگتی تھی۔ بالآخر اس نے فرش پر سے خون آلود چاقو اٹھا لیا اور وہاں سے آہستہ آہستہ جانے لگا۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ رک کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ "ایک اہم بات رہ گئی ہے' میں وہ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ "جس رات تم شکیلہ کو قتل کر رہے تھے اور میں اس کوٹھی میں داخل ہو رہا تھا۔ ٹھیک اسی رات' ایسے ہی وقت میری امی نے خواب میں دیکھا کہ میرے گلے میں پھانسی کا پھندا پڑنے والا ہے۔ وہ بیماری کی حالت میں بستر سے اٹھیں اور سجدے میں گر کر گڑگڑانے لگیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے لگیں کہ میں کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہونے پاؤں۔"

صاحبزادے نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں' تمہاری ماں کی دعا نے تمہیں بچا لیا۔"

میں نے پوچھا۔ "لیکن کیسے بچا لیا۔ میں مانتا ہوں کہ دعائیں اثر دکھاتی ہیں لیکن ان دعاؤں کی تکمیل کا کوئی وسیلہ ہوتا ہے اور وہ وسیلہ یہ تھا کہ تم قتل کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ اسے جان کنی کی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ایسی حالت میں شکیلہ نے جو بیان دیا' وہ میرے بچاؤ کا سبب بن گیا۔ اب یہی دیکھنا ہے کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ تم نے اسے پوری طرح قتل کیوں نہیں کیا اور اسے بیان دینے کے لئے نیم مردہ حالت میں کیوں چھوڑ گئے؟"

وہ ایک ہاتھ کی مٹھی بھینچ کر کچھ سوچنے لگا۔ کسی ہچکچاہٹ میں مبتلا ہوا جیسے جواب دیتے ہوئے کترا رہا ہو۔ پھر اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "میں کیا بتاؤں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے چاقو سے پہلا وار اس کے سینے پر کیا لیکن حملہ کامیاب نہ رہا۔ وہ چاقو اس کے شانے کے پاس جا کر کھب گیا۔ دوسری بار میں نے وہ چاقو نکال کر حملہ کرنا چاہا۔ وہ دوسرا حملہ اتنا بھرپور ہوتا کہ شکیلہ دم توڑ دیتی لیکن اس سے پہلے ہی اچانک ایک چیز چھت پر سے آ کر مجھ پر گری اور میں ایک دم سے............"

ایسا کہتے وقت اس کی نگاہیں بے اختیار اوپر اٹھ گئیں۔ ہمارے پیچھے دیوار کی طرف گئیں تو اس نے ایک فلک شگاف چیخ ماری۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا تو دیوار سے چھپکلی چپکی

ہوئی تھی۔ ہم نے پھر دوبارہ اس کی طرف پلٹ کر دیکھا تو اب وہ بھاگ رہا تھا۔ چیخ رہا تھا۔ انیکسی کے باہر جا کر سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اسی وقت وہ لڑکھڑا کر گرا۔ ہم دوڑتے ہوئے اس کی طرف گئے۔ اس کے پاس پہنچ کر فرش پر جھک کر دیکھا تو وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر سوچا۔ یہ دنیا کچھ سیکھنے اور سکھانے کی جگہ ہے۔ اگر ہم حاضر دماغی سے سٹڈی کرتے رہیں تو پتہ چلتا ہے کہ دعائیں کتنے وسائل سے گزرتے ہوئے اپنا اثر دکھاتی ہیں۔

ماں دنیا کا مقدس ترین رشتہ ہے۔ اس ماں کی کہانی جس نے اس مقدس رشتے کو گالی بنا دیا تھا۔ جائیداد کے حصول کے لئے کھیلے جانے والے پیچ در پیچ ڈرامے کی انوکھی روداد۔ دو ہم شکل مردوں کا عجیب قصہ۔ ایک نیکی کے راستے پر چل رہا تھا تو دوسرا بدی کے۔

☆======☆======☆

گندے انڈے

اس ناول میں ایسے خاندان کے احوال کا ذکر ہے جہاں چھوٹے بڑے سب ہی جھوٹ، فریب، مکاریم خود غرضی اور گناہوں کی لعنت میں مبتلا ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دولت کی ہوس نے انہیں اندھا کر دیا تھا۔ رشتوں کا احترام اور پہچان بھول چکی تھی۔ جائز و ناجائز کی پرواہ کیے بغیر وہ ہر صورت اپنے مقاصد کی تکمیل چاہتے تھے۔

وہ عالی شان محل نما کوٹھی دس ہزار گز کے اونچے پلاٹ پر بنی ہوئی تھی۔ شہر کے کسی حصے سے بھی دیکھو اس کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اس کوٹھی کے بڑے سے گیٹ پر بیگم رئیس احمد کے نام کی تختی لگی رہتی تھی۔ وہ تختی پیتل کی تھی لیکن ایسی پالش شدہ تھی کہ سورج کی روشنی میں سونے کی طرح چمکتی تھی۔

بعض قیافہ شناس کسی انسان کی پیشانی دیکھ کر اس کا چال چلن اور اس کی خوبیاں اور خامیاں بتا دیتے ہیں۔ عالی شان کوٹھی کی پیشانی پر لکھی ہوئی نیم پلیٹ بھی.......... سمجھنے والوں کو سمجھا دیتی تھی کہ یہ لوگ باہر سے سونا اور اندر سے پیتل ہیں اور وہاں مرد کے مقابلے میں عورت کو اوّلیت حاصل ہے۔ اس تختی پر رئیس احمد کا نام ہونا چاہئے تھا لیکن بیگم رئیس احمد کا نام لکھا ہوا تھا۔

اس وسیع و عریض کوٹھی کے دائیں بائیں دو خوب صورت بنگلے تعمیر کرائے گئے تھے۔ دائیں طرف کے بنگلے میں رئیس احمد کا بیٹا امیر احمد رہتا تھا اور بائیں طرف والے بنگلے میں اس کی دو بیٹیاں شہلا اور سدرہ رہا کرتی تھیں۔ وہ تینوں اپنے والدین سے الگ رہتے تھے مگر ان کے سائے میں رہتے تھے۔

رئیس احمد اور بیگم رئیس کی بڑی بیٹی کا نام شہلا تھا۔ شہلا، بیگم رئیس کے پہلے شوہر کی بیٹی تھی۔ یہی کہا جاتا تھا کہ بیگم رئیس نے پہلے ایک شادی کی تھی۔ اس پہلی شادی کے نتیجے میں شہلا پیدا ہوئی پھر پہلے شوہر کے انتقال کے بعد اس نے رئیس احمد سے شادی کی تھی۔ انہوں نے یہ باتیں اپنے تینوں بچوں کو بتا دی تھیں۔ جبکہ یہ سچ نہیں تھا۔ سچ یہ تھا کہ بیگم رئیس نے پہلے کسی سے شادی نہیں کی تھی۔

عشق کیا تھا اور بڑا زور دار عشق کیا تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اربوں روپوں کا کاروبار ملک کے اندر اور باہر تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے والدین اپنی حیثیت کے مطابق ایک داماد چاہتے تھے۔ بیگم بانو کی پسند کو اور اس کے عشق کو برداشت نہیں کر

رہے تھے۔ انہوں نے اس کے عاشق سے پیچھا چھڑانے کے لئے اسے مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لندن بھیج دیا تھا۔

تین ماہ بعد پتا چلا کہ لاڈلی بیٹی کا عاشق بہت پہلے سے لندن پہنچا ہوا تھا اور ان کے پیار کی دیوانگی ایک نیا گل کھلا رہی تھی یعنی وہ ماں بننے والی تھی۔

اس کے باپ جلال الدین کا کاروبار یورپ کے کئی ممالک میں پھیلا ہوا تھا۔ اسی اعتبار سے اس کے ذرائع بھی لامحدود تھے۔ وہ قانون کے مطابق بیٹی کو اس کے عاشق سے جدا نہیں کر سکتا تھا لیکن غیر قانونی طریقوں سے اس داماد بننے والے کو خاک میں ملا سکتا تھا۔

جلال الدین کا رعب اور دبدبہ اس قدر تھا کہ اس کے لندن پہنچنے سے پہلے ہی بیگم نے اپنے عاشق کو وہاں سے بھگا دیا۔ جلال الدین نے کہا۔ "میرے لاڈ پیار نے تمہیں سر پر چڑھا دیا ہے۔ تم نے اتنا.......... بڑا گناہ کیا ہے کہ شادی سے پہلے ہی ماں بننے والی ہو۔ تم سمجھ رہی تھیں کہ میں تمہیں سزا نہیں دوں گا۔"

"آپ مجھے کیا سزا دیں گے؟ کیا مجھے جان سے مار ڈالیں گے؟ میں نہیں رہوں گی تو آپ کے پاس کیا رہ جائے گا؟ یہ ساری دولت اور جائیداد اس دنیا میں کس کے لئے چھوڑ کر جائیں گے؟"

"پہلے اس ناجائز بچے کو ضائع کراؤ پھر میں تم سے نمٹوں گا۔"

"میں اسے ضائع نہیں ہونے دوں گی۔ آپ مجھے مار ڈالیں۔ میں اپنے بچے کے ساتھ مرجاؤں گی۔"

"میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ تم میری ایک ہی اولاد ہو، اور اسے میری مجبوری سمجھ رہی ہو لیکن میں مجبور ہونا نہیں جانتا۔ میں سانپ کو اس طرح مارتا ہوں کہ میری لاٹھی نہیں ٹوٹتی۔ وہ جہاں بھی چھپا ہوا ہے۔ میں اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر اس کی لاش تمہارے پاس پہنچا دوں گا، اور تم جانتی ہو کہ تمہارے باپ نے کس طرح دوسروں کی لاشوں پر کھڑے ہو کر دولت اور شہرت کمائی ہے۔"

وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ کتنا خطرناک ہے، جو کہہ دیتا ہے وہ کر گزرتا ہے۔ وہ اپنے محبوب کی سلامتی چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ "نو ڈیڈ! آپ اسے نقصان نہیں پہنچائیں گے، اگر آپ اسے معاف کر دیں گے، اسے زندہ رہنے دیں گے تو میں بچے کو ضائع کر دوں

گی۔"

"صرف بچے کو ضائع نہیں کرنا ہے بلکہ میری مرضی کے مطابق شادی بھی کرنا ہے۔ یہیں لندن میں تمہاری شادی ہوگی۔"

"میں اتنی جلدی شادی نہیں کروں گی۔"

"تمہارا باپ بھی کرے گا۔ اپنے باپ کو نادان سمجھتی ہو۔ اس انتظار میں ہو کہ میں جلد ہی مرجاؤں تو تم اس خبیث سے شادی کرسکو۔ میں سارے انتظامات کرکے آیا ہوں۔ ایک دلہا بھی ساتھ لایا ہوں۔ تم انکار کرو گی تو تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اتنا جانتا ہوں کہ تم محبت میں اپنی جان نہیں دو گی لیکن اپنے محبت کرنے والے کی سلامتی بھی چاہو گی۔"

وہ سلامتی چاہتی تھی اور باپ کی شرائط تسلیم کئے بغیر سلامتی ممکن نہیں تھی۔ اس نے تنہائی میں فون کے ذریعے اپنے محبوب سے کہا۔ "تم ڈیڈی کو جانتے ہو۔ انہوں نے اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر تمہیں مار ڈالنے کی دھمکی دی ہے اگر میں بچے کو ضائع کردوں گی اور ان کی مرضی کے مطابق کسی سے شادی کرلوں گی تو وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

"تم میری فکر نہ کرو۔ ہم جئیں گے ایک ساتھ اور مریں گے ایک ساتھ۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ نہیں مروں گی اور نہ ہی تمہاری موت چاہوں گی۔ تم زندہ رہو گے تو ہماری محبت بھی زندہ رہے گی۔ ہم شادی نہیں کرسکتے۔ یہ ہماری مجبوری ہے لیکن ہم چوری چھپے ملتے رہیں گے۔"

"تم شادی کرکے پرائی ہوجاؤ گی پھر مجھے سہارا نہیں دو گی۔"

وہ عاشق نامراد نہیں تھا۔ بامراد تھا۔ ایک رئیس زادی اس کی دیوانی تھی اور اس دیوانگی میں اس کا بینک بیلنس بڑھاتی رہتی تھی۔ وہ فرماں بردار عاشق تھا۔ اس کے اشاروں پر چلتے رہنے پر ہی وہ عمر بھر اس کا سہارا بن کر رہ سکتی تھی۔

اس نے باپ کی بات مان لی۔ بچے کو ضائع کرنے پر راضی ہوگئی' لیکن لیڈی ڈاکٹر سے کہا۔ "اسقاطِ حمل کا وقت گزر چکا ہے۔ اب اگر ابارشن ہوگا تو بچے کے ساتھ زچہ کی بھی جان جانے کا خطرہ ہے۔"

جلال الدین بدنامی سے بچنے کے لئے بیٹی کی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ اس نے

جھنجلا کر کہا۔ "تم نے مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا ہے۔ اب ایک بچے والی کے ساتھ کون شادی کرے گا؟ جہاں تمہارا رشتہ کرنا ہے وہاں کس منہ سے کہوں گا کہ میری بیٹی شادی سے پہلے ماں بننے والی ہے۔"

وہ سر جھکائے باپ کی ڈانٹ ڈپٹ سنتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ باپ غصے میں ساری دنیا کو آگ لگا سکتا ہے' لیکن اسے پھول کی چھڑی بھی نہیں مارے گا۔ اس نے دبی زبان سے کہا۔ "ڈیڈی! پلیز حالات سے سمجھوتا کرلیں۔ وہ بالکل گیا گزرا نہیں ہے۔ ہمارا ہی دور کا رشتے دار ہے۔ پتا نہیں کیوں آپ رشتے داروں سے نفرت کرتے ہیں؟ پلیز اسے معاف کردیں۔"

"میں اسے گولی مارنے کے بعد بھی معاف نہیں کروں گا۔ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں کہ یہ سارے رشتے دار کتنے لالچی اور خود غرض ہیں۔"

"ڈیڈی! ایک تو میں نے غلطی کی۔ دوسرے آپ ضد کر رہے ہیں۔ کیا ہم اس بچے کو دنیا والوں سے چھپا سکیں گے؟ کیا بدنامی سے بچ سکیں گے؟"

جلال الدین نے کہا۔ "مجھے ایسے مسائل سے نمٹنا آتا ہے۔ میں جسے چاندی کا جوتا ماروں گا وہ سر جھکا کر میرا داماد بن جائے گا۔ میری نظروں میں ایک شخص ہے۔ میں ایک ہفتے کے اندر اندر تمہاری شادی اس سے کراؤں گا۔ شادی میں دیر ہوگی تو اندھیر ہوجائے گا۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "آپ مجھے کس کے پلے باندھنا چاہتے ہیں؟ آخر وہ بھی تو لالچی ہوگا؟"

"وہ لالچی ہوگا مگر اس میں دو خوبیاں ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ وہ تمہارا فرماں بردار رہے گا۔ دوسری خوبی یہ کہ وہ بزنس کے طور طریقوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ میرے کاروبار کو پھلتا پھولتا رکھے گا۔ تمہیں ایک ایسے ہی خاوند کی ضرورت ہے جو میرے بعد تمہارے نام ہونے والے تمام کاروبار کو سنبھال سکے۔"

اس نے اسی وقت فون کے ذریعے رئیس احمد سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "تم پہلی فلائٹ سے لندن آجاؤ۔ میں فون پر دو ٹوک باتیں کر رہا ہوں۔ یہاں میں اپنی بیٹی کی شادی تم سے کراؤں گا۔ تمہیں اپنے تمام کاروبار کا سرپرست بناؤں گا۔ منظور ہو تو سوال کئے بغیر چلے آؤ۔"

رئیس احمد دوسرے دن صبح کی فلائٹ سے لندن پہنچ گیا۔ بیگم نے اسے دیکھ کر منہ بنایا۔ جبکہ وہ صورت شکل' قد و قامت کے لحاظ سے قابلِ قبول تھا۔ جلال الدین نے کہا "اپنے مزاج میں تبدیلی پیدا کرو۔ تمہیں اپنی تمام زندگی رئیس احمد کے ساتھ گزارنی ہے۔"

رئیس احمد نے کہا۔ "آپ کی صاحب زادی مجھ سے مانوس نہیں ہے لیکن شادی کے بعد انسیت پیدا ہو جاتی ہے۔"

جلال الدین نے کہا۔ "تمہیں میری بیٹی کا دل جیتنا ہے لیکن بالکل ہی غلام بن کر نہیں رہنا ہے۔ تم میری بیٹی کی تمام جائز باتوں پر سر جھکایا کرو گے اور ناجائز باتوں کو کبھی تسلیم نہیں کرو گے۔ میں ایسی چند اہم باتیں اپنی وصیت میں لکھوں گا۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "آپ وصیت میں کیا لکھنا چاہتے ہیں؟"

"یہی کہ شادی کے بعد تمہاری آزادی اور خودمختاری محدود رہے گی۔ تم شوہر کو ناجائز دباؤ میں نہیں رکھو گی اور شوہر تمہارے جائز مطالبات تسلیم کرتا رہے گا۔"

وہ بولا۔ "میں آپ کی صاحب زادی کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

جلال الدین نے کہا۔ "شادی کے بعد تم کبھی رئیس احمد سے طلاق نہیں لو گی۔ کبھی حالات سے مجبور ہو کر طلاق لو گی تو اپنے اس محبوب سے کبھی شادی نہیں کرو گی۔ وصیت کے خلاف ایسا کرو گی تو میری تمام دولت اور جائیداد سے محروم کر دی جاؤ گی۔ تمہیں صرف ماہانہ اخراجات کے لئے ایک مخصوص رقم ملتی رہے گی وہ خبیث آئندہ تمہاری زندگی میں کسی بھی چور دروازے سے نہیں آسکے گا۔"

"ڈیڈی! یہ آپ مجھ پر ظلم کر رہے ہیں۔"

"جب تم میری دولت و جائیداد سے محروم ہو جاؤ گی اور محتاجی کی زندگی گزارو گی تب میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ خبیث تمہیں چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ تب تمہیں میری نصیحتیں اور محبتیں یاد آئیں گی۔"

رئیس احمد نے پوچھا۔ "اگر یہ کبھی مجھ سے طلاق لیں گی تو اس وقت میری پوزیشن کیا ہو گی؟"

"طلاق کے بعد سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ جب میری بیٹی سے رشتہ نہیں رہے گا تو میرے کاروبار سے بھی تمہارا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ ابھی تم جس مقام پر ہو اسی

مقام پر واپس آجاؤ گے۔ میں اپنی وصیت میں توازن قائم رکھوں گا۔ فائدہ پہنچے گا تو تم دونوں کو' نقصان پہنچے گا تو تم دونوں کو۔ میری وصیت ایسی ہو گی کہ تم دونوں ایک دوسرے کو چھوڑ نہیں سکو گے۔ اچھے میاں بیوی کی طرح زندگی گزارتے رہو گے۔"

"میری طرف سے آپ کو اور آپ کی صاحب زادی کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ مجھے آپ کی تمام شرائط منظور ہیں۔"

"ایک اور اہم بات یہ ہے کہ تم میری بیٹی سے شادی کرنے کے بعد پھر کبھی دوسری شادی نہیں کرو گے۔ میری بیٹی پر سوکن نہیں لاؤ گے۔"

تمام معاملات طے ہو گئے۔ بیگم اور رئیس احمد کی کورٹ میرج ہو گئی۔ تمام رشتے داروں میں اور کاروباری حلقوں میں فون اور فیکس کے ذریعے یہ کہا گیا کہ بیگم نے اپنی پسند سے اچانک شادی کی ہے۔ اس لئے شادی کے وقت کسی کو مدعو نہیں کیا گیا۔ وہ ہنی مون منانے کے بعد پاکستان واپس آئیں گے تو تمام عزیز و اقارب اور دوست احباب کو شان دار پارٹی دی جائے گی۔

جلال الدین بیٹی اور داماد کو لندن میں چھوڑ کر پاکستان چلا گیا۔ بیگم صرف اپنے یار کی دیوانی تھی اس لئے رئیس احمد سے مخالفانہ رویہ اختیار کرتی رہی۔ اس نے کہا۔ "تم ساری زندگی میری مخالفت کرتی رہو گی۔ ضدی اور خود سر بیوی بن کر رہنا چاہو گی۔ تب بھی میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ آج نہیں تو کل تمہیں میرے بیڈ روم میں آنا ہی ہو گا۔ میں دس ماہ تک انتظار کروں گا۔"

دو ماہ کا حمل تھا اور سات ماہ بعد زچگی ہونے والی تھی۔ اس نے کہا۔ "تم زچگی کے تین ماہ بعد تک میرے پاس نہیں آؤ گی تو مجبوراً مجھے تمہارے باپ کی حمایت حاصل کرنی ہو گی۔ وہی تمہیں لگام دے سکیں گے۔ ویسے دس ماہ کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ تمہیں خود ہی عقل آجائے گی اس لئے حیا کا تقاضا ہے ایسی بات باپ تک نہ پہنچنے دو۔"

وہ دو ماہ کے بعد لندن سے واپس آگئے۔ جلال الدین نے اپنی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں بہت شان دار پارٹی دی۔ اس پارٹی میں یہ ظاہر کیا گیا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ جس بچے کی پیدائش سے وہ باپ بیٹی بدنام ہونے والے تھے اسی بچے سے انہیں نیک نامی ملنے لگی۔ رئیس احمد کلیجے پر پتھر رکھ کر ایک ناجائز بچے کا باپ کہلانے لگا۔ دولت کے حصول کے لئے اپنی سطح سے نیچے گرنا پڑتا ہے اور نیچے گرنے کے لئے اپنے ضمیر کو تھپک تھپک کر

سلانا پڑتا ہے۔ پھر یہ ضروری نہیں کہ دولت کے حصول کے لئے ہی ایسا کیا جائے۔ بعض اوقات حالات انسان کو اپنے مزاج کے خلاف بہت کچھ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

رئیس احمد کے اپنے خیالات تھے۔ اپنی مجبوریاں تھیں۔ اس نے یہ بات جلال الدین اور اس کی بیٹی سے چھپائی تھی کہ وہ پہلے ہی سے شادی شدہ ہے۔ فیصل آباد میں اس کی ایک شریکِ حیات ہے۔ وہ بے چاری بھی ان دنوں ماں بننے کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ فیصل آباد میں اس کا اچھا خاصا کاروبار تھا۔ وہ تباہ ہوگیا.......... اسے دوبارہ اپنا کاروبار شروع کرنے کے لئے کہیں سے مالی اور اخلاقی تعاون حاصل نہیں ہو رہا تھا۔

کاروبار کے سلسلے میں جلال الدین سے اس کے تعلقات رہے تھے۔ جلال الدین اس کے عروج و زوال کی کہانی جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کاروبار کی تباہی میں اس کا اپنا ہاتھ نہیں ہے۔ وہ سازشوں کا شکار ہوگیا تھا اگر اسے سہارا دیا جائے تو وہ ایک کامیاب بزنس مین بن سکتا تھا۔

جلال الدین کٹر کاروباری تھا۔ وہ خدا کی راہ پر اسے مالی امداد نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ”جب تک تم اپنا کوئی کاروبار شروع نہ کرو۔ اس وقت تک میری ٹیکسٹائل ملز میں منتظم اعلیٰ بن کر رہو۔ میں اسی طرح تمہارے کام آسکتا ہوں۔“

لیکن جلال الدین کو دوسری طرح بھی اس کے کام آنا پڑا۔ بیٹی نے اسے بدنامی کی دہلیز پر لاکر کھڑا کردیا تھا۔ ان حالات میں اس نے رئیس احمد کو داماد بنالیا تھا۔ وہ جس قدر رئیس احمد کی کاروباری صلاحیتوں کو سمجھتا اور تسلیم کرتا تھا اسی قدر اس کی ذاتی زندگی سے بے خبر تھا۔ اس نے بھی جھوٹ کہا تھا کہ وہ اس دنیا میں تنہا ہے اور دور کے رشتے داروں سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا ہے۔

اب رئیس احمد کا اہم مسئلہ یہی تھا کہ وہ اپنی پہلی شادی کو ان باپ بیٹی سے چھپا کر رکھے۔ ویسے بھی وہ اتنے اونچے مقام پر پہنچ گیا تھا کہ کوئی اس کی چھوٹی سی زندگی میں جھانکنے کے لئے فیصل آباد نہ جاتا۔ کسی کو اس کے ماضی کے بارے میں کریدنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

بیگم نے نو ماہ کے بعد ایک بیٹی کو جنم دیا۔ ان کی کورٹ میرج کے حساب سے اس بچے نے سات ماہ بعد جنم لیا تھا۔ سب نے اسے ست ماہی بچی سمجھا۔ کسی کو شبہ نہیں ہوا اور بات بن گئی۔ اس بچی کا نام شہلا رکھا گیا۔

رئیس احمد نے پوچھا۔ ”کیا خیال ہے۔ میں نے تمہارے لئے اتنی بڑی قربانی دی ہے۔ پتا نہیں کس کی بچی کو جنم دیا ہے۔ میں اسے اپنا نام دے رہا ہوں اور تمہیں نیک نام بنا رہا ہوں۔“

”کوئی احسان نہیں کر رہے ہو۔ تمہاری اوقات سے زیادہ تمہیں معاوضہ مل رہا ہے۔“

”جتنی بھی دولت دو۔ وہ عزت سے کم ہوتی ہے۔ میں ساری زندگی تمہیں اور تمہارے باپ کو عزت دیتا رہوں گا۔“

”وہ تو دینی ہی ہوگی۔ تم اس سے زیادہ اور کیا توقع کرتے ہو؟“

”تم میری بیوی ہو۔ میں تم سے ایک شوہر کے حقوق مانگ رہا ہوں۔ بچی دو ماہ کی ہوگئی ہے۔ تم میرے حقوق ادا کر سکتی ہو۔“

”میں اپنے مزاج کے خلاف تمہارے حقوق ادا نہیں کروں گی۔“

”تو پھر یہ کیس تمہارے ڈیڈی کی عدالت میں پیش کرنا ہوگا۔“

”تم کچھ بھی کرو۔ میں نے کبھی جھکنا نہیں سیکھا ہے۔ میں زچگی کے بعد ہی یہ میڈیکل رپورٹ حاصل کرچکی ہوں کہ میرے اندر کچھ خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ میرا مکمل علاج ہونے تک مجھے شوہر سے دور رہنا چاہئے۔“

”تم بہت چالباز ہو۔ تم نے اچھی خاصی رقم دے کر ایسی میڈیکل رپورٹ حاصل کی ہوگی۔ میں چند دنوں کے بعد تمہارے ڈیڈی سے کہوں گا کہ میں تمہاری لیڈی ڈاکٹر سے مطمئن نہیں ہوں۔ اپنے اطمینان کے لئے دوسری لیڈی ڈاکٹر سے تمہارا علاج کرانا چاہتا ہوں۔ جب اس ڈاکٹر کی صحیح رپورٹ سامنے آئے گی تو تمہارا جھوٹ کھل جائے گا۔ بہتر ہے کہ یہ جھوٹی رپورٹ پھاڑ کر پھینک دو۔“

”یہ رپورٹ درست ہے۔ میں کبھی کسی دوسری ڈاکٹر سے معائنہ نہیں کراؤں گی۔“

”ایسے معاملات میں شوہر کی مرضی اور اس کے اعتماد کے مطابق عمل کیا جاتا ہے۔ تمہاری ایک نہیں چلے گی۔“

وہ دوسرے دن جلال الدین سے اس سلسلے میں گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن اچانک ہی خبر ملی کہ اس پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ اسے اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ وہاں سے اب وہ چار کاندھوں پر واپس آنے والا تھا۔

رئیس احمد کا ایک بہت بڑا حمایتی تھا' جو موت کی نیند سو گیا تھا۔ بیگم پہلے ہی خود سر تھی اب اور آزاد ہو گئی تھی۔ اس پر کوئی دباؤ ڈالنے والا نہیں تھا۔ صرف ایک وصیت ایسی تھی جس کے شکنجے سے وہ نکل نہیں سکتی تھی۔ رئیس احمد سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس سے طلاق نہیں لے سکتی تھی۔ اپنے یار سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ بے انتہا دولت و جائیداد کو چھوڑ نہیں سکتی تھی اگر رئیس احمد کو چھوڑ دیتی تو اسے ایک محدود ماہانہ رقم سے اپنے سارے اخراجات پورے کرنے پڑتے۔ وہ کبھی کسی معاملے میں محدود نہیں رہی تھی۔ اس کے اخراجات بھی لامحدود رہے تھے۔ اسے یقین ہو گیا کہ باپ اسے بُری طرح زنجیروں میں جکڑ کر گیا ہے۔

وہ حالات سے سمجھوتہ کر کے ایک ہی چھت کے نیچے اس کے ساتھ زندگی گزارنے لگی۔ پھر ایک سال بعد اچانک ہی اس کے رویے میں تبدیلی آنے لگی۔ وہ رئیس احمد کے سامنے ہنسنے ہنسانے اور مسکرانے لگی۔

رئیس احمد نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟"

وہ بولی۔ "میں کبھی نہ مسکراتی مگر مسکرا رہی ہوں۔ تم مجھے کبھی خواب میں بھی حاصل نہ کر پاتے لیکن اب خواب کی تعبیر بن رہی ہوں۔ حالات نے اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ سمجھوتہ کرنا ہی ہوگا۔ ساری زندگی یونہی نہیں گزار سکوں گی۔"

"اب تمہیں عقل آئی ہے۔ کوئی بات نہیں دیر آید درست آید۔"

دونوں میں صلح ہو گئی۔ صلح کے بعد بھی بیگم کا رویہ ملکۂ عالم جیسا رہا۔ عورت راضی ہو جائے۔ پہلو آباد کرتی رہے تو ایسا رویہ برداشت ہو جاتا ہے۔ پھر رئیس احمد کا بگڑتا ہی کیا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں جو کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے اس سے زیادہ حاصل ہو رہا تھا۔

لیکن اس کی پہلی بیوی زرینہ اس سے ناراض رہا کرتی تھی۔ جب ادھر بیگم نے ایک بیٹی کو جنم دیا تھا۔ تب ادھر زرینہ نے اسے ایک بیٹے کا باپ بنایا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اسے اپنے جائز بچے کا باپ بننے کی خوشی حاصل ہو رہی تھی۔ وہ کاروباری مصروفیات کے بہانے دوسرے شہروں اور دوسرے ممالک میں جایا کرتا تھا اور چوری چھپے زرینہ اور اپنے بیٹے سے ملتا رہتا تھا۔ بیگم نے ناجائز پتھر مارا تھا اور زرینہ نے پھول مارا تھا۔ وہ اس پھول کو سینے سے لگا کر چومتا تھا اور کہتا تھا۔ "میں اپنے بیٹے کو دنیا کا بہت بڑا اور کامیاب انسان بناؤں گا۔" اس نے بیٹے کا نام عمران احمد رکھا تھا۔

☆======☆======☆

بہت سارا وقت گزر گیا۔ بچے جوان ہو گئے۔ زرینہ ایک بچے کو جنم دینے کے بعد پھر ماں نہ بن سکی۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق اس میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی تھی۔

بیگم نے پہلی بیٹی شہلا کے بعد ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اس کا نام امیر احمد رکھا گیا۔ دو برسوں کے بعد ایک اور بیٹی پیدا ہوئی اس کا نام سدرہ رکھا گیا۔ اس کے بعد بیگم نے آپریشن کرا لیا۔ بچے کم خوش حال گھرانہ کے اصول پر عمل کیا تھا۔

رئیس احمد کے لئے پہلا بیٹا عمران ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ بھی ماں کی طرح باپ سے ناراض رہتا تھا۔ کہتا تھا۔ "آپ ہمارے لئے بہت کچھ کر رہے ہیں لیکن ایک بیٹے کو باپ کا نام نہیں دے رہے ہیں۔"

"بیٹے! یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ میں تمہارا باپ ہوں۔ تم میرا خون ہو۔ میری اگلی نسل ہو۔ میں تم پر فخر کرتا ہوں۔"

"اگر آپ فخر کرتے ہیں تو ہمیں کراچی آنے سے کیوں روکتے ہیں؟ یہاں بھی چھپ چھپا کر آتے ہیں۔ کیا آپ ساری دنیا کے سامنے مجھے بیٹا کہہ سکتے ہیں؟"

"بیٹے! جس دن تم اس سوسائٹی میں نمایاں مقام حاصل کرو گے اس روز میں اپنے بہت بڑے نقصان کی پرواہ کئے بغیر سب کے سامنے بیٹا کہہ کر تمہیں سینے سے لگاؤں گا۔"

وہ بیٹے اور بیوی کو تسلیاں دے کر واپس آ گیا۔ ایک ہفتے بعد عمران نے فون پر کہا۔

"ڈیڈی! میں اپنی امی کے ساتھ کراچی آ گیا ہوں۔ یہاں ایک کوٹھی کرائے پر لی ہے۔"

رئیس احمد نے پریشان ہو کر کہا "تم میری اجازت کے بغیر یہاں کیوں آئے ہو؟ فوراً واپس چلے جاؤ۔"

"پلیز آپ پریشان نہ ہوں۔ میں جب تک نمایاں مقام حاصل نہیں کروں گا تب تک آپ کی راز داری کو قائم رکھوں گا۔ میں نے وہاں کا کاروبار یہاں منتقل کیا ہے۔ یہاں کاروبار جما رہا ہوں۔ پیراڈائز لان کی سول ایجنسی حاصل کر چکا ہوں۔ یہ بزنس چھوڑ کر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اب آپ ممی سے بات کریں۔"

زرینہ نے کہا۔ "آپ کا بیٹا آپ سے بہتر بزنس مین ثابت ہوگا۔ یہاں کچھ سوچ سمجھ کر ہی آیا ہے۔ آپ اس کے سوتیلوں کے لئے پتا نہیں کیا کچھ کرتے رہتے ہیں۔ یہ یہاں رہ کر آپ سے اپنے حقوق حاصل کرتا رہے گا۔"

"میں نے اپنے عمران کو جتنی چاہت اور توجہ دی ہے اسے میں جانتا ہوں اور میرا خدا جانتا ہے۔ وہ اور کیا چاہتا ہے؟"

"یہاں اس کے لئے ایک کوٹھی خریدیں۔ اس کی سہولت کے لئے فوراً ایک کار دلائیں۔ مالی امداد کی بات نہیں کروں گی۔ وہ تو آپ اپنے بیٹے کو ضرورت سے زیادہ دیتے ہی رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ کوٹھی اور کار وغیرہ بیٹے کو مل جائیں گی۔ چونکہ رازداری سے یہ سب کچھ کرنا ہے اس لئے ذرا وقت لگے گا۔"

یہ اس کے پہلے گھر کے معاملات تھے۔ دوسرے گھر میں کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ وہاں تینوں جوان بچے ایک دوسرے سے گھل مل کر رہتے تھے۔ امیر احمد کو اور سدرہ کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ ان کی بڑی بہن شہلا سوتیلی ہے اور اس کے گھر میں چور راستے سے آئی ہے۔ ویسے وہ تینوں ایک ہی ماں کی اولاد تھے۔ آپس میں بڑی محبت سے رہتے تھے۔

شہلا اور سدرہ تو جیسے بہنیں نہیں سہیلیاں تھیں۔ ایک دوسرے کی رازدار تھیں۔ جوانی میں اکثر بہنیں ایک دوسرے کی رازدار بن جایا کرتی ہیں۔ ایک دوسرے کو اپنے کھٹے میٹھے جذبات کا حال سنایا کرتی ہیں۔ کوئی ان میں دلچسپی لے تو اس کی باتیں سرگوشیوں میں کرتی ہیں۔ شہلا کا ایک بوائے فرینڈ اسد تھا اور ان دنوں خرم نامی ایک خوب رُو جوان سدرہ میں دلچسپیاں لے رہا تھا۔

ان کی عالی شان محل نما کوٹھی کے بائیں طرف جو بنگلا تھا اس میں شہلا اور سدرہ رہا کرتی تھیں۔ دائیں طرف والے بنگلے میں امیر احمد رہتا تھا۔ وہ بہت تنہائی پسند تھا۔ تعلیم حاصل کرتا تھا۔ باپ کے کاروبار میں دلچسپی لیتا تھا۔ پھر سارا وقت تنہائی میں اپنے اس بنگلے کے اندر گزارتا تھا۔ بیگم اور رئیس احمد اپنے بچوں کے درمیان اس عالی شان کوٹھی میں رہتے تھے۔

ایک رات وہ کسی شادی کی تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ شہلا اور سدرہ اپنی سہیلیوں اور دوستوں کی ایک گیٹ ٹوگیدر پارٹی میں شریک ہونے گئی تھیں۔ امیر احمد اپنے بنگلے میں تنہا تھا۔ سی ڈی پلیئر پر ایک خوبصورت سی دُھن سن رہا تھا۔ ایسے وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ اٹھ کر فون کے پاس آیا پھر ریسیور اٹھا کر بولا۔ "ہیلو! میں امیر احمد بول رہا ہوں۔ تم کون ہو؟"

اسے جواب میں ایک مترنم سی ہائے سنائی دی۔ "ہائے میں بول رہی ہوں۔ مجھے آواز سے پہچان سکتے ہو تو پہچان لو۔"

امیر احمد نے ناگواری سے کہا۔ "روبی! میں تمہیں سمجھا چکا ہوں مجھے رات کے وقت فون نہ کیا کرو۔"

"ہائے مجھے روبی کہہ رہے ہو۔ میری آواز سے مجھے پہچان لیا ہے اسے کہتے ہیں محبت۔"

"اسے کہتے ہیں حماقت۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کوئی پلے بوائے نہیں ہوں۔ مجھے صرف اپنی تعلیم سے اور اپنے کاروبار سے دلچسپی ہے۔"

اس نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ وہاں سے چلتا ہوا اپنی ایزی چیئر کے پاس آیا۔ ایسے وقت موبائل فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے اسے آن کر کے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے ایک مترنم ہائے سنائی دی۔ وہ غصے سے بولا۔ "تم کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہو؟"

وہ بولی۔ "موت ہمیشہ زندگی کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔"

"یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟ میں نے وہ فون بند کیا ہے۔ اب موبائل پر پریشان کر رہی ہو۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "میں وہ نہیں ہوں جو اس فون پر بول رہی تھی۔ میں انتظار کر رہی تھی کہ بات ختم کرو گے تو میں موبائل پر تمہیں مخاطب کروں گی۔"

اس نے کچھ سوچتے ہوئے دوسرے فون کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ "تم کیسے جانتی ہو کہ میں کسی دوسرے فون پر گفتگو کر رہا تھا؟"

"میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ تمہارے اتنے قریب ہوں جتنا کہ موت کو ہونا چاہئے۔"

"یہ تم بار بار موت کا حوالہ کیوں دے رہی ہو؟ کون تم ہو؟"

"کہہ چکی ہوں موت ہوں لیکن 'مؤنث نہیں مذکر ہوں۔ میرے پاس وائس چینجر ہے۔ اس آلے کے ذریعے مرد کی آواز رس بھری عورت کی آواز بن جاتی ہے اور اگر عورت بولے تو اس کی آواز مرد کی طرح بھاری بھرکم سنائی دیتی ہے۔"

امیر احمد نے پوچھا۔ "تم وائس چینجر کے ذریعے اپنی آواز تبدیل کیوں کر رہے ہو؟ اپنی اصل آواز اور لب و لہجہ مجھ سے کیوں چھپا رہے ہو؟"

"واردات کرنے سے پہلے ہر پہلو سے محتاط رہنا پڑتا ہے۔ میں پوری طرح سے محتاط رہ کر تمہیں قتل کرنے آیا ہوں۔"

امیر احمد نے پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک طرف شیشے کی بہت بڑی دیوار تھی۔ اس دیوار کے آر پار ان کی کوٹھی اور بنگلے کا باغیچہ اور احاطہ دکھائی دیتا تھا۔ باہر باغیچے میں دھیمی دھیمی روشنی تھی۔ اس روشنی میں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے پلٹ کر ایک طرف چلتے ہوئے کہا۔ "کیا تم جاسوسی ناول پڑھتے اور فلمیں دیکھتے ہو؟ حقیقتاً ایسے قاتل نہیں ہوتے کہ قتل کرنے سے پہلے اپنے مطلوب کو یوں تھرلنگ اور سسپنس کے ساتھ پیشگی اطلاع دیتے ہوں۔"

"تم کرائم سائیکلوجی کو نہیں سمجھتے ہو۔ قتل کرنے کے سلسلے میں جو درندگی ہوتی ہے۔ قاتل اس درندگی سے لذت حاصل کرتے ہیں۔ مجھے بڑا مزا آ رہا ہے۔ کیا تم دہشت زدہ نہیں ہو؟"

"بائی گاڈ! بالکل نہیں۔ اکثر جوان لڑکے اور لڑکیوں کے فون راتوں کو آتے ہیں۔ وہ یا تو رومانی اور لچر قسم کی گفتگو کرتے ہیں یا پھر فضول دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔ میں ایسے فون بند کر دیتا ہوں' لیکن اس وقت مجھے ایک تجسّس ہے' تم کیسے جانتے ہو کہ ابھی میں دوسرے فون پر باتیں کر رہا تھا؟ کیا واقعی تم یہاں کہیں آس پاس موجود ہو؟"

"موجود ہوں۔ تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ تم اس وقت سی ڈی پلیئر کی طرف رخ کئے کھڑے ہو۔ اب اچانک پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھ رہے ہو۔"

وہ ذرا سہم کر بولا۔ "تم کون ہو؟ اور کیا چاہتے ہو؟ ویسے ابھی تم نے کہا ہے کہ مجھے قتل کرنا چاہتے ہو مگر کیوں؟ مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ اس بنگلے میں گھسنے کی حماقت نہ کرنا۔ میرے پاس ریوالور ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی جیسے دھماکا ہوا۔ زلزلہ آ گیا۔ شیشے کی وہ دیوار اچانک ٹوٹ گئی تھی۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔ کوئی اس ٹوٹے ہوئے شیشے سے گزرتا ہوا اندر آ گیا تھا۔

اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے نائیلون کی جرابوں کا ماسک اپنے چہرے پر پہن رکھا تھا۔ امیر احمد اسے دیکھتے ہی تیزی سے پلٹ کر دوڑتا ہوا اپنی الماری کے پاس آیا۔ وہ اسے کھول کر اندر سے ریوالور نکالنا چاہتا تھا کہ اس سے پہلے ہی دشمن نے اس کی

طرف چھلانگ لگائی۔ کھلے ہوئے چاقو سے اس پر وار کیا۔ چاقو اس کے بازو پر لگا۔ وہ وہاں سے پلٹ کر دروازے کی طرف بھاگنے لگا لیکن باہر جانے کے لئے دروازہ کھولنے میں دیر لگی' وہ چاقو اس کی پشت میں آ کر پیوست ہو گیا۔

قاتل نے چاقو کو اس کی پشت سے نکالا۔ وہ کراہتا ہوا پلٹ کر بے بسی سے بولا۔ "تم کون ہو؟ کیوں مجھے قتل کر رہے ہو؟"

وہ چاقو والا ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے بولا۔ "ایک سوتیلے کا منافع اسی میں ہے کہ دوسرا سوتیلا فنا ہو جائے۔"

یہ کہتے ہی اس نے چاقو اس کے سینے میں گھونپ دیا پھر وہ چاقو سے ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا وار کرتا چلا گیا۔ امیر احمد کے دیدے پھیل گئے تھے۔ اس کا منہ کھل گیا تھا۔ وہ ناک سے اور کھلے ہوئے منہ سے سانسیں نہیں لے سکتا تھا۔ سانسوں کا سلسلہ ٹوٹ چکا تھا۔

وہ عالی شان محل نما کوٹھی رات کے گہرے سناٹے میں اور نیم تاریکی میں ایک دم سے ویران ہو گئی تھی۔ ماں باپ شادی میں گئے ہوئے تھے اور دونوں بہنیں گیٹ ٹو گیدر پارٹی میں تھیں۔ اتنے بڑے محل اور جائیداد کا وارث بھی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو کر اس محل کو اور بھی ویران اور پُراسرار بنا رہا تھا۔

رات کے ایک بجے بیگم اور رئیس احمد اپنی کار میں بیٹھ کر اپنی کوٹھی میں واپس آئے۔ رئیس احمد نے کار کو پورچ میں روکتے ہوئے کہا۔ "بیٹیاں کہیں گئی ہیں۔ بیٹے کے بنگلے میں روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ وہ ابھی تک جاگ رہا ہے۔"

بیگم نے کار سے اتر کر کہا۔ "پتا نہیں اس نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔ گھر میں کھانے پینے کی کمی نہیں ہے پھر بھی یہ لڑکا وقت پر کھاتا نہیں ہے؟"

وہ بڑبڑاتے ہوئے بیٹے کے بنگلے کی طرف جانے لگی۔ رئیس احمد نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔ "ہمارا بیٹا اصولوں کا پابند ہے۔ راتوں کو بھوکا نہیں سوتا ہے۔ کچھ نہ کچھ کھا لیتا ہے۔"

وہ دونوں چلتے چلتے ٹھٹک گئے۔ بنگلے سے ذرا قریب ہونے پر انہیں شیشے کی دیوار ٹوٹی ہوئی دکھائی دی۔ رئیس احمد نے چیخ کر آواز دی۔ "امیر! تم کہاں ہو؟ یہ شیشہ کیسے ٹوٹ گیا ہے؟"

انہیں جواب نہیں ملا۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے شیشے کی دیوار کے قریب آئے تو انہیں کمرے کے اندر ایک دروازے کے پاس بیٹے کی خون آلود لاش دکھائی دی۔ بیگم کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی پھر وہ چکرا کر وہیں گر پڑی۔

پولیس کے اعلیٰ افسران کو اور انٹیلی جنیس والوں کو فون پر اطلاع دی گئی۔ رئیس احمد کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ کاروباری حلقے میں ٹاپ کا بزنس مین تھا۔ اس واردات کی اطلاع ملتے ہی پریس رپورٹرز اور فوٹوگرافرز وغیرہ بھی پہنچ گئے۔ شہلا اور سدرہ بھی اطلاع ملتے ہی روتی پیٹتی ہوئی آگئیں۔ بیگم کا صدمے سے بُرا حال تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔

انٹیلی جنیس کا ایک ذہین اور نامور جاسوس سرفراز خان رئیس احمد سے پوچھ رہا تھا۔

"آپ کے بیٹے کے دشمن کون لوگ ہوسکتے ہیں؟"

وہ روتے ہوئے بولا۔ "کوئی میرے بیٹے کا دشمن نہیں تھا۔ وہ اتنا سیدھا سادہ بے ضرر جوان تھا۔ جس سے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔"

"تو پھر اس قتل کے پیچھے کوئی خاندانی دشمنی ہوسکتی ہے؟"

"ہمارا خاندان بہت مختصر سا ہے۔ ہم میاں بیوی' دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بیٹے کی ہلاکت سے یہ خاندان اور مختصر ہوگیا ہے۔ باقی رشتے داروں سے گہرے مراسم نہیں ہیں۔ ہم ان کے دُکھ سکھ میں کام آتے ہیں۔ وہ ہم سے خوش رہتے ہیں۔ کوئی ہم سے نفرت نہیں کرتا۔"

ایک ماتحت نے جاسوس سرفراز سے کہا۔ "سر! یہاں جو فون رکھا ہے۔ اس کے سی ایل آئی میں ایک فون نمبر درج ہے۔ آخری بار مقتول سے جس نے بھی گفتگو کی تھی اس کا یہی فون نمبر ہے۔"

"معلوم کرو یہ کس کا فون نمبر ہے اور کس نے مقتول امیر احمد سے گفتگو کی تھی؟ اس کا نام پتا سب نوٹ کرو۔"

پھر اس نے رئیس احمد سے پوچھا۔ "کیا آپ کا بیٹا موبائل فون نہیں رکھتا تھا؟"

"اس کے پاس موبائل فون تھا۔ یہیں کہیں ہوگا۔"

وہ فون نہیں ملا۔ قاتل اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ شہلا اور سدرہ رو رو کر کہہ رہی تھیں۔ "ہمارا بھائی بہت معصوم تھا۔ اس کی ذات سے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچی

تھی۔ پتا نہیں کسی کو بھائی سے کیا دشمنی تھی؟"

شہلا کا منگیتر اسد اور سدرہ کا محبوب خرم بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ ان دونوں کو تسلیاں دے رہے تھے۔ "اب رونے اور آنسو بہاتے رہنے سے بھائی واپس نہیں آئے گا۔ اس کی مغفرت کے لئے دعائیں مانگو۔ تمہیں رونا نہیں چاہئے۔ صبر کرو۔"

خرم نے سدرہ سے کہا۔ "سرفراز صاحب قتل کی وجوہات معلوم کر رہے ہیں۔ کوئی بھی وجہ معلوم ہوگئی تو پھر قاتل کا سراغ مل جائے گا۔ تمہیں بھی سوچنا اور غور کرنا چاہئے۔ آخر امیر احمد کو قتل کیوں کیا گیا ہے؟ آخر کوئی تو وجہ ہوگی؟"

سرفراز خان ایک کمرے میں رئیس احمد کے ساتھ تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے کرید کرید کر اس کی پوری فیملی ہسٹری معلوم کر رہا تھا۔ رئیس اسے پوری تفصیل سے اپنی فیملی کے بارے میں بہت کچھ بتانے لگا۔ پھر اس نے گفتگو کے دوران میں سرفراز سے کہا۔

"ایکس کیوز می' میں ابھی واش روم سے ہو کر آتا ہوں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر چلا گیا۔ سرفراز خان سر جھکائے بڑی سنجیدگی سے اس واردات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ قتل کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ امیر احمد کی الماری میں دو لاکھ روپے نقد رکھے ہوئے تھے۔ قاتل نے اس رقم کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ چوری کی نیت سے نہیں صرف قتل کے ارادے سے آیا تھا۔ اگر قتل کی کوئی وجہ معلوم نہ ہوتی تو پھر یہی رائے قائم کی جاتی کہ یہ واردات کرنے والا کوئی جنونی قاتل تھا۔ کوئی ذہنی مریض تھا۔

موبائل فون کے بزر نے سرفراز کو چونکا دیا۔ رئیس احمد اپنا فون وہیں سینٹر ٹیبل پر چھوڑ کر واش روم گیا تھا۔ بار بار بزر کی آواز ابھرنے لگی تو سرفراز نے اسے اٹھا کر آن کرتے ہوئے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے کسی نے سرگوشی کے انداز میں مخاطب کیا۔ "ہیلو ڈیڈی! میں عمران بول رہا ہوں۔"

سرفراز نے بھاری بھرکم آواز میں صرف ہوں کہا۔ دوسری طرف سے عمران نے کہا۔ "آپ نے کہا تھا ڈیفنس میں آپ میرے نام سے ایک کوٹھی خرید رہے ہیں۔ ایک ہفتہ گزر چکا ہے۔ اس کوٹھی کے سلسلے میں کیا ہو رہا ہے؟"

سرفراز نے رئیس احمد کی آواز بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم کہاں ہو؟ میں ابھی تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں اسی کرائے کی کوٹھی میں ہوں۔ آپ تو یہاں چھپ کر بھی نہیں آتے ہیں اگر ابھی آنا چاہیں تو امی خوش ہو جائیں گی۔"

"ابھی آؤں گا۔ پتا بتاؤ۔"

"میں نے آپ کو پتا بتایا تھا۔"

"بیٹے! میں نے ڈائری میں نوٹ کیا تھا۔ پتا نہیں وہ ڈائری کہاں رکھ دی ہے۔ دیر نہ کرو۔ پتا بتاؤ۔ میں ابھی آرہا ہوں۔"

عمران نے پتا بتایا۔ سرفراز نے فون بند کر دیا۔ اس موبائل پر عمران کا فون نمبر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کوٹھی کے پتے کے ساتھ وہ نمبر بھی نوٹ کرلیا پھر اس فون کو بند کرکے پہلے کی طرح اسے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد رئیس احمد نے واش روم سے باہر آتے ہوئے کہا۔ "مجھے فون کا بزر سنائی دیا تھا۔ کیا میری کوئی کال آئی تھی؟"

"نہیں۔ میرے اپنے موبائل پر ایک کال آئی تھی۔ مجھے ہیڈ آفس میں بلایا گیا ہے۔ میں ابھی جارہا ہوں۔ رات کے تین بج چکے ہیں کل کسی وقت آپ سے ملاقات ہوگی۔"

وہ وہاں سے چلتا ہوا واردات والے کمرے میں آیا۔ امیر احمد کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے لے جائی جاچکی تھی۔ ماتحت جاسوس اور فنگر پرنٹ والے اپنا کام کر چکے تھے۔ ایک ماتحت نے سرفراز سے کہا۔ "سر یہاں کے فون پر آخری بار جو کال آئی تھی۔ اس کے فون نمبر سے پتا چلا ہے کہ وہ کسی مس روبی دلشاد کا فون ہے اور وہ گلشن کے علاقے میں رہتی ہے۔"

سرفراز نے کہا۔ "کل صبح نو بجے روبی دلشاد کو دفتر میں لے آؤ۔ میں ابھی ضروری کام سے جارہا ہوں۔"

وہ دو مسلح سپاہیوں کو ساتھ لے کر وہاں سے چلا گیا۔ بیگم بڑی دیر تک سکتے کے عالم میں رہی تھیں۔ دونوں بیٹیاں اسے وہاں سے لے جانے لگیں۔ کہنے لگیں۔ "آپ یہاں رہیں گی تو بیٹے کی ایک ایک چیز یہاں دیکھ کر اور زیادہ صدمے سے دوچار ہوتی رہیں گی۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "میں جانے سے پہلے اپنے بیٹے کی صورت دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔"

رئیس نے کہا۔ "پولیس والے اسے پوسٹ مارٹم کے لئے لے گئے ہیں۔ صبح اس کی لاش واپس ملے گی تو ہم دل پر پتھر رکھ کر تدفین کی آخری رسومات پوری کریں گے۔"

ماں باپ اور بیٹیاں روتی پیٹتی اس عالی شان کوٹھی میں آگئیں۔ امیر احمد کی المناک موت کی اطلاع تمام رشتے داروں کو دی گئی تھی۔ وہ رشتے دار ایک ایک کرکے آرہے تھے۔ ان سے تعزیت کر رہے تھے اور صبر کی تلقین کر رہے تھے۔

عمران اپنی ماں کے ساتھ جاگ رہا تھا۔ رات کے تین بج گئے تھے۔ رئیس احمد نے کہا تھا کہ وہ ان سے ملنے آرہا ہے۔ آدھے گھنٹے بعد کال بیل کی آواز سنائی دی تو عمران نے آکر دروازہ کھولا۔ باہر سرفراز دو مسلح سپاہیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "فرمائیے۔"

"میرا نام سرفراز خان ہے۔ میرا تعلق انٹیلی جینس کے شعبے سے ہے اگر تم سو رہے ہوتے تو تمہیں جگانے نہ آتا۔ جاگ رہے ہو۔ اس لئے دو چار باتیں کرنے آیا ہوں۔"

"آپ نے باہر سے کیسے معلوم کیا کہ میں اپنی کوٹھی میں جاگ رہا ہوں؟"

"کیا ساری باتیں دروازے پر کرو گے؟"

"جی نہیں۔ آئیے۔ تشریف لائیے۔"

زرینہ نے مسلح سپاہیوں کو دیکھ کر پوچھا۔ "پولیس اتنی رات کو کیوں آئی ہے؟"

سرفراز نے کہا۔ "آپ کے بیٹے نے فون پر اپنے باپ سے کہا تھا کہ رئیس احمد یہاں آئیں گے تو اس کی امی کو خوشی ہوگی۔"

ماں بیٹے نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر عمران نے انجان بن کر پوچھا۔ "آپ کس رئیس احمد کی بات کر رہے ہیں؟"

"میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔ جس سے تم نے آدھا گھنٹہ پہلے فون پر گفتگو کی تھی۔ ڈیفنس والی کوٹھی کا سودا ہوگیا ہے مگر ابھی تمہیں اس کوٹھی کا قبضہ نہیں ملا ہے۔"

ماں بیٹے نے پھر حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر زرینہ نے پوچھا۔ "آپ یہ باتیں کیسے جانتے ہیں؟"

"ہم جاسوس ہیں کوئی اپنے اندر کی بات ہم سے چھپانا چاہے تو ہم اس کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اس کا کلیجا نکال لیتے ہیں۔"

وہ دونوں پریشان ہوگئے تھے۔ کچھ سہم گئے تھے۔ سرفراز نے پوچھا۔ "خاتون! آپ

کا نام کیا ہے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "زرینہ۔"

"پلیز پورا نام بتائیں؟"

"وہ.......... وہ میرا نام زرینہ خاتون ہے۔"

"شریف خاتون کے نام کے ساتھ ان کے مجازی خدا کا بھی نام ہوتا ہے۔ آپ کے مجازی خدا کا نام کیا ہے؟"

عمران نے کہا۔ "آپ میری ممی سے ایسا سوال کیوں کر رہے ہیں؟"

"اگر تمہیں برا لگ رہا ہے تو چلو تم اپنے باپ کا نام بتا دو مگر صحیح نام بتانا۔ نام غلط ہوگا تو ماں کے کردار پر دھبہ لگے گا۔"

عمران مشکل میں پڑ گیا۔ اس کے باپ نے تقریباً پچیس برسوں سے ان ماں بیٹے کو راز میں رکھا تھا۔ اس نے انہیں دولت دی تھی ان کے لئے جائیداد بنانا چاہتا تھا۔ ہر طرح کا عیش و آرام دیتا رہا تھا اور تاکید کرتا رہا تھا کہ کبھی زرینہ سے میاں بیوی کا رشتہ اور عمران سے باپ بیٹے کا رشتہ ظاہر نہ کیا جائے۔ صرف ایک باپ کا نام چھپانے سے انہیں بے انتہا دولت ملتی رہتی تھی۔

سرفراز نے پوچھا۔ "کس الجھن میں پڑ گئے ہو؟ بیٹے تو بڑے فخر سے باپ کا نام لیتے ہیں۔ اگر نام شرمناک ہو تو زبان سے نہ بولو۔ اپنا شناختی کارڈ دکھا دو۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "دیکھئے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ آپ ہمارے گھریلو اور ذاتی معاملات سے تعلق رکھنے والی باتیں نہ پوچھیں۔ اتنا بتا دیں کہ اتنی رات کو کیوں آئے ہیں؟"

"بہت سنگین معاملہ ہے۔ اس لئے آیا ہوں۔ آج آدھی رات کے بعد کسی نے رئیس احمد کے بیٹے امیر احمد کو قتل کیا ہے۔ اس گھر میں ماتم ہو رہا ہے۔ میں قتل کی اس واردات کے سلسلے میں کچھ معلوم کرنے آیا ہوں۔ ویسے تم دونوں ایک دم سے پریشان کیوں ہو گئے ہو؟"

زرینہ نے کہا۔ "آپ اتنی المناک خبر سنا رہے ہیں۔ کیا ہمیں پریشان نہیں ہونا چاہئے؟"

"ان کے ہاں المناک واردات ہوئی ہے۔ آپ دونوں کو ان سے کیا لینا ہے؟ کیوں

پریشان ہو رہے ہیں؟"

عمران نے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ اتنی بڑی واردات ہوگئی ہے اگر ایسا ہوتا تو وہ ابھی فون پر.........."

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ سرفراز نے کہا۔ "رئیس احمد نے تمہیں فون پر اس واردات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ وہ کیسے بتاتے۔ تمہارا فون میں اٹینڈ کر رہا تھا۔ وہ واش روم میں تھے۔ میں نے ان کی آواز بنا کر گفتگو کی' تم دھوکا کھا گئے۔ اب اُگل دو کہ تم کس رشتے سے رئیس احمد کو ڈیڈی کہتے ہو؟"

عمران سر جھکا کر ایک صوفے کے احاطے پر بیٹھ گیا۔ زرینہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سرفراز سے کہا۔ "اتنی بڑی واردات ہو چکی ہے اب ہمیں سچائی کو نہیں چھپانا چاہئے۔ سچ یہ ہے کہ میں رئیس احمد کی پہلی شریکِ حیات ہوں اور یہ عمران احمد میرا اور رئیس احمد کا بیٹا ہے۔"

"آپ کی شادی کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟"

"پچیس برس ہوگئے ہیں۔ شادی کے ایک برس بعد ہمارا یہ بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اس کے باپ نے تاکید کی تھی کہ مجھے اپنی گھریلو اور ازدواجی زندگی کو دنیا والوں سے چھپائے رکھنا ہے۔ اسی میں ہماری بہتری ہے۔"

"کیسی بہتری ہے؟ وہاں بیگم بانو زوجہ رئیس احمد اور اس کے بچوں سے اور اس کے خاندان والوں سے یہ پہلی شادی کیوں چھپائی گئی ہے؟"

"انہوں نے خود کو غیر شادی شدہ ظاہر کر کے بیگم بانو سے شادی کی تھی۔ اگر ہمارا رشتہ ظاہر ہو جاتا تو بیگم بانو ان سے طلاق لے لیتیں اور ہم محتاجی اور مفلسی کی زندگی گزارتے رہتے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے میاں' بیگم بانو کی دولت لوٹ کھسوٹ کر تم ماں بیٹے کی طرف منتقل کر رہے ہیں۔"

"پلیز آپ لوٹنے کھسوٹنے کی باتیں نہ کریں۔ رئیس احمد نے ان کا کروڑوں کا اور اربوں کا کاروبار سنبھالا ہے۔ انہوں نے کاروبار میں کبھی خسارہ نہیں ہونے دیا۔ کبھی بیگم بانو کو نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ ہم ماں بیٹے کو اتنا ہی دیتے ہیں جتنا ایک محنت کرنے والے کو دینا چاہئے۔ وہ ہمارے لئے بیگم بانو کی ملوں اور فیکٹریوں میں محنت کرتے ہیں۔ بیرونی

ممالک کے کاروباری معاملات سنبھالتے ہیں۔ ایک طرح سے وہ پورے کاروبار کے منتظم اعلیٰ ہیں اور حصے دار بھی۔"

سرفراز نے کہا۔ "میں مانتا ہوں۔ رئیس احمد اپنی جائز محنت کی کمائی تمہیں دیتے ہیں لیکن جتنا ملتا رہے' اتنا ہی لالچ بڑھتا ہے۔"

زرینہ نے کہا۔ "ہم لالچی نہیں ہیں۔"

"تم لالچی نہیں ہو' لیکن تمہارا بیٹا جوان ہے۔ جذباتی ہے۔ یہ حاسدانہ جذبات اس کے اندر پکتے رہتے ہیں کہ اس کے باپ کا دوسرا بیٹا اس کا سوتیلا بھائی امیر احمد خاندانی بزنس مین ہے۔ کروڑوں میں کھیلتا رہتا ہے۔ اس کا باپ وہاں جو کچھ کمارہا ہے' وہ سارے کا سارا تمہارے بیٹے عمران کو مل سکتا ہے اگر امیر احمد اس دنیا میں نہ رہے اور اب وہ نہیں رہا۔ اسے دوسری دنیا میں پہنچا دیا گیا ہے۔"

زرینہ نے سہم کر کہا۔ "آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا ہم اپنے شوہر کی ساری کمائی حاصل کرنے کے لئے اس سوتیلے کو قتل کریں گے؟"

"قتل کریں گے نہیں کرا چکے ہیں۔ میں تمام رات اسی مسئلے پر الجھا رہا کہ قتل کی وجہ معلوم کیوں نہیں ہو رہی ہے لیکن تمہارے بیٹے کے ایک فون نے میری مشکل آسان کر دی ہے۔"

عمران نے کہا۔ "آپ ہمارے بارے میں غلط رائے قائم کر رہے ہیں۔ کیا میں آپ کو قاتل دکھائی دیتا ہوں؟ میرے ہاتھ دیکھئے کیا قاتل کے ہاتھ ایسے قلم پکڑنے والے نرم و نازک ہوتے ہیں؟"

"تم قتل نہیں کر سکتے مگر کرا سکتے ہو۔ اربوں روپے کا کاروبار یہاں سے بیرونی ممالک تک پھیلا ہوا ہے اگر سوتیلے نہیں رہیں گے۔ سوتیلے بھائی کی طرح سوتیلی بہنیں بھی نہیں رہیں گی ایک دن سوتیلی ماں بھی چل بسے گی تو ان کا سب کچھ تمہارے باپ کے ذریعے تمہیں مل جائے گا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ آپ الزام دے رہے ہیں۔"

"یہ سیدھی سی سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ باقی اور باتیں بھی تم حوالات میں رہ کر ہمیں سمجھاؤ گے۔ میں تمہیں گرفتار کر رہا ہوں۔"

زرینہ رونے' چیخنے' چلانے اور احتجاج کرنے لگی۔ عمران نے ماں کو تسلی دیتے

ہوئے کہا۔ "ممی! چپ ہوجائیں۔ سرفراز صاحب کو شبہ کرنے کا پورا حق ہے۔ یہ اپنی کارروائی کر رہے ہیں۔ آپ اپنی طرف سے کارروائی کریں۔ میں ان کے ساتھ جارہا ہوں۔ آپ ابھی فون پر ڈیڈی کو یہ باتیں بتائیں گی تو وہ فوراً ہی مجھے ضمانت پر رہا کرالیں گے۔"

وہ سرفراز اور سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ زرینہ نے فون کے ذریعے رئیس احمد سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "آپ وہاں ایک بیٹے کی ہلاکت کا ماتم کر رہے ہیں۔ آپ کے دوسرے بیٹے کو بھی سولی پر چڑھایا جارہا ہے۔"

رئیس احمد نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ عمران کہاں ہے؟ میری اس سے بات کراؤ۔"

"انٹیلی جنیس کا کوئی افسر سرفراز خان آیا تھا۔ اس کے ساتھ دو سپاہی تھے۔ وہ عمران کو پکڑ کرلے گئے ہیں۔"

اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "سرفراز خان وہاں کیسے پہنچ گیا؟"

"عمران نے آپ کو فون کیا تھا۔ آپ پتا نہیں اپنا فون کہاں چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ فون سرفراز نے اٹینڈ کیا تھا۔ اسے ہمارا آپ کا رشتہ معلوم ہوچکا ہے۔"

"یہ کیا بول رہی ہو؟ صرف ایک فون کال سے ہمارا یہ راز کیسے ظاہر ہوگیا؟"

"آپ بحث نہ کریں۔ فوراً بیٹے کو رہا کرائیں۔ پتا نہیں وہ اسے حوالات میں لے جاکر اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ وہ تو صاف کہہ رہا تھا کہ ہم سوتیلے ہیں اور ہم نے دولت اور جائیداد کے لالچ میں ایک سوتیلے کو قتل کرایا ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟ میں ابھی انٹیلی جنیس کے افسران سے ملتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں بیٹے کو واپس لے آؤں گا۔"

رئیس احمد نے فون بند کردیا۔ وہ بُری طرح اُلجھ گیا تھا۔ گھر میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ اس کے ایک بیٹے کو قتل کیا گیا تھا۔ دوسرے بیٹے کو شبہے کی بنا پر حوالات میں پہنچایا گیا تھا۔ یہ صدمات کچھ کم نہیں تھے۔ اب پچیس برسوں سے چھپایا ہوا راز بھی سب کے سامنے کھلنے والا تھا۔ آئندہ بیگم بانو سے سوتیلوں کے خلاف زبردست جنگ چھڑنے والی تھی۔

وہ پولیس کمشنر اور ڈپٹی کمشنر وغیرہ سے رابطے کرنے لگا۔ ایسے افسروں اور سرکاری

عہدے داروں سے اس کے گہرے مراسم رہتے تھے۔ انہوں نے اسے یقین دلایا کہ حوالات میں اس کے بیٹے کو ٹارچر نہیں کیا جائے گا۔ قانونی تقاضے پورے کئے جائیں گے۔ آپ کل صبح ہی کورٹ سے بیٹے کی ضمانت حاصل کرلیں۔ ہم بھی سفارش کریں گے۔

رئیس احمد نے اپنے وکیل کو فون پر کہا کہ صبح عدالت کا دروازہ کھلتے ہی وہ وہاں پہنچ کراس کے بیٹے عمران احمد کی رہائی کے لئے اجازت نامہ حاصل کرلے۔ ضمانت کے طور پر بڑی سے بڑی رقم دی جاسکتی ہے۔

وکیل نے کہا۔ ”آپ کا تو ایک ہی بیٹا امیر احمد ہے۔ کیا دوسرا کوئی عمران احمد بھی ہے؟“

چونکہ وہ وکیل تھا۔ اسے سارے حالات کا علم ہونا چاہئے تھا اس لئے رئیس احمد نے اسے مختصر طور پر بتایا کہ اس نے رازدار) سے دوسری شادی کی تھی۔ اس بیوی سے اس کا ایک بیٹا عمران احمد ہے۔ اس کی بیوی بیگم بانو سے جو بیٹا امیر احمد تھا اسے پچھلی رات کسی نے قتل کردیا ہے۔ اس قتل کا الزام اس کے دوسرے بیٹے عمران احمد پر آیا ہے۔

رئیس احمد کار ڈرائیو کرتا رہا اور فون پر وکیل کو یہ باتیں سمجھاتا رہا پھر وہ انٹیلی جینس والوں کے دفتر............ پہنچ گیا۔ صبح ہو رہی تھی سرفراز خان نے اس کے بیٹے عمران کو آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کردیا تھا۔ اسے وارننگ دے رہا تھا کہ وہ قتل کے سلسلے میں سچ نہیں اُگلے گا تو اسے بُری طرح ٹارچر کیا جائے گا۔

رئیس احمد نے وہاں آکر کہا۔ ”مسٹر سرفراز! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ عمران احمد کو گرفتار کرنے سے پہلے آپ کو ہمارے اسٹیٹس کا خیال رکھنا چاہئے تھا۔“

”جی ہاں میں نے خیال رکھا ہے اسی لئے ابھی تک آپ کے بیٹے کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ آپ تو بہت پہنچے ہوئے ہیں اوپر سے فون آرہے ہیں کہ آپ کے بیٹے سے نرم رویہ اختیار کیا جائے۔ قانونی تقاضے پورے کئے جائیں۔ میں یہی کر رہا ہوں۔ اچھا ہوا آپ آگئے‘ آپ سے بھی کچھ سوالات ہوجائیں۔ آپ نے پہلی شادی زرینہ سے کی تھی یا بیگم بانو سے؟“

”پہلی شادی زرینہ سے کی تھی۔ یہ میرے گھریلو ذاتی معاملات ہیں۔ اس سلسلے میں سوالات نہ کریں میں جواب نہیں دوں گا۔“

”جواب اس لئے دینا چاہئے کہ ایک بیٹا قتل ہوچکا ہے اور دوسرے بیٹے پر یقین کی

حد تک شبہ ہے کہ اسی نے سوتیلے بھائی کو قتل کیا ہے۔ آپ جواب نہیں دیں گے تو عمران کے خلاف شبہ اور مضبوط ہوتا جائے گا۔ ایسے وقت آپ کو غصے سے نہیں عقل سے کام لینا چاہئے۔“

وہ نرم پڑگیا۔ دوسرے بیٹے کو بچانے کے لئے وہ سرفراز کے قدموں میں بھی جھک سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ ”آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

”مسٹر رئیس احمد! جب بھائیوں اور بہنوں کو یہ یقین ہوجائے کہ والدین نے دولت اور جائیداد کی تقسیم انصاف سے کی ہے۔ سب کو ان کا جائز حصہ ملے گا تو پھران بھائیوں اور بہنوں میں کسی طرح کی عداوت نہیں رہتی۔ عمران احمد سوتیلا ہے۔ اسے بیگم بانو کی دولت و جائیداد سے پھوٹی کوڑی نہیں ملنے والی تھی‘ صرف آپ کے ذریعے اسے چوری چھپے کچھ مل رہا ہے اور آپ ایک بیٹے کے مقابلے میں دوسرے بیٹے کو کچھ دے کر تھوڑا سادے کرنہ تو مطمئن کرسکتے ہیں اور نہ اسے ذہنی طور پر نارمل رکھ سکتے ہیں۔“

”آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میرا یہ بیٹا عمران ابنارمل ہے اس نے حسد اور جلن میں اور دولت کے لالچ میں میرے دوسرے بیٹے کو قتل کیا ہے؟“

”میں اور بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔ شبہ کرنا ہمارا کام ہے۔ جتنے بھی شبہات ہیں۔ ان کی تصدیق کرنا میرا فرض ہے۔“

رئیس احمد کے موبائل کا بزر بولنے لگا۔ اس نے اسے آن کرکے کان سے لگایا تو دوسری طرف سے اطلاع ملی کہ مقتول بیٹے کی لاش ہسپتال سے واپس آگئی ہے۔ اس نے کہا۔ ”میں آرہا ہوں۔ تدفین کے انتظامات کرو۔ میں پہنچ رہا ہوں۔“

اس نے فون بند کرکے سرفراز سے کہا۔ ”میرا ایک بیٹا یہاں کسٹڈی میں ہے۔ دوسرے بیٹے کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوچکا ہے۔ اسے اسپتال سے واپس لایا گیا ہے۔ اس کی تدفین کی ساری ذمے داریاں مجھے پوری کرنی ہیں۔ آپ ایک انسان ہیں میری پریشانیوں کو سمجھیں۔ مجھ سے وعدہ کریں۔ یہاں میرے بیٹے کو ٹارچر نہیں کریں گے۔ میں جلد ہی تدفین سے فارغ ہوکر یہاں آؤں گا۔ پلیز میرے بڑھاپے کا خیال کریں۔“

سرفراز نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ”میں ظالم نہیں ہوں۔ خواہ مخواہ آپ کے بیٹے پر ظلم نہیں کروں گا۔ آپ اطمینان سے جائیں یہاں آپ کے بیٹے کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔“

سرفراز نے ان باپ بیٹے کو ملایا۔ وہ بیٹے کو گلے سے لگا کر تھپکتے ہوئے بولا۔ "حوصلہ رکھو تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ سوتیلے کہلاتے ہو اس لئے تم پر شبہ کیا جا رہا ہے۔ اللہ نے چاہا تو تمہارے خلاف تمام شبہات غلط ثابت ہوں گے۔"

☆======☆======☆

وہ بیٹے کو تسلیاں دے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد سرفراز نے کہا۔ "قتل کی وجہ معلوم کرنے کے لئے میری تمام رات گزر گئی۔ شاید آج دن کو بھی سونا نصیب نہیں ہو گا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم رازدار بن جائیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ سچ بولو گے، مجھے اپنا رازدار بناؤ گے تو میں تمہارے جرم کی ایسی پردہ پوشی کروں گا کہ پھر کبھی کوئی تم پر شبہ نہیں کرے گا۔"

عمران نے کہا۔ "سرفراز صاحب! آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ میں نے زندگی میں کبھی قانون کے خلاف کوئی کام نہیں کیا ہے۔ ممی نے مجھے تعلیم دلائی ہے۔ ایک ذمے دار ماں کی طرح میری تربیت کی ہے۔ میں اس ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں امیر احمد کو قتل کرنا تو دور کی بات ہے' میں نے اس سوتیلے بھائی کو دور سے بھی نہیں دیکھا ہے۔ میں دو ہفتے پہلے اس شہر میں آیا ہوں۔ میں نے اپنے ڈیڈی کی دوسری فیملی کے کسی فرد کو بھی نہیں دیکھا ہے۔ ہم ہمیشہ سے فیصل آباد میں رہے ہیں۔ میں یہاں جب بھی کاروبار کے سلسلے میں آتا ہوں تو ڈیڈی سے بھی نہیں ملتا۔ انہوں نے سختی سے منع کیا تھا کہ میں اس شہر میں آ کر کبھی ان سے ملاقات نہ کروں۔ اس بار میں مستقل طور پر کاروبار کرنے کے لئے دو ہفتے پہلے یہاں آیا ہوں۔ آپ انکوائری کریں گے تو میرا یہ بیان درست پائیں گے۔"

وہ اس کی باتیں سن رہا تھا اور اسے ٹٹولتی ہوئی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا تجربہ اور اس کی قیافہ شناسی کہہ رہی تھی کہ وہ ایک پُرامن شہری زندگی گزارنے والا جوان ہے۔ اس میں کوئی چھوٹا سا جرم کرنے کی بھی صلاحیت نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ معصومیت سے زندگی گزارنے والے بھی بعض اوقات جذباتی لمحات میں مشتعل ہو کر کسی سنگین جرم کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔

آئندہ تفتیش اور تحقیق کے دوران میں حقیقت کھلتی رہے گی۔ تھوڑی دیر بعد اس کا ماتحت ایک ماڈرن اور اسمارٹ لڑکی کے ساتھ آیا۔ اس سے بولا۔ "سر! یہی روبی دلشاد ہے۔"

اس نے کہا۔ "بیٹھو! تم نے کل رات امیر احمد سے فون پر گفتگو کی تھی۔ اس سے تمہارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟"

"ابھی آپ کے آدمی نے یہ افسوس ناک خبر سنائی ہے کہ امیر احمد کو قتل کر دیا گیا ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ میرا دل کتنا دکھ رہا ہے وہ عام نوجوانوں سے مختلف تھا۔ کسی سے فلرٹ نہیں کرتا تھا۔ میں اس کے دل میں جگہ بنانا چاہتی تھی۔ ہر رات اسے فون پر چھیڑتی رہتی تھی۔ میرا کل تک کا آخری تجربہ یہی ہے کہ وہ لڑکیوں کے حُسن سے اور ان کی اداؤں سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔ میں اس کا دل جیتنے میں ناکام رہی تھی۔ اس نوجوان کی موت پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ بائی دا وے آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟"

"تم اس کے دوستوں کے بارے میں کیا جانتی ہو؟"

"شاید اس کا کوئی خاص دوست نہیں تھا۔ وہ تعلیم حاصل کرنے میں اور باپ کے کاروبار میں اس قدر مصروف رہتا تھا کہ اسے کسی سے دوستی کرنے کی یا کسی لڑکی سے محبت کرنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ اسے کس نے قتل کیا ہو گا؟ قاتل جو بھی ہے اس کا دشمن ضرور ہو گا۔ کیا اس نے کسی کو دشمن بنا لیا تھا؟"

"میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی ہوں۔ ہو سکتا ہے کاروباری معاملات میں کوئی اس کا دشمن بن گیا ہو۔"

وہ روبی کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس لڑکی سے اہم معلومات حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس نے چند اور سوالات کئے پھر اسے جانے کی اجازت دے دی۔

دن کے گیارہ بجے رئیس احمد کے وکیل نے کورٹ سے حاصل کیا ہوا ضمانت نامہ پیش کیا۔ سرفراز نے عمران کو اس تاکید کے ساتھ رہا کیا کہ وہ یہ شہر چھوڑ کر نہیں جائے گا۔

دوپہر کو ظہر کی نماز کے بعد امیر احمد کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ رئیس کی کوٹھی تعزیت کرنے والے رشتے داروں اور کاروبار سے تعلق رکھنے والے اہم افراد سے بھری ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک رشتے دار ایسا تھا جو امیر احمد کی ہلاکت پر دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ کبھی سینہ پیٹ رہا تھا۔ کبھی دیواروں سے سر ٹکرا رہا تھا۔ لوگوں نے اسے پکڑ کر قابو میں کیا تھا۔ اسے سمجھا رہے تھے کہ اپنے عزیزوں کی موت پر اتنی شدت سے نہیں رونا

چاہئے۔ صبر کرنا چاہئے۔

اس رشتے دار کا نام یار محمد تھا۔ وہ بہت دور کے رشتے سے بیگم بانو کا کزن لگتا تھا۔ اس کے چچا کا بیٹا تھا۔ بیگم بانو کی ایک مل میں سپروائزر تھا۔ شہلا' امیر احمد اور سدرہ کے لئے کبھی کبھی قیمتی تحفے لایا کرتا تھا۔ وہ تینوں بچپن ہی سے یار محمد کی محبت اور اپنائیت کو دیکھتے آئے تھے۔ اسے اب بھی بہت چاہتے تھے۔

بیگم بانو بھی اس کی آمد پر خوش ہوتی تھیں۔ اس کی خاطر مدارات کرتی تھیں۔ وہ بچوں کے لئے تحفے لایا کرتا تھا۔ بیگم بانو بھی جواباً اسے قیمتی تحفے دیا کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ حساب برابر رہنا چاہئے۔

بیگم بانو کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ جوان بیٹے کی موت کا صدمہ کبھی کم نہیں ہو سکتا تھا لیکن اسے صبر کرنا تھا۔ اس نے یار محمد سے کہا۔ "آج میں بُری طرح لٹ گئی ہوں۔ پتا کرو کس نے ہمارے بیٹے سے دشمنی کی ہے۔ آخر وہ اسے قتل کرکے کیا حاصل کرنا چاہتا تھا اور جو وہ چاہتا تھا کیا وہ اسے مل چکا ہے۔"

یار محمد نے کہا۔ "تمہاری طرح میں بھی صدمے سے چُور ہوں لیکن میرے اندر یہی سوال شور مچا رہا ہے کہ کس بدبخت نے اسے قتل کیا ہے ایک بار اس کا پتا چل جائے میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"پتا چلانے سے پتا چلے گا کہ کس نے ہم سے دشمنی کی ہے۔ یہاں بیٹھے رہو گے تو صرف باتیں ہی بناتے رہو گے جاکر معلوم کرو کہ پولیس والے کیا کر رہے ہیں؟ پتا نہیں یہ رئیس احمد کہاں چلے گئے ہیں؟"

یار محمد نے کہا۔ "دس بجے ان کا وکیل۔ کورٹ سے کسی کا ضمانت نامہ لے کر آیا تھا۔ رئیس بھائی نے اس سے کہا کہ وہ سرفراز کے پاس جاکر ضمانت نامہ پیش کریں اور عمران نامی کسی جوان کو رہا کرائیں۔"

وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "تعجب ہے۔ یہاں اپنا بیٹا ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا ہے اور وہ دوسروں کی ضمانت کراتے پھر رہے ہیں۔ آخر وہ عمران کون ہے؟"

"یہ تو رئیس بھائی ہی بتا سکتے ہیں یا پھر اس انٹیلی جینس کے افسر سرفراز کو معلوم ہوگا۔ ویسے ہے کوئی اہم معاملہ۔ اس قدر صدمات سے ٹوٹنے کے باوجود کورٹ کے ذریعے کسی عمران کی ضمانت کرا رہے ہیں۔ بیٹے کی تدفین کے بعد قبرستان سے ہی سیدھا کہیں

چلے گئے تھے۔"

بیگم بانو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گھر میں ماتم ہو رہا ہے اور وہ نہ جانے کہاں دوڑتے بھاگتے پھر رہے ہیں۔ اس نے انٹیلی جینس کے دفتر میں فون کرکے کہا۔ "میں مسٹر سرفراز خان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ وہ میرے بیٹے کے مرڈر کیس کے انچارج ہیں۔"

اسے سرفراز کا موبائل فون نمبر بتایا گیا۔ اس نے موبائل پر رابطہ کیا۔ سرفراز پچھلی رات کا جاگا ہوا تھا۔ دوسرے دن بارہ بجے سونے کا موقع ملا تھا۔ موبائل فون کے بزر نے بار بار شور مچا کر اسے جگا دیا۔ اس نے اسے آن کرکے بیزاری سے پوچھا۔ "ہیلو کون ہے؟"

"میں بیگم رئیس احمد بول رہی ہوں۔ کیا آپ بہت مصروف ہیں؟"

"پچھلی رات سے میں آپ کے مقتول بیٹے کے سلسلے میں مصروف رہا ہوں۔ ابھی بارہ بجے میری آنکھ لگی تھی کہ آپ نے مجھے جگا دیا۔"

"مجھے افسوس ہے۔ میں نے نیند میں مداخلت کی ہے۔ آپ صرف ایک بات کا جواب دے دیں پھر میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کروں گی آج رئیس احمد نے کورٹ کے ذریعے کس نوجوان کو ضمانت پر رہا کرایا ہے؟"

"میڈم! اس نوجوان کا نام عمران احمد ہے اور وہ آپ کا سوتیلا بیٹا ہے۔ مقتول امیر احمد کا سوتیلا بھائی ہے۔"

وہ تقریباً چیخ کر بولی۔ "کیا؟ میرا سوتیلا بیٹا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میری کوئی سوکن بھی ہے؟"

"جی ہاں! مسٹر رئیس احمد نے آپ سے پہلے زرینہ نامی ایک خاتون سے شادی کی تھی۔ اس خاتون سے اس کا یہ بیٹا عمران ہے چونکہ وہ مقتول امیر احمد کا سوتیلا بھائی ہے۔ اس لئے میں نے شبہے میں اسے گرفتار کیا تھا۔"

"آپ نے ٹھیک کیا تھا۔"

"میڈم! قتل کی کوئی چھوٹی بڑی وجہ ہوتی ہے اور یہ سوتیلا پن' حسد' رقابت اور دولت کا لالچ ایسی وجوہات ہیں کہ شبہ کسی سوتیلے پر ہی ہوتا ہے۔"

"میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ میرے بیٹے کا قاتل مل گیا ہے۔ میں دیکھوں گی کہ رئیس میاں اسے کس طرح سزا سے بچائیں گے۔"

اس نے فون بند کر دیا پھر دوبارہ اسے آن کر کے رئیس احمد سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے ان کی آواز سن کر پوچھا۔ "آپ کہاں ہیں؟ بیٹے کے سلسلے میں تعزیت کے لئے دنیا جہان کے لوگ آئے ہوئے ہیں اور آپ کہیں اور بھاگتے پھر رہے ہیں۔"

"بیگم! بیٹے کی ہلاکت کا جو صدمہ مجھے اور تمہیں ہے وہ کسی اور کو نہیں ہوگا۔ رشتے دار اور دوست احباب رسمی طور پر تعزیت کے لئے آتے ہیں۔ اس یار محمد کی طرح مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہیں۔ مجھے ایسے لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"دوسروں کو جانے دیں۔ ایسے وقت آپ کو میرے پاس ہونا چاہئے۔"

"مجھ سے تمہارا دکھ بھی دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ آج ہماری مل فیکٹریاں اور تمام دفاتر بند ہیں لیکن میں یہاں اپنے دفتر میں آکر تنہا وقت گزار رہا ہوں۔"

"آپ وہیں دفتر میں رہیں۔ میں آرہی ہوں۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کو کہا۔ رشتے داروں سے معذرت چاہی کہ وہ ایک ضروری کام سے جا رہی ہے۔ جلد ہی واپس آنے کی کوشش کریں گی۔

وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر دفتر.......... پہنچ گئی۔ وہاں چپڑاسی اور چوکیداروں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ چپڑاسی نے اسے رئیس احمد کے دفتری کمرے میں پہنچایا۔ اس نے اندر آکر دروازے کو بند کرتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کو میرے بیٹے کی موت کا صدمہ ہے یا اپنے بیٹے کی سلامتی کی فکر ہے؟ دوسرے بیٹے کے گلے میں پھانسی کا پھندا نظر آرہا ہوگا۔ اسے بچانے کی تدبیریں سوچ رہے ہوں گے۔"

رئیس احمد حیرانی اور پریشانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوگیا تھا کہ اسے زرینہ اور عمران کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے۔ وہ یہاں لڑنے آئی ہے۔

اس نے کہا۔ "لڑنے جھگڑنے آئی ہو تو میں پہلے سے تیار بیٹھا ہوں۔ تمہیں سمجھاتا ہوں' جاہل عورتوں کی طرح تماشا نہ کرنا۔ تمہارے سامنے دو راستے ہیں ایک تو یہ کہ سہولت سے باتیں کرو۔ میرے ساتھ رہنے کا سمجھوتا کرو یا پھر علیحدگی اختیار کر لو اور پھر میرے خلاف قانونی کارروائیاں کرو۔"

وہ میز پر گھونسا مارتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارے ساتھ رہنا تو کیا تم پر تھوکنا بھی پسند نہیں کروں گی۔"

"اور میں تمہیں جوتے مارنا بھی پسند نہیں کروں گا اگر تم مہذب انداز میں گفتگو نہیں کرو گی تو میں بھی جواباً جاہلوں والا انداز اختیار کروں گا۔"

وہ غصے سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "میرے ڈیڈی نے وصیت میں لکھا تھا کہ تم مجھ پر سوکن لاؤ گے تو میں تم سے طلاق لے سکوں گی۔"

"میں تم پر سوکن نہیں لایا ہوں۔ تم عدالت میں یہ ثابت نہیں کر سکو گی کیونکہ تم میری پہلی بیوی پر سوکن بن کر آئی ہو۔"

"میں اپنے وکیل سے پوچھوں گی کہ تمہارا یہ نکتہ کہاں تک درست ہے۔"

"اپنی جوان بیٹیوں سے یہ بھی پوچھ لینا کہ وہ تمہیں طلاق لینے اور ان کے باپ کو چھوڑنے کی اجازت دیں گی؟ ان میں سے سدرہ تو میری اپنی بیٹی ہے۔ وہ تو میرے ساتھ رہے گی۔"

"میں اپنا ایک بچہ بھی تمہیں نہیں دوں گی۔ تم میرے ہی نہیں میرے بچوں کے بھی دشمن ہو۔ تم نے اپنے بیٹے عمران کے ذریعے میرے بیٹے امیر احمد کو قتل کرایا ہے۔ تم قاتل ہو۔"

"تمہاری اس بکواس پر دنیا ہنسے گی۔ امیر احمد بھی سدرہ کی طرح میرا اپنا خون تھا۔ تم اسے شہلا کی طرح کہیں باہر سے نہیں لائی تھیں۔"

"میں ثابت کروں گی کہ تمہارے بیٹے عمران نے میرے بیٹے امیر احمد کا خون کیا ہے۔ وہ ایک ہی خون سے پیدا ہوئے ہیں مگر سوتیلے ہیں اور سوتیلے نے کیوں میرے بیٹے کو قتل کیا اس کی بہت ساری وجوہات سامنے آجائیں گی۔"

"میں اپنا ایک جوان بیٹا کھو چکا ہوں۔ دوسرے کو بھی کھونا نہیں چاہوں گا۔ جی جان کی بازی لگا کر بھی اسے جھوٹے الزامات سے بچاؤں گا۔"

"یہ تو آنے والا وقت بتائے گا کہ میں تم سے اور تمہارے بیٹے سے کس طرح انتقام لوں گی۔ ابھی تو یہ فیصلہ کر کے آئی ہوں کہ تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی۔ تم اپنا ضروری سامان لے کر اس کوٹھی سے چلے جاؤ۔"

"جب تک میاں بیوی کا رشتہ رہے گا' وہ کوٹھی میری ہی ہوگی۔ طلاق کے بعد وہاں سے جاؤں گا تو سدرہ کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

"مجھے غصہ نہ دلاؤ۔ میری بیٹی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔"

"خواہ مخواہ غصہ دکھا رہی ہو۔ اول تو تم مجھ سے طلاق نہیں لے سکو گی یہ ثابت نہیں کر سکو گی کہ میں تم پر سوکن لایا ہوں۔ میں ثابت کر دوں گا کہ تم میری پہلی بیوی پر سوکن بن کر آئی تھیں۔ کسی معقول جواز کے بغیر طلاق لو گی تو باپ کی وصیت کے مطابق بہت بڑی دولت اور جائیداد سے محروم ہو جاؤ گی۔ اپنی منحوس صورت لے کر یہاں سے جاؤ اور سوچتی رہو کہ میرے خلاف کیا کر سکو گی۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اسے اسی بات کا اندیشہ تھا کہ بیگم بانو کو ایک سوکن اور سوتیلے بیٹے کا علم ہو گا تو وہ اس کے پیچھے پڑ جائے گی۔ ان سے عداوت کی انتہا کر دے گی اور اب واقعی انتہا کرنے کی کوشش کرنے والی تھی۔ وہ عمران کو پھانسی کے تختے تک پہنچانے کے لئے اپنی تمام دولت پانی کی طرح بہا سکتی تھی۔

ویسے عمران پر محض سوتیلا ہونے کی وجہ سے صرف شبہ کیا جا سکتا تھا۔ اس کے خلاف کوئی چشم دید گواہ نہ تھا اور اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت بھی نہیں تھے۔ ایک باپ پر یہ بہت ہی کڑا وقت تھا۔ وہ ایک بیٹے کی زندگی ہارنے کے بعد دوسرے کو کسی صورت میں ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہی ایک بات آ رہی تھی کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ کچھ ایسا کرنا ہو گا۔ جس سے بیٹے پر کیا جانے والا شبہ کمزور پڑتا جائے۔

اس عالی شان کوٹھی میں تعزیت کرنے والوں کی بھیڑ اب بھی لگی ہوئی تھی۔ جبکہ بہت سی عورتیں اور مرد جا چکے تھے۔ شہلا کا منگیتر اسد باغیچے میں بیٹھا ہوا تھا۔ شہلا بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اسد نے کہا۔ "تمہیں مہمانوں کے درمیان رہنا چاہئے۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "یہ سارے بن بلائے مہمان ہیں جو ہمارے سچے ہمدرد تھے' وہ صبح آئے تھے۔ بھائی کی موت پر صبر کی تلقین کی تھی۔ اس کے لئے دعائیں مانگی تھیں پھر چلے گئے تھے۔ یہ جو باقی رہ گئے تھے' رسمی طور پر تعزیت کے لئے آئے ہیں۔ رات کا کھانا کھائے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ کچھ تو رات بھر یہاں گزارنا چاہیں گے مگر ہم انہیں لفٹ نہیں دیں گے۔ شادی کی تقریب ہو یا ماتم ہو رہا ہو یہ رشتے دار بلائے جان بن جاتے ہیں۔"

اسد نے کہا۔ "تم' تمہاری ممی اور ڈیڈی ان سب سے کترا رہے ہیں۔ ان سے باتیں بھی نہیں کر رہے ہیں۔ پتا نہیں تمہارے وہ بزرگ کہاں گئے ہوئے ہیں؟"

"اچھا ہے ممی اور ڈیڈی سے انہیں لفٹ نہیں ملے گی تو یہ لوگ خود ہی چلے جائیں گے۔"

"تمہارے ڈیڈی شاید سرفراز خان کے پاس گئے ہیں۔ میں اس قتل کے سلسلے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کچھ نہ کہو۔ خاموش رہو۔ صبح سے یہی باتیں سن سن کر میرا سر دُکھنے لگا ہے۔ کوئی دوسری بات کرو۔"

سدرہ بھی رشتے داروں سے پریشان ہو کر اپنے بنگلے میں آ گئی تھی۔ دو چار خواتین وہاں آنا چاہتی تھیں۔ انہیں سختی سے منع کر دیا۔ "پلیز یہاں کوئی نہ آئے۔ میں تنہائی چاہتی ہوں۔"

وہ خواتین وہاں سے چلی گئیں۔ خرم نے دروازے پر آ کر پوچھا۔ "کیا مجھے بھی اجازت نہیں ہے؟"

وہ خرم کو دیکھ کر کھل اٹھتی تھی۔ بے اختیار مسکرانے لگتی تھی لیکن اس وقت بہت بڑا صدمہ تھا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے مگر محبت سے اسے دیکھا پھر کہا۔ "آ جاؤ۔"

وہ ایک ہی صوفے پر اس کے بالکل قریب آ کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔ "جتنا سوچو گی' بھائی کی محبت اتنا ہی صدمہ پہنچائے گی۔ اپنا دھیان بٹاؤ۔ دوسری باتیں کرو۔"

"میں کیا باتیں کروں۔ بھائی کے ساتھ جیسے ساری خوشیاں چلی گئی ہیں۔ جینے کے لئے کچھ نہیں رہا ہے۔ تمہیں دیکھتی ہوں تو ایک سہارا ملتا ہے۔ تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کا ایک حوصلہ ملتا ہے۔"

"تمہیں مجھ سے جینے کا حوصلہ ملتا ہے تو میں اپنے آپ پر فخر کرتا ہوں۔ تمہاری جیسی دولت مند لڑکی دولت کا سہارا نہیں میری محبت کا سہارا چاہتی ہے۔"

"تم بہت دولت مند ہو۔ تمہارے پاس محبت کا خزانہ ہے۔ جسے مجھ پر لٹاتے رہتے ہو۔ مجھے ایسی مسرتیں دیتے ہو جو دولت کبھی نہیں دے سکتی۔"

"تمہاری ایسی ہی باتیں مجھے تنہائیوں میں یاد آتی رہتی ہیں۔ ایسے وقت تقدیر مجھ پر ہنستی ہے اور پوچھتی ہے کیا مجھ جیسا غریب تمہیں کبھی پا سکے گا۔ میں گریجویٹ ہوں مگر بے روزگار ہوں۔ تم نے اپنے ڈیڈی سے کہا تھا کہ وہ مجھے اپنے ہیڈ آفس میں منیجر یا اسسٹنٹ منیجر کی ملازمت دے دیں۔ وہ کئی مہینوں سے ٹال رہے ہیں۔"

"ہیڈ آفس میں تمہارے لئے کوئی بڑی ملازمت نہیں نکل رہی ہے۔ ذرا صبر کرو۔ تمہیں ملازمت مل جائے گی۔"

"نہ ملے تب بھی گزارہ کر رہا ہوں۔ میں تو سوچتا ہوں کہ جب تمہارے ڈیڈی مجھے ملازمت نہیں دے رہے ہیں تو تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں کیسے دے دیں گے؟"

"ایسی باتیں نہ سوچا کرو۔ میں ممی اور ڈیڈی کو راضی کرلوں گی۔"

ایسے وقت دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ بیگم بانو آئی تھی۔ ماں کو دیکھتے ہی سدرہ اور خرم فوراً ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بیگم بانو نے گھور کر خرم کو دیکھا پھر سدرہ سے کہا۔ "کیا تم نے ساری شرم وحیا بیچ دی ہے؟"

وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ممی؟"

"دنیا جہاں کے رشتے دار یہاں آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے یہاں آکر دیکھا تو تمہارے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟ یہی کہ بھائی مرتا ہے تو مرے یار تو اپنے پہلو میں ہے۔"

"پلیز ممی! آپ ایک اچھی بات کو غلط انداز میں کہہ رہی ہیں۔ خرم تم جاؤ۔ میں بعد میں تم سے ملوں گی۔"

وہ سر جھکا کر بیگم بانو کے سامنے سے گزرتا ہوا چلا گیا۔ سدرہ نے اس کے جانے کے بعد کہا۔ "خرم کو دیکھ کر آپ کے تیور کیوں بدل جاتے ہیں۔ آپ اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا کرتی ہیں۔ اس طرح آپ خرم کی نہیں میری بے عزتی کرتی ہیں۔ کیا ابھی سخت لہجے میں بولنا ضروری تھا؟"

"مجھے نہ سمجھاؤ کہ کس لہجے میں بولنا چاہئے۔ تمہارے ڈیڈی کو بھی تمہارا اس سے ملنا پسند نہیں ہے۔ تمہارے جیسی ہیرے جواہرات پسند کرنے والی لڑکیاں دور سے چمکنے والے پتھر کو پسند نہیں کرتیں۔ وہ تمہاری لائف نہیں بنائے گا۔ بگاڑ دے گا۔"

"آپ اور ڈیڈی اسے بگاڑ رہے ہیں۔ اسے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دے رہے ہیں اگر ہیڈ آفس میں اسے اس کے شایانِ شان ملازمت دی جاتی تو وہ اپنی صلاحیتوں کو منوا لیتا۔"

"تمہارا باپ قابل اور ہنرمند لوگوں کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ مجھ سے بحث نہ کرو۔ پتا ہے تمہارے باپ نے کیا کیا ہے۔ اس نے بھی ہمارے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔ اس نے

مجھ سے چھپ کر دوسری شادی کی تھی۔"

"اوہ نو ممی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ ڈیڈی ایسا نہیں کرسکتے۔"

"ایسا کر چکے ہیں۔ تمہاری ایک سوتیلی ماں اور ایک سوتیلا بھائی اس شہر میں ہیں اور اسی سوتیلے بھائی نے تمہارے سگے بھائی کو قتل کیا ہے۔"

سدرہ کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ وہ حیرانی اور بے یقینی سے ماں کو دیکھنے لگی۔ ماں نے کہا۔ "تمہیں میری بات کا یقین نہیں آئے گا۔ تمہارا باپ منہ چھپا کر دفتر میں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ باپ نہیں ہے، آستین کا سانپ ہے۔ وہ اپنے بیٹے کے ذریعے ہم سب کو قتل کرائے گا کیونکہ ہم سوتیلے ہیں۔"

"بس کریں ممی! ڈیڈی ہمارے لئے جان دیتے ہیں۔ پتا نہیں انہوں نے کیوں دوسری شادی کی تھی؟ پھر بھی میرا دل کہتا ہے ڈیڈی ہمارا برا کبھی نہیں چاہیں گے۔"

"تمہارے جیسی بیٹیاں باپ ہی کے گن گاتی رہتی ہیں۔ ماں تو جیسے کچھ ہوتی ہی نہیں ہے، لیکن میں اپنے جوان بیٹے کا خون معاف نہیں کروں گی اس کے بیٹے کو پھانسی پر لٹکا کر ہی رہوں گی۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔ سدرہ صوفے پر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ کیا واقعی ڈیڈی نے دوسری شادی کی تھی؟ میری ایک ماں اور ایک سوتیلا بھائی ہے، کیا اس سوتیلے نے میرے سگے بھائی کو قتل کیا ہے؟ ہماری دنیا میں ایسا ہوتا ہے۔ سوتیلوں کے درمیان جان لیوا دشمنی ہوتی رہتی ہے مگر مجھے یقین نہیں آرہا کہ ایسا میرے گھر میں ہو رہا ہے۔

فون کی گھنٹی بجنے لگی= اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے خرم کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو میں بول رہا ہوں۔"

وہ بولی۔ "سو سوری خرم! میں امی کی طرف سے معافی چاہتی ہوں۔ تمہارے ساتھ ان کا رویہ نامناسب تھا۔"

"میں ایسے رویے کے لئے ذہنی طور پر تیار رہتا ہوں۔ یہ اچھی طرح جانتا ہوں۔ کہ تمہارے بزرگ مجھے پسند نہیں کرتے ہیں۔"

"تم یہ بات مجھ پر چھوڑ دو۔ میں ایک دن انہیں منالوں گی۔"

"تم کتنوں کو مناؤ گی؟ تمہارے ایک اور بزرگ ہیں۔ میں کوٹھی سے باہر جا رہا تھا۔ ان صاحب نے مجھے روک کر نصیحت فرمائی ہے کہ مجھے اپنی اوقات دیکھنی چاہئے۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

"میں ان صاحب کو اچھی طرح نہیں جانتا ہوں۔ وہ آج صبح یہاں آتے ہی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر تمہارے بھائی کے لئے ماتم کر رہے تھے۔ لوگ آپس میں کہہ رہے تھے کہ وہ تمہارے قریبی رشتے داروں میں سے ہیں۔"

"اچھا سمجھ گئی۔ وہ ہمارے انکل یار محمد ہیں۔ وہ ہمیں اپنی سگی اولاد کی طرح چاہتے ہیں۔ ذرا جذباتی قسم کے بزرگ ہیں۔ تم ان کی بات کا برا نہ مانو۔ میں انہیں ایک بار سمجھا دوں گی تو پھر وہ میری طرح تم سے بھی محبت کرنے لگیں گے۔"

اس کے موبائل سے بزر سنائی دینے لگا۔ وہ بولی۔ "میں دوسرا فون اٹینڈ کر رہی ہوں۔ تم سے پھر کسی وقت رابطہ کروں گی۔"

اس نے ریسیور رکھ کر اپنے موبائل فون کو اٹھایا۔ اسی وقت بزر کی آواز ختم ہو گئی۔ اس نے اسے آن کر کے ہیلو ہیلو کہا مگر دوسری طرف خاموشی رہی۔ اس نے فون بند کر دیا۔

شہلا' اسد کے ساتھ وہاں آئی۔ اس نے کہا۔ "تمہیں کچھ پتا ہے۔ ڈیڈی نے دوسری شادی کی تھی اور وہ اب تک ہم سے چھپاتے رہے۔"

"ہاں ابھی امی نے مجھے بتایا ہے۔ ہماری ایک سوتیلی ماں اور ایک سوتیلا بھائی بھی ہے۔"

شہلا نے حقارت سے کہا۔ "انہیں ماں اور بھائی نہ کہو۔ ہمارے بھائی کے قتل کی وجہ اچھی طرح معلوم ہو رہی ہے۔ مجھے ڈیڈی سے ایسی توقع نہیں تھی۔"

سدرہ نے معصومیت سے پوچھا۔ "ڈیڈی نے کیا کیا ہے؟ اگر انہوں نے ایک سوتیلا بھائی پیدا کیا ہے تو اسے یہ نہیں کہیں گے کہ وہ ان کے سگے بیٹے کو قتل کر دے۔"

شہلا نے کہا۔ "ڈیڈی نے سوتیلے کو پیدا تو کیا ہے اگر اسے پیدا نہ کرتے تو ہمارا بھائی ابھی زندہ رہتا۔ ہم سے ہنستا بولتا رہتا۔"

"اگر کوئی قتل کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ماں باپ نے کسی کو قتل کرانے کے لئے اسے پیدا کیا تھا۔ پلیز شہلا! وہ ہمارے ڈیڈی ہیں ان کے بارے میں ایسی رائے قائم نہ کرو۔"

اس نے کہا۔ "ایسی رائے قائم نہ کی جائے تب بھی یہ حقیقت اپنی جگہ رہے گی کہ

اس سوتیلے بدمعاش نے امیر احمد کو قتل کیا ہے۔"

"میں اس بات سے انکار نہیں کروں گی۔ وہ سوتیلا ہی ہمارا دشمن ہو سکتا ہے۔ اب سے پہلے کسی نے ہم سے دشمنی نہیں کی تھی۔"

وہ گہری سنجیدگی سے سوچنے لگی۔ شہلا نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ہم بڑے بڑے حالات سے دوچار ہو رہے ہیں۔ بھائی کی موت کے بعد یہ دوسری دل توڑنے والی خبر ملی ہے کہ ہمارے سوتیلے بھی ہیں اور وہ ہمارے بدترین دشمن ہیں۔ تم یہاں تنہا کیوں ہو؟ تنہائی میں دل اور گھبراتا ہے پریشانی اور بڑھ جاتی ہے۔"

"میں تنہا نہیں تھی۔ خرم میرے ساتھ تھا مگر ممی کا رویہ ایسا تھا کہ اسے یہاں سے جانا پڑا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اسد بھائی تمہارے ساتھ رہتے ہیں۔ ممی اعتراض نہیں کرتی ہیں مگر خرم کو میرے ساتھ دیکھ کر بھڑک جاتی ہیں۔ ڈیڈی بھی تو اسے پسند نہیں کرتے ہیں۔ ممی ڈیڈی کو میری خوشیاں اچھی کیوں نہیں لگتیں؟"

"سمجھا کرو۔ محبت اور رشتے داری اپنے برابر والوں میں ہوا کرتی ہے۔ اسد کا تعلق ہماری سوسائٹی سے ہے۔اس لئے بزرگ ہم پر اعتراض نہیں کرتے ہیں۔ اب یہ تمہارے دل کی نادانی ہے کہ وہ خرم کو دیکھ کر دھڑکنے لگتا ہے۔ میں نے تمہیں سمجھایا ہے فکر نہ کرو۔ ہم سب مل کر ممی اور ڈیڈی کو سمجھائیں گے۔ میرا اور اسد کا ووٹ خرم کے ہاتھ میں ہے۔"

سدرہ نے بڑی محبت سے شہلا کو دیکھا پھر اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔

☆======☆======☆

رشتے داروں کی بھیڑ چھٹ گئی۔ تین دن گزر چکے تھے۔ ڈھیٹ بن کر رہنے والے رشتے دار بھی چلے گئے تھے۔ اتنی بڑی محل نما کوٹھی ویران نظر آنے لگی تھی۔ وہاں بیگم اور رئیس احمد تنہا رہتے تھے اور ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔ بیگم مجبور تھی۔ اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی لیکن باپ کی وصیت میں جکڑی ہوئی تھی۔

وصیت کے الفاظ یہ تھے کہ رئیس احمد' بیگم سے شادی کرنے کے بعد پھر دوسری شادی نہیں کرے گا۔ اگر کرے گا تو بیگم بانو اس سے طلاق لے کر کسی دوسرے سے شادی کر سکے گی لیکن اپنے اس محبوب سے شادی نہیں کر سکے گی۔ جس نے اسے شادی سے پہلے اپنے بچے کی ماں بنا دیا تھا۔

اور اس کا وہ محبوب وہی یار محمد تھا۔ جو دور کے رشتے سے اس کا کزن لگتا تھا۔ بیگم بانو کا باپ جلال الدین اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ صاف طور سے کہتا تھا کہ یار محمد اور اس کے ماں باپ بہت لالچی اور خودغرض ہیں۔ یار محمد کا باپ جیل میں سزا کاٹ کر آیا تھا۔ ایک کوٹھی میں ڈاکہ ڈالتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ خاندان کے سب ہی رشتے دار ان سے دور کی سلام دعا بھی نہیں رکھتے تھے۔ ان حالات میں جلال الدین اپنی بیٹی کا رشتہ کبھی یار محمد سے نہیں کر سکتا تھا۔

اسی لئے وصیت میں بھی سختی سے یہ پابندی عائد کی تھی کہ وہ کبھی رئیس سے طلاق لینے کے بعد بھی یار محمد سے شادی نہیں کرے گی اور نہ کوئی تعلق رکھے گی اگر ایسا کرے گی تو تمام دولت و جائیداد سے محروم ہو جائے گی۔ صرف گزارے کے لئے اسے مخصوص رقم ملتی رہے گی۔

وہ وصیت ایسی تھی کہ بیگم بانو کبھی یار محمد سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے سوچ رہی تھی کہ رئیس احمد سے طلاق لینے کے بعد کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یار محمد نہیں ملے گا تو پھر وہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔ پھر طلاق لینا بھی آسان نہیں ہوگا۔ وصیت کے یہ الفاظ تھے کہ رئیس احمد بیگم بانو سے شادی کرنے کے بعد دوسری شادی نہیں کرے گا اور واقعی اس نے بیگم سے شادی کرنے کے بعد کسی سے شادی نہیں کی تھی۔ اس نے شادی سے پہلے زرینہ کو شریکِ حیات بنایا تھا۔

جب یہ بات عدالت تک پہنچتی تو رئیس احمد کہہ سکتا تھا کہ وصیت لکھنے والا جلال الدین اس کی پہلی شادی کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ بیگم بانو کے باپ جلال الدین کو اس کی پہلی شادی پر اعتراض نہیں تھا کیونکہ وہ اس کی بیٹی کی سوکن نہیں تھی بلکہ بیٹی اس پر سوکن بن کر گئی تھی لیکن جلال الدین نے آئندہ کے لئے رئیس احمد پر پابندی عائد کی کہ وہ بیگم بانو سے شادی کرنے کے بعد پھر کسی اور سے شادی نہیں کرے گا۔

بیگم اس بات کو اچھی طرح سمجھتی تھی کہ رئیس کا وکیل اس کے باپ کی وصیت کے ایک ایک لفظ کی کمزوری سے کھیلے گا اور یہ ثابت کردے گا کہ رئیس احمد کی پہلی شادی سے جلال الدین باخبر تھا۔ اس نے اپنی بیٹی سے شادی کرنے کے بعد مزید شادی کرنے پر پابندی عائد کی تھی۔ بیگم اس سے طلاق حاصل کرنے کے لئے ان قانونی بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ اب اس کا مسئلہ طلاق اور رئیس احمد سے علیحدگی نہیں تھا۔ اب

اس کی تمام توجہ سوتیلوں پر مرکوز ہوگئی تھی۔

وہ سرفراز خان سے ملتی رہتی تھی۔ اپنے وکیل سے مشورہ کرتی رہتی تھی۔ وہ دونوں اسے یقین دلاتے رہتے تھے کہ وہ سوتیلا عمران احمد ضرور قانون کے شکنجے میں آئے گا۔ بیگم بانو کو کچھ ایسی ٹھوس دستاویزات حاصل کرنا چاہئے جس سے یہ ثابت ہو کہ عمران احمد جو لاکھوں کا کاروبار کر رہا ہے اور جو لاکھوں کی کوٹھی میں رہتا ہے اور کاروں میں گھومتا ہے۔ اسے یہ ساری دولت اپنے باپ رئیس احمد سے ملی ہے اور رئیس احمد اپنی بیوی بیگم بانو کو دھوکا دے کر اس کے کاروبار سے لاکھوں اور کروڑوں روپے کا گھپلا کرتا رہتا ہے اور یہ بڑی بڑی رقمیں عمران کو اور اس کی ماں کو دیتا رہتا ہے۔

سرفراز خان اس سلسلے میں تحقیقات کر رہا تھا۔ زرینہ کی جائیداد کے کاغذات اور بینک بیلنس دیکھ رہا تھا۔ اس کی تمام دستاویزات سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ زرینہ بھی ایک دولت مند باپ کی بیٹی ہے اس کے پاس جو بھی لاکھوں اور کروڑوں کی جائیداد ہے۔ وہ سب اپنے میکے سے لائی ہے اور اس کا بیٹا عمران احمد بہت اچھا کاروبار کر رہا ہے اور لاکھوں روپے کما رہا ہے۔

قاتل کو تلاش کیا جارہا تھا اور جو سامنے تھا' اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں مل رہا تھا۔ سرفراز نے بیگم بانو سے کہا۔ "وہ ماں بیٹے بہت چالاک ہیں۔ انہوں نے پہلے ہی سے اپنی پوزیشن مضبوط رکھی ہے۔ زرینہ بیگم کے پاس رئیس احمد کے کچھ ایسے خطوط ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ زرینہ اپنے شوہر کی دوسری شادی سے سخت ناراض ہے اس نے رئیس احمد سے طلاق نہیں لی ہے لیکن اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتی ہے۔"

بیگم بانو نے پوچھا۔ "اگر کوئی تعلق نہیں رکھتی ہے تو فیصل آباد چھوڑ کر یہاں کیوں آئی ہے؟"

"رئیس احمد کے دوسرے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے عمران کو باپ سے ملنے سے نہیں روکتی ہے لیکن بیٹے کو باپ سے مالی امداد لینے سے روکتی ہے۔ ان تمام خطوط کے ذریعے آپ کی سوکن زرینہ بیگم کی خودداری اور اصول پسندی ثابت ہوتی ہے۔"

"وہ بہت مکار ہے اور رئیس احمد بیٹے کا شاندار مستقبل بنانے کے لئے اس مکار عورت کا ساتھ دے رہی ہے۔ اس طرح تو میں کبھی ثابت نہیں کر سکوں گی کہ وہ مجھ سے

فراڈ کر رہے ہیں اور میرے کاروبار سے حاصل کی ہوئی رقمیں انہیں دیتے رہتے ہیں۔"

"آپ کا کاروبار یہاں سے یورپ تک اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ آپ فراڈ ثابت نہیں کر سکیں گی پھر آپ کاروبار کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہیں۔ آپ کے مقابلے میں رئیس احمد حساب کتاب کے ماہر ہیں۔"

بیگم نے کہا۔ "میں مایوس نہیں ہوں۔ ہم ان پر کڑی نظر رکھیں گے تو ہمیں ان کی کوئی نہ کوئی غلطی اور کمزوری ضرور ملے گی۔ مجھے تو یہ سوچ کر غصہ آرہا ہے کہ یہ شخص میرا شوہر بن کر میرے پورے کاروبار کا مالک بن بیٹھا ہے۔ جب کاروبار کے ذریعے دشمنی کر رہا ہے تو پھر اولاد کے ذریعے بھی کر رہا ہے۔ اسی نے ایک بیٹے کے ہاتھوں سے دوسرے بیٹے کو قتل کرایا ہے۔"

"نہیں میڈم! یہ بالکل ہی مضحکہ خیز بات ہے۔ میں نے اس سلسلے میں پوری تحقیق کی ہے۔ کتنے ہی اس بات کے چشم دید گواہ ہیں' آپ کی بیٹیاں بھی یہی بیان دیتی ہیں کہ رئیس احمد اپنے بیٹے امیر احمد کو دل و جان سے چاہتے رہے ہیں۔ اگر وہ کبھی بیمار ہوتا تھا تو گھر میں ڈاکٹروں کی فوج بلالیا کرتے تھے۔ راتوں کو اس کے سرہانے بیٹھ کر اس وقت تک جاگتے رہتے تھے جب تک بیٹا آرام سے سو نہیں جاتا تھا۔ میں اپنی تفتیش کے نتیجے میں یہی کہتا ہوں کہ دو بیٹے باپ کی دو آنکھیں ہوتے ہیں۔ کوئی باپ کبھی اپنی ایک آنکھ نہیں پھوڑتا۔ آپ کو رئیس احمد سے عداوت ہے۔ اس عداوت کی وجہ سے آپ قتل کے الزام میں رئیس احمد کو بھی ملوث کریں گی تو یہ کیس صرف مضحکہ خیز نہیں ہو گا بلکہ کمزور بھی پڑ جائے گا۔"

"کیا میں اس دشمن شوہر سے عداوت نہ کروں۔ دوستی کر لوں؟"

"آپ دوستی نہ کریں لیکن عداوت بھی نہ کریں۔ اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ ماں باپ بیٹے بیٹیاں پیدا کرتے ہیں لیکن ان سے یہ کبھی نہیں کہتے کہ تم قاتل بن جاؤ اور بیٹیوں سے یہ نہیں کہتے کہ تم بے حیا اور بازاری بن جاؤ۔ یہ عمران کا اپنا سوتیلا پن ہے۔ اس کے حاسدانہ جذبات ہیں۔ اگر اس نے امیر احمد کو قتل کیا ہے تو رئیس احمد کی مرضی کے سراسر خلاف ہے۔ ایک باپ' ایک بیٹے کا زخم کھانے کے بعد دوسرے بیٹے کے جرم پر پردہ ڈالے گا۔ اسے سزائے موت پانے نہیں دے گا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہو گا کہ اسے اپنے مقتول بیٹے سے محبت نہیں تھی۔ میرا اندازہ ہے وہ بڑی کشمکش میں ہوں گے۔

امیر احمد سے بے انتہا محبت کرنے کے باوجود دوسرے بیٹے کو سزا سے بچانے کی کوششیں کرتے رہیں گے۔"

بیگم اس جاسوس سرفراز خان کی باتوں سے قائل ہو رہی تھی۔ وہ خود اس بات کی چشم دید گواہ تھی کہ رئیس احمد بچپن سے امیر احمد کو کلیجے سے لگاتا رہا ہے۔ وہ بے لوث محبت کرنے والا باپ ہے اور اس کی محبت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ کھوٹ صرف سوتیلوں میں ہے۔

وہ عالی شان کوٹھی اور اس کے آس پاس کے دونوں بنگلے اپنے مکینوں کی موجودگی کے باوجود ویران اور غیر آباد دکھائی دیتے تھے۔ امیر احمد کا بنگلا تو بالکل ہی ویران ہو گیا تھا۔ اسے مقفل کر دیا گیا تھا۔ دوسرے بنگلے میں شہلا اور سدرہ رہتی تھیں۔ بھائی کی ہلاکت کے بعد انہوں نے فی الحال گیٹ ٹوگیدر پارٹیز میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ رات کو کھانے کے بعد اپنے بیڈ روم میں چلی جاتی تھیں۔ فون کے ذریعے اپنے اپنے محبوب سے باتیں کرتی تھیں پھر سو جاتی تھیں۔ ایک رات فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سدرہ نے سرہانے کی طرف ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا پھر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو!"

اسے دوسری طرف سے دھیمی سی ہنسی سنائی دی۔ اگرچہ ہنسی بہت دھیمی تھی مگر اس میں درندگی چھپی ہوئی تھی۔ سدرہ نے اس ہنسی کو سنا پھر پوچھا۔ "کون ہے؟ خرم یہ تم ہو ناں؟ مجھے خواہ مخواہ ہنسانے کی کوششیں کرتے رہتے ہو۔ تمہارے اصرار پر میں ہنسنے بولنے لگی ہوں اب اس ہنسی کا کیا مطلب ہے؟"

دوسری طرف سے ہنستے ہوئے کہا گیا۔ "میں وائس چینجر سے بول رہا ہوں۔ اس آلے کے ذریعے مرد کی آواز عورت کی ہو جاتی ہے اور اگر عورت بولے تو پھر مرد کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں تم سے بول رہا ہوں یا میں تم سے بول رہی ہوں۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "تم کون ہو؟ یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"تمہارے بھائی نے بھی موت سے پہلے میری باتوں کو بکواس سمجھا تھا۔ کیا کیا جائے۔ انسان کو یقین ہی نہیں آتا کہ وہ کبھی مرے گا اور اگر مرے گا تو ابھی چند لمحوں میں اسے موت آئے گی۔"

سدرہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سنجیدگی سے سوچتے ہوئے بولی۔ "کیا تم نے ہی میرے بھائی کو قتل کیا تھا؟"

"ہاں! تمہیں یقین کرلینا چاہئے کہ اب تمہارے قتل کا الزام بھی مجھ پر آئے گا اور وہ تو آنا ہی ہے۔"

"مجھے موت کی دھمکی نہ دو۔ تمہارے اندر ذرا بھی مردانگی ہے تو صرف اتنا بتا دو' کیا وہی سوتیلے ہو؟"

"خوب سمجھ رہی ہو۔ تمہارے جتنے سگے ہیں وہ تو کبھی تم سے دشمنی نہیں کریں گے۔ سوتیلے ہی کرسکتے ہیں۔ بس اب میں فون بند کر رہا ہوں۔ میرا انتظار کرو۔"

سدرہ نے ریسیور کو کریڈل پر رکھ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں سے چلتے ہوئے الماری کے پاس آئی۔ اسے کھول کر اس کی ایک دراز سے پستول نکالنے لگی۔ ایسے ہی وقت ہلکا سا دھماکا ہوا۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ کھلے ہوئے دروازے پر ایک قد آور شخص کھڑا ہوا تھا۔ اس نے نائیلون کے موزے کو اپنے سر سے گردن تک پہن رکھا تھا۔ جس کے باعث اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا۔

ایسے وقت سدرہ نے بھی دراز سے پستول نکال لیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے نشانے پر آگئے تھے۔ وہ بولی۔ "دو طرف سے گولیاں چلیں گی۔ دونوں ہی مارے جائیں گے۔ میں موت سے نہیں ڈرتی۔ میرے لئے اس سے زیادہ فخر کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ میں اپنے بھائی کے قاتل کو مار کر مروں گی۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "چلو مجھے مارنے کی حسرت پوری کرلو۔ پہلی گولی تم چلاؤ۔ کم آن دیر نہ کرو۔"

وہ دیر کر رہی تھی۔ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی پھر بولی۔ "تم اپنی آواز اور لہجہ بدل کر بول رہے ہو۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں نے تمہیں بولتے ہوئے پہلے بھی کہیں سنا ہے۔"

"اس سے پہلے کہ تم مجھے پہچان لو۔ میں ہی پہلی گولی چلا کر تمہیں جہنم میں پہنچا دیتا ہوں۔"

اس نے ٹریگر کو دبا دیا۔ اس پر گولی چلائی۔ اس سے پہلے ہی وہ زمین پر گر پڑی۔ پھر اس نے بڑے سے بیڈ کی آڑ لیتے ہوئے اس کی طرف فائر کیا۔ ایک کے بعد دوسرا فائر کیا لیکن کھٹ کھٹ کی آواز ابھری۔ فائرنگ کی زور دار آواز نہیں گونجی۔

وہ دروازے سے اندر آتے ہوئے بولا۔ "تمہارا پستول اسی طرح خالی ہے جس

طرح تم ابھی زندگی سے خالی ہونے والی ہو۔"

وہ خالی پستول کی وجہ سے پریشان ہوگئی تھی۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ وہ پستول خالی کیسے ہوگیا۔ وہ زمین پر رینگتی ہوئی ایک طرف جانے لگی۔ وہ بیڈ کے دوسری طرف کھڑا ہوا کہہ رہا تھا۔ "فرش پر کیوں پڑی ہو۔ اٹھ جاؤ۔ شاید تمہیں خوف سے چیخنے چلّانے کی عادت نہیں ہے اگر عادت ہوتی تو تب بھی میں تمہیں موقع نہ دیتا۔ حلق پھاڑنے سے پہلے ہی گولی مار دیتا۔ چلو اٹھو مجھے ادھر آنے پر مجبور نہ کرو۔"

وہ اس کی باتوں کے دوران میں فرش پر رینگتی جارہی تھی۔ بیڈ کے ساتھ ہی باتھ روم کا دروازہ تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف پستول کھینچ کر مارا۔ اس نے ہنستے ہوئے اسے کیچ کرلیا۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ دوسرا حملہ بھی ہوسکتا ہے۔ اچانک ایک گلدان اس کے منہ پر آکر لگا۔ وہ بوکھلا کر ایک قدم پیچھے چلا گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر اس کا نشانہ لیتا' وہ پھرتی سے دروازہ کھول کر باتھ روم کے اندر آگئی۔ اندر سے چٹخنی لگادی۔ فوراً فرش پر بیٹھ گئی۔ ایسے وقت فائر کی آواز کے ساتھ ایک گولی دروازے میں سوراخ کرتی ہوئی گزر گئی۔ وہ دوڑتے ہوئے روشن دان کے پاس آئی' پھر حلق پھاڑ کر چیخنے لگی۔ "ہیلپ۔ ہیلپ۔ شہلا۔ ممی۔ ڈیڈی مجھے بچاؤ۔"

رات کے سناٹے میں دو بار فائرنگ کی آواز دور تک گونجتی ہوئی گئی تھی۔ پھر سدرہ کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ قاتل وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہوگیا۔ اس کے ممی' ڈیڈی اپنے ایک گن مین کے ساتھ دوڑتے ہوئے ادھر آئے تو انہوں نے شہلا کے بیڈ روم میں اسے بہت ہی بری حالت میں دیکھا۔ وہ اپنے بیڈ پر تھی لیکن اس کے دونوں ہاتھ پلنگ کے سرہانے والی پٹیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ ناک سے اور پیشانی سے لہو بہہ رہا تھا۔ اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا گیا تھا۔ بیگم اپنی بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر رونے اور سینہ پیٹنے لگی۔

ایسے وقت پھر سدرہ کی چیخیں سنائی دے گئیں۔

رئیس احمد نے اس کے بیڈ روم کی طرف دوڑتے ہوئے کہا۔ "تم شہلا کو دیکھو میں آرہا ہوں۔"

وہ دوڑتا ہوا اس بیڈ روم میں آیا پھر آواز دی۔ "سدرہ تم کہاں ہو؟"

"ڈیڈی میں باتھ روم میں ہوں۔ وہ قاتل میرے بیڈ روم میں ہے۔"

اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں بیٹی! یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں آگیا

ہوں۔ تمہیں ڈرنا نہیں چاہئے۔ دروازہ کھولو۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر آئی پھر ہر طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ "وہ یہاں آیا تھا۔ اس نے چہرے پر نائیلون کا نقاب چڑھا رکھا تھا۔ ڈیڈ وہ کہیں چھپا ہوگا۔"

"نہیں بیٹی! ہمارے ساتھ گن مین ہے۔ میرے پاس بھی ریوالور ہے۔ وہ آنے والا فرار ہوچکا ہے۔ شہلا کے پاس آؤ۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔"

وہ دونوں شہلا کے بیڈ روم کی طرف جانے لگے۔ بیگم نے دروازے کو اندر سے بند کر رکھا تھا۔ دستک دینے پر بولی۔ "انتظار کرو۔ وہ لباس بدل رہی ہے۔ ملازم سے کہو فرسٹ ایڈ باکس لے کر آئے۔"

رئیس احمد نے ملازم کو آواز دے کر فرسٹ ایڈ باکس لانے کو کہا پھر فون کے ذریعے سرفراز خان اور انٹیلی جینس کے اعلیٰ افسروں سے باتیں کرنے لگا۔ ابھی جو کچھ ہوچکا تھا۔ اس کی رُوداد سنانے لگا۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی پولیس اور انٹیلی جینس والے وہاں پہنچ گئے پھر وہی تفتیش کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

پہلے شہلا کا بیان لیا گیا۔ اس نے بتایا تھا کہ ایک نقاب پوش اچانک ہی اس کے بیڈ روم میں گھس آیا تھا۔ اس نے ریوالور دکھا کر اسے چیخنے سے منع کیا پھر اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔ اس کے ہاتھوں کو رسیوں سے باندھنے لگا۔ وہ احتجاج کرنے لگی تو اس نے ریوالور کے دستے سے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ پھر اس کی ناک پر ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ چکرا کر رہ گئی۔ وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں تھی۔ اپنے دونوں ہاتھ چھڑا نہیں سکتی تھی پھر وہ اس کے لباس کو پھاڑنے لگا۔

وہ آگے نہ بول سکی۔ منہ چھپا کر رونے لگی۔ بیگم نے کہا۔ "میری بیٹی کے ساتھ جیسی زیادتی کی ہے' اسے ہم کسی کے سامنے بیان نہیں کرسکیں گے۔ وہ سوتیلا قاتل بھی ہے۔ عیاش اور گناہگار بھی ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

رئیس احمد نے ڈانٹ کر کہا۔ "بکواس مت کرو۔ وہ سوتیلا ضرور ہے پھر بھی بھائی ہے۔ تم ایک بھائی اور بہن پر بے شرمی کا الزام لگا رہی ہو۔"

"آپ بکواس نہ کریں۔ وہ بدمعاش جانتا ہے کہ شہلا آپ کی بیٹی نہیں ہے۔ آپ کا خون نہیں ہے۔ وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کرسکتا تھا' اور بہت کچھ کر گیا ہے۔"

سدرہ اور سرفراز نے چونک کر پہلے بیگم کو اور پھر رئیس احمد کو دیکھا۔ سدرہ نے

کہا۔ "امی آپ ہوش میں تو ہیں۔ شہلا باجی کو کہہ رہی ہیں کہ وہ میرے ڈیڈی کا خون نہیں ہے۔"

بیگم کو ایک دم سے چپ لگ گئی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ غصے میں اور روانی میں اپنا بھید کھول رہی ہے۔ سب کے سامنے کہہ رہی ہے کہ شہلا اس کے اپنے شوہر رئیس احمد کی بیٹی نہیں ہے۔ گویا گناہ کی پیداوار ہے۔ خود کو گناہگار کہہ رہی ہے۔

رئیس احمد نے بات بناتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! تمہاری ماں غصے میں پاگل ہوجاتی ہیں۔ اچھا برا کچھ نہیں سوچتیں۔ جو منہ میں آتا ہے بکتی چلی جاتی ہیں۔"

سدرہ نے کہا۔ "ممی! ذرا ہوش میں رہا کریں۔ ایک تو دشمن نے شہلا پر ظلم کیا ہے اوپر سے آپ اسے ناجائز بیٹی کہہ رہی ہیں۔ دشمن سے زیادہ تو آپ بُرا سلوک کر رہی ہیں۔"

ان کی باتوں کے دوران میں سرفراز' بیگم بانو کو اور رئیس احمد کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ بیگم نے جوش میں اور روانی میں بے اختیار اپنے اندر کی بات کہہ دی ہے۔

بیگم نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ "مسٹر سرفراز! آپ اپنا کام کریں۔ کسی طرح اس سوتیلے کو پکڑ کر پھر حوالات میں بند کریں۔ میں اس کی ضمانت نہیں ہونے دوں گی۔"

رئیس احمد نے کہا۔ "مسٹر سرفراز! اگر آپ عمران پر شبہ کرتے رہیں گے تو اصل قاتل کو بھی نہیں پکڑ سکیں گے۔ عمران کی ماں نے ہاتھ میں کلام پاک لے کر اور کلمہ طیبہ پڑھ کر میرے سامنے کہا تھا۔ رات وہ آٹھ بجے سے لے کر صبح تک گھر کی چار دیواری میں ماں کے قریب ہی تھا۔"

سرفراز نے کہا۔ "لوگ عدالتوں میں مقدس کتاب کو ہاتھوں میں لے کر سچ بولنے کی قسم کھاتے ہیں مگر اپنی جان بچانے کے لئے جھوٹ بولتے ہیں اور ماں تو پھر ماں ہوتی ہے۔ وہ بھی بیٹے کو سزائے موت سے بچانے کے لئے جھوٹی قسمیں کھاسکتی ہے۔"

"آپ بھی میری وائف کی طرح ایک ہی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔"

"کسی اور کا سراغ ملے گا تب میں اس کے خلاف بھی بولوں گا اور اس کے خلاف بھی تفتیش کروں گا۔ ویسے قاتل کوئی بھی ہو۔ آج اس نے آپ کی دونوں بیٹیوں پر حملہ کرکے یہ ثابت کردیا ہے کہ اسے صرف آپ کے خاندان اور خصوصاً آپ کی اولاد سے

دشمنی ہے۔"

بیگم نے کہا۔ "اور ایسی دشمنی ایک سوتیلا ہی کر سکتا ہے۔"

سرفراز نے بیگم کو نظرانداز کرتے ہوئے شہلا اور سدرہ سے پوچھا۔ "تم دونوں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ بتا سکتی ہو اس کا قد کیا ہوگا؟ اس کی جسامت کیا ہوگی؟ اس نے کچھ کہا ہوگا؟ اس کی آواز اور لہجہ کیسا ہوگا؟"

سدرہ چونک کر سوچنے لگی۔ وہ بھول گئی تھی کہ دشمن کی آواز اور لہجہ کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا چونکہ وہ آواز بنا کر بول رہا تھا......... اس لئے اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ اس دشمن کی باتیں اس نے پہلے کہاں سنی تھیں۔

شہلا بیان دے رہی تھی۔ اس دشمن کا چہرہ دونوں بہنوں نے نہیں دیکھا تھا۔ اوپر ہی اوپر جو کچھ دیکھا تھا۔ اسی کے متعلق شہلا نے کہا۔ "اس کا قد تقریباً چھ فٹ تھا۔ وہ قد آور باڈی بلڈر دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آواز سخت اور کھردری سی تھی۔"

سدرہ نے کہا۔ "نہیں شہلا! وہ صحت مند تھا لیکن باڈی بلڈر نہیں لگتا تھا اور اس کا قد چھ فٹ سے کم تھا۔ وہ تمہارے سامنے سخت اور کھردری آواز میں بولتا رہا ہوگا۔ مجھ سے طنزیہ انداز میں ایک عام آدمی کی طرح بولتا رہا۔"

سرفراز خان نے کہا۔ "تعجب ہے تم دونوں نے اسے دیکھا مگر اس کا حلیہ مختلف بتا رہی ہو۔ ایسا لگتا ہے تمہارے کمرے میں جو آیا تھا' وہ سدرہ کے کمرے میں نہیں گیا تھا۔ اس کے کمرے میں کوئی دوسرا گیا ہوگا۔"

رئیس احمد نے کہا۔ "آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہاں دو آدمی واردات کرنے کے لئے آئے تھے۔"

"دونوں بہنوں کے بیانات مختلف ہوں گے تو یہی سمجھا جائے گا کہ مس سدرہ کے کمرے میں آنے والا ایک قاتل تھا اور مس شہلا کے کمرے میں آنے والا کوئی ہوس پرست جنونی تھا۔"

شہلا نے کہا۔ "اس دشمن نے میرے ساتھ جیسا سلوک کیا ہے' اسے آپ سن سکتے ہیں مگر سمجھ نہیں سکتے۔ میں ان حالات میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ میں اپنے آپ میں نہیں تھی پھر اس دشمن کو کس طرح ہوش میں رہ کر دیکھ سکتی تھی۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ یاد نہیں آپ میرے بیان کو اہمیت نہ دیں۔"

ایسے وقت ایک ماتحت نے آکر سرفراز سے کہا۔ "سر! اس دوسرے بیڈ روم میں ہمیں یہ شناختی کارڈ ملا ہے۔"

سرفراز نے اس کارڈ کو لے کر اونچی آواز میں پڑا۔ "خرم جمال ولد جمال الدین احمد۔"

سدرہ یہ نام سنتے ہی چونک گئی۔ اس نے جھپٹ کر اس شناختی کارڈ کو سرفراز کے ہاتھ سے لیا۔ اس میں اس کے محبوب خرم کی تصویر تھی۔ اس کا نام اور اس کی ولدیت لکھی ہوئی تھی۔

سدرہ حیرانی سے اور بے یقینی سے اس شناختی کارڈ کو دیکھ رہی تھی۔ رئیس احمد نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لے کر کہا۔ "خرم؟ کیا یہ وہی خرم ہے جسے ملازمت دلانے کے لئے تم سفارش کرتی رہتی ہو.........؟ ہاں تصویر تو اسی کی ہے۔ میں اس سے دو بار مل چکا ہوں۔"

بیگم نے کہا۔ "اور میں کئی بار اس کی منحوس صورت دیکھ چکی ہوں۔ وہ آپ کی لاڈلی سے ملنے کے لئے یہاں آتا رہتا ہے۔"

سرفراز نے اس شناختی کارڈ کو لیتے ہوئے پوچھا۔ "یہ جوان کرتا کیا ہے؟ کیا یہاں ملازمت کے لئے آیا کرتا ہے؟"

بیگم نے سدرہ کو ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "چپ کیوں ہو جواب دو۔ وہ یہاں کیوں آتا ہے؟"

وہ کیا جواب دیتی اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ جسے وہ دل و جان سے چاہتی ہے اور جسے پستی سے اٹھا کر بلندی پر اپنے برابر لانا چاہتی ہے وہ اسے قتل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے جھجکتے ہوئے سرفراز کو دیکھا پھر کہا۔ "میں اسے چاہتی ہوں۔ مجھے تو یقین نہیں آرہا ہے۔ آخر یہ کیوں مجھ پر قاتلانہ حملہ کرے گا؟ میری موت سے اسے کیا حاصل ہوگا؟"

سرفراز نے کہا۔ "یہ معلوم کرنا ہمارا کام ہے......... تم سچ سچ بتاؤ کیا وہ راتوں کو تم سے چھپ کر ملنے آتا ہے؟"

"نہیں! ہم محبت کرتے ہیں' لیکن چوری چھپے ملنے والی محبت نہیں کرتے۔ ہم تعلیم یافتہ ہیں۔ ہمارے پاس ذہانت ہے۔ اتنا تو سمجھتے ہیں کہ شادی سے پہلے لڑکیوں کو ریزرو رہنا

چاہئے۔"

اس نے اپنے ایک ماتحت کو شناختی کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ "اسے پکڑ کر دفتر میں لے آؤ۔ اس کیس میں یہ نیا کردار سامنے آیا ہے میں دیکھوں گا کہ یہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔"

وہ ماتحت وہاں سے چلا گیا۔ سرفراز سب سے مزید سوالات کرنے لگا۔ پھر وہ بھی وہاں سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر انٹیلی جینس کے دفتر میں آیا۔ وہاں خرم کو پکڑ کر لایا گیا تھا۔ اس نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا نام خرم ہے۔"

"جی ہاں! میرا پورا نام خرم جمال ہے۔"

"کیا کرتے ہو؟"

"بے روزگار ہوں۔ میں نے ٹیکسٹائل انجینئرنگ میں ڈپلومہ حاصل کیا ہے۔ اچھی سی ملازمت ملنے تک راتوں کو چھپ کر ٹیکسی چلاتا ہوں۔ کسی طرح سفید پوشی کا بھرم رکھتا ہوں۔"

"سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے چھپ کر ٹیکسی چلاتے ہو یا کسی رئیس زادی کو یہ نہیں بتانا چاہتے کہ تم ٹیکسی ڈرائیور ہو؟"

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے سرفراز کو دیکھا پھر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ نے میرے اور سدرہ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی ہیں۔ ایسی کیا بات ہے کہ آپ نے مجھے یہاں بلایا ہے؟"

"تم آج تمام رات کہاں رہے؟"

"میں ٹیکسی چلاتا رہا ہوں۔ آپ اس مالک سے پوچھ سکتے ہیں۔ جس کی ٹیکسی میں چلاتا ہوں۔"

"مالک سے بھی معلوم کرلوں گا اس کے علاوہ اور بھی معلوم کرنے کے بہت سے ذرائع ہیں۔ تمہارے گھر میں اور کون کون ہے؟"

"میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ میرے والدین بیمار رہتے ہیں۔ مجھے ان کے علاج کے لئے بہت بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ میں بارہ گھنٹے ٹیکسی چلاتا ہوں۔ کبھی کبھی پندرہ اور سولہ گھنٹے چلاتا ہوں۔ ان کے لئے زیادہ سے زیادہ رقم جمع کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔"

"تمہارے باپ کو بیماری کیا ہے؟"

"وہ کینسر کے مریض ہیں۔ یہاں کے ڈاکٹروں نے کہا ہے لندن میں ان کا علاج ہوجائے گا لیکن وہاں رہنے اور علاج کرانے کے اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ تقریباً چھ سات لاکھ روپے کی ضرورت ہوگی۔"

"اوہ.......... اچھا۔ کچھ سمجھ میں آرہا ہے۔ یہ بہت ہی جذباتی معاملہ ہے۔ باپ کینسر کا مریض ہے۔ اس کے علاج کے لئے اتنی بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ جو تمہاری اوقات سے زیادہ ہے۔ یہ رقم ٹیکسی چلا کر حاصل نہیں کرسکو گے۔"

"میں یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہتا ہوں۔ لاٹری کے ٹکٹ خریدتا رہتا ہوں۔ میں نے کچھ پرائز بانڈ بھی خریدے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ وہ کسی بھی حیلے سے مجھے سات لاکھ روپے دے دے' میرے ابو نے بڑی محنت کرکے مجھے تعلیم دلائی ہے۔ مجھے کسی قابل بنایا ہے۔"

سرفراز نے کہا۔ "جب تمام کوششیں ناکام ہوجائیں۔ دوا بھی کام نہ آئے۔ دعا بھی قبول نہ ہو تو کوئی بڑی واردات کرنے سے لاکھوں روپے مل جاتے ہیں۔"

وہ تائید میں سرہلا کر بولا۔ "جی ہاں! ایسے بھی لوگ ہیں جو حالات سے مجبور ہوکر مجرم بن جاتے ہیں لیکن مجھ جیسے تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے ایسی مجرمانہ سوچ نہیں رکھتے ہیں۔"

"نہ سوچنے کے باوجود حالات سوچنے پر مجبور کردیتے ہیں۔ کیا تم علاج کے بغیر اپنے باپ کو کسمپرسی کی حالت میں دم توڑتے ہوئے دیکھ سکو گے؟"

"پلیز آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

"کل رات سدرہ پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔"

اس نے چونک کر سرفراز کو دیکھا۔ حیرانی سے گڑبڑانے کے انداز میں کہا۔ "سدرہ پر حملہ؟ کیا اسی قاتل نے کیا ہے؟"

"قاتل پہلے اپنا نام اور پتا بتا کر نہیں گیا تھا لیکن اس بار اپنا پورا پتا ٹھکانا بتا کر گیا ہے۔ یہ دیکھو۔"

سرفراز نے اس کے سامنے میز پر شناختی کارڈ کو پھینکا۔ وہ اپنا شناختی کارڈ دیکھتے ہی چونک گیا۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ آپ کو کہاں سے ملا؟ میں اسے ضروری کاغذات

کے ساتھ رکھتا ہوں۔ میرے تمام کاغذات موجود ہیں لیکن یہ نہ جانے کیسے گم ہو گیا تھا۔"

"تم اس کارڈ کو اپنی جیب میں رکھتے ہو۔ دوسرے کاغذات کے ساتھ نہیں رکھتے۔"

"جب میں ٹیکسی چلاتا ہوں تو اسے ڈرائیونگ لائسنس کے ساتھ رکھتا ہوں۔ یہ سب ایک ساتھ نہ ہوں تو ٹریفک پولیس والے بہت پریشان کرتے ہیں۔ جب میں ٹیکسی مالک کے حوالے کرتا ہوں تو اس شناختی کارڈ کو اپنی جیب میں رکھ لیتا ہوں۔"

"یہ کارڈ تمہاری جیب سے نکل کر سدرہ کے بیڈ روم میں گر پڑا تھا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں کبھی سدرہ کے بیڈ روم میں نہیں گیا۔ صرف ایک بار امیر احمد کی ہلاکت کے سلسلے میں تعزیت کے لئے اس کے ڈرائنگ روم میں گیا تھا۔"

"وہ تو دنیا والوں کے سامنے گئے تھے' لیکن پچھلی رات چھپ کر نقاب پہن کر اسے قتل کرنے کے لئے اس کے بیڈ روم میں گئے تھے۔"

"یہ جھوٹ ہے آپ خواہ مخواہ مجھے الزام دے رہے ہیں۔"

"تم نے اس پر دو فائر کئے۔ وہ باتھ روم میں چھپ کر چیخنے چلّانے لگی تھی۔ فائرنگ کی آواز اور چیخنے چلّانے کی آواز سے تم پریشان ہو گئے۔ تمہیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ ناکامی اور بدحواسی کے باعث تمہارا یہ کارڈ وہاں گر پڑا تھا۔"

وہ بولا۔ "جناب! مجھے اس الزام پر غصہ آرہا ہے لیکن آپ قانون کے محافظ ہیں۔ ایک بڑے افسر ہیں۔ جھوٹے الزامات عائد کرتے رہیں گے تو میں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گا۔"

"کیا یہ شناختی کارڈ اُڑ کر وہاں پہنچ گیا تھا؟"

"جناب پانچ دن پہلے یہ کارڈ اچانک گم ہو گیا تھا۔ اس کے بغیر ٹریفک پولیس والے بہت پریشان کرتے ہیں۔ میں نے دوسرے ہی دن اس کی گمشدگی کی رپورٹ اور نئے شناختی کارڈ کی فراہمی کی درخواست پیش کی تھی۔ مجھے اس دفتر سے ایک رسید دی گئی ہے۔ اس رسید پر لکھا ہوا ہے کہ پندرہ دنوں کے بعد مجھے ایک نیا شناختی کارڈ مل جائے گا۔"

"جرم کرنے والے نادان نہیں ہوتے۔ واردات سے پہلے اپنا شناختی کارڈ کہیں پھینک دیتے ہیں یا اپنے پاس چھپا کر رکھتے ہیں اور نئے شناختی کارڈ کی درخواست لکھ دیتے

ہیں۔ انہیں دس پندرہ دنوں کے بعد نئے کارڈ کی وصولی کی رسید مل جاتی ہے۔ ہم مجرموں سے زیادہ جرائم کے ہتھکنڈوں کو سمجھتے ہیں۔"

خرم نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "آپ نے یہ طے کر لیا ہے کہ مجھے مجرم ثابت کر کے رہیں گے' لیکن آپ یہ تو بتائیں کہ میں سدرہ پر قاتلانہ حملہ کیوں کروں گا؟ مجھے کیا حاصل ہو جائے گا؟"

سرفراز نے کہا۔ "بعض اوقات ہم اندھیروں میں تیر چلاتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی تیر صحیح نشانے پر جا کر لگتا ہے۔ تمہارے حالات بتا رہے ہیں کہ امیر احمد کے بعد سدرہ کو قتل کرو گے تو تمہیں سات لاکھ روپے مل جائیں گے۔"

وہ اپنی کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "یہ.......... یہ فضول سا الزام ہے۔ سدرہ مجھے دل و جان سے چاہتی ہے۔ میں بھی دل کی گہرائیوں سے اسے چاہتا ہوں۔ میں سات لاکھ روپے کے لئے کسی بے گناہ بھائی بہن کو قتل نہیں کروں گا۔ جبکہ وہ میری محبت ہے۔ میری زندگی ہے۔"

"یہ سب فلمی مکالمے ہیں۔ کتنے بینکوں میں تم نے اکاؤنٹ کھول رکھے ہیں؟"

"سر! میں ایک غریب آدمی ہوں۔ اپنے ابو کے علاج کے لئے رقم جمع کر رہا ہوں۔ صرف ایک بینک میں میرا اکاؤنٹ ہے۔"

اس نے ایک پرچی پر بینک کا نام اور اپنا اکاؤنٹ نمبر لکھ کر اسے دیا۔ سرفراز نے فون کے ذریعے بینک منیجر کو مخاطب کیا پھر کہا۔ "میں انٹیلی جینس ڈیپارٹمنٹ سے انسپکٹر سرفراز خان بول رہا ہوں۔ ایک مرڈر کیس کے سلسلے میں خرم جمال نامی شخص کا بینک بیلنس معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے دوسری طرف کی باتیں سن کر کہا۔ "پلیز آپ ہمیں اپنے بینک کے اصول نہ بتائیں۔ ایک مرڈر کیس کے سلسلے میں ہم سے تعاون کریں۔ میں ریسیور رکھ رہا ہوں۔ پندرہ منٹ کے اندر آپ کال بیک کریں۔ مجھے خرم جمال اکاؤنٹ نمبر754202 کا بینک بیلنس بتائیں۔ ہمیں بینک آنے پر مجبور نہ کریں۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ ایسے وقت سدرہ وہاں آئی۔ خرم اسے دیکھتے ہی اٹھ کر بولا۔ "تھینکس گاڈ! تم آگئیں۔ میں یہاں سے نکل کر تمہارے پاس آنے والا تھا۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ تمہارے بیڈ روم میں میرا شناختی کارڈ پایا گیا ہے۔"

سدرہ اسے گھور کر غصے سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔
"تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ پچھلی رات میں تمہیں قتل کرنے آیا تھا؟ میں.......... میں تمہارے لئے اپنی جان دے سکتا ہوں۔ تمہاری جان لینے کی بات کبھی پاگل ہو کر بھی نہیں سوچ سکتا۔"
سدرہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "مسٹر سرفراز! میں اس سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ اجازت دیں گے؟"
"میں نے خرم سے تم پر حملہ کرنے کے سلسلے میں سوالات کئے ہیں۔ ابھی شہلا کے سلسلے میں ایک بھی سوال نہیں کیا ہے۔ بہرحال باقی سوالات بعد میں کروں گا۔ تم دونوں ساتھ والے کمرے میں جاسکتے ہو۔ دروازہ بند کرکے باتیں کرسکتے ہو۔"
وہ قریب ہی ایک کمرے میں آگئے۔ سدرہ نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کمرہ بند ہے۔ کوئی نہیں آسکے گا۔ تم مجھے قتل کرسکتے ہو۔"
خرم نے اسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے تیور نے اور تمہاری طنزیہ باتوں نے یہ سمجھا دیا ہے کہ تم مجھ سے بدظن ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرا وہ شناختی کارڈ تمہارے بیڈ روم میں کیسے پہنچ گیا تھا۔ تمہیں مجھ سے ذرا سی بھی محبت ہے تو میرے حق میں یہ سوچو کہ میرے خلاف کوئی سازش بھی ہوسکتی ہے۔"
سدرہ نے پوچھا۔ "تمہارے خلاف سازش کرکے کوئی کیا حاصل کرے گا؟"
"اور میں تمہارے بھائی کو اور تم کو قتل کرکے کیا حاصل کروں گا؟"
"یہ تو انٹیلی جینس والے معلوم کریں گے کہ ہمیں قتل کرنے سے تمہیں کیا فائدہ پہنچنے والا ہے؟ ہمارا وہ سوتیلا عمران ضرور تمہیں کوئی فائدہ پہنچا رہا ہوگا۔ تم اس کے لئے کام کررہے ہو۔"
"تم میرے بارے میں بہت ہی غلط اور بچکانہ رائے قائم کررہی ہو۔ صرف ایک کارڈ کی وجہ سے مجھے بے وفا سمجھ رہی ہو۔"
"بات صرف اس کارڈ کی نہیں ہے۔ تم کل رات مجھ پر فائر کرنے سے پہلے طنزیہ انداز میں بول رہے تھے۔ آواز اور لہجہ بدل کر بولنے کی کوشش کررہے تھے۔ اس کے باوجود ایک آدھ الفاظ ایسے تھے جو مجھے کھٹک رہے تھے۔ تم ایسے الفاظ ایک خاص انداز میں ادا کرتے ہو۔ میں یاد کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ تمہارا شناختی کارڈ دیکھتے ہی یاد آگیا

کہ اس نقاب کے پیچھے بولنے والے تم ہی تھے۔"
"سدرہ پلیز! میری محبت میں اور میری حمایت میں سوچو۔ کیا وہ دو چار الفاظ کوئی دوسرا میرے انداز میں نہیں بول سکتا؟ کیا وہ میری نقل نہیں کرسکتا؟"
"تم چاہتے ہو تمہارے خلاف جتنے ٹھوس ثبوت ملتے جائیں' میں ان کے بارے میں محبت سے اور نادانی سے یہ سوچتی رہوں کہ تمہارے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ میرے کمرے میں تمہارا شناختی کارڈ پہنچایا جارہا ہے۔ کوئی میرے کمرے میں آکر تمہارے انداز میں بول رہا ہے۔ آئندہ بھی کچھ اور ثبوت ملیں گے تو میں ایک نادان محبوبہ کی طرح تمام ثبوت کو جھوٹا اور تمہیں سچا سمجھتی رہوں گی۔"
"میری بات کا یقین کرو۔ وہ قاتل بہت ہی چالباز ہے۔ خود واردات کررہا ہے اور بڑی چالبازی سے مجھے پھنسا رہا ہے۔"
"اس قاتل کو تم سے کیا دشمنی ہے؟ وہ تمہیں کیوں پھنسا رہا ہے؟"
"صاف ظاہر ہے۔ تمہاری جیسی محبت کرنے والی مجھ پر شبہ کرے گی۔ پولیس والے مجھے حوالات میں بند کریں گے تو اصل قاتل کی طرف سے توجہ ہٹ جائے گی۔ وہ اس طرف سے توجہ ہٹا کر پھر تم پر حملہ کرسکتا ہے۔"
وہ گھور کر بولی۔ ......"رات تمہارے ساتھ اور کون تھا؟"
"میں تھا اور میرا خدا تھا۔ میں رات بھر ٹیکسی چلاتا رہا تھا۔ میں نے اب تک تم سے یہ بات چھپائی تھی کہ اپنی روزی روٹی کی خاطر راتوں کو چھپ کر ٹیکسی چلاتا ہوں۔ اب مجبور ہو کر بتا رہا ہوں۔"
وہ غصے سے گھورتی جارہی تھی' کہنے لگی۔ "تمہیں شرم سے ڈوب جانا چاہئے۔ تم نے شہلا کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟"
اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا سلوک کیا تھا؟"
وہ غصے سے بولی۔ "لعنت ہے تم پر۔ مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے رہے اور کل رات میری بہن کی عزت لوٹ لی۔"
وہ غصے سے جیسے پاگل ہوگیا۔ یک بارگی اسے ایک زور دار طمانچہ رسید کرتے ہوئے بولا۔ "تم کیسی شریف زادی ہو۔ ایسی بات منہ سے کہتے ہوئے تمہیں شرم سے مرجانا چاہئے۔ امی مجھے سمجھاتی رہتی ہیں کہ مجھے تمہاری جیسی رئیس زادی کا خیال دل سے نکال

دینا چاہئے اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اس قدر بے حیائی سے بھی بول سکتی ہو تو میں پہلے ہی تم پر تھوک کر چلا جاتا۔"

وہ کرسی سے اٹھ کر تھوکتا ہوا تیز قدموں سے چلتا ہوا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

سدرہ گم صم سی بیٹھی رہی۔ کبھی ماں باپ نے بھی اسے پھول سے نہیں مارا تھا۔ خرم نے اسے ایسا زور دار طمانچہ مارا تھا کہ آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے تھے۔ اسے غصہ آرہا تھا مگر اندر سے کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے چاہنے والے نے اسے بالکل اپنا سمجھ کر اس کی بے حیائی پر طمانچہ مارا تھا۔

وہ سکتے کی حالت میں بیٹھی رہ گئی تھی۔ وہاں سے اٹھنا بھول گئی تھی۔ ایک ماتحت نے آکر کہا۔ "سر آپ کو بلا رہے ہیں۔"

وہاں سے اٹھ کر وہ کمرے سے باہر آئی۔ دوسرے کمرے میں سرفراز کے سامنے میز کے دوسری طرف خرم بیٹھا ہوا تھا۔ سرفراز نے اسے بھی بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ بولی۔ "مجھے اس کیس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کوئی مجھے قتل کرتا ہے تو کرے۔ کوئی محبت سے بھی جان لے سکتا ہے اور عداوت سے بھی۔"

سرفراز نے کہا۔ "محبت میں محبت سے ہی جان لینا چاہئے۔ پیار کی نادانی میں کسی کو عداوت کی اجازت نہیں دینی چاہئے۔ تمہیں یہ دیکھنا اور سمجھنا چاہئے کہ محبت کی آڑ میں کیا کچھ ہوتا رہتا ہے۔"

اس نے ایک پرچی اٹھا کر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ "بینک منیجر نے ابھی فون پر خرم جمال کا یہ بینک بیلنس بتایا ہے۔ یہ ٹیکسی چلاتا ہے۔ آخر کتنا کما لیتا ہوگا۔ اس مہنگائی کے دور میں تین آدمیوں کا پیٹ پالنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ اپنے باپ کے علاج کے لئے آخر کتنی رقم جمع کر سکتا ہے؟ خرم میں تم سے پوچھ رہا ہوں؟ تم نے اب تک کتنی رقم جمع کی ہے؟"

وہ بولا۔ "مجھے صحیح رقم یاد نہیں ہے۔ میرے اکاؤنٹ میں شاید سترہ ہزار کچھ روپے ہیں۔"

"سترہ ہزار نہیں' دو لاکھ سترہ ہزار آٹھ سو روپے ہیں۔"

خرم نے چونک کر سرفراز کو دیکھا پھر کہا۔ "دو لاکھ۔ سترہ ہزار آٹھ سو.......... اور میرے اکاؤنٹ میں۔ یہ آپ کیا کیا کہہ رہے ہیں؟"

"یہ میں نہیں بینک منیجر کہہ رہا ہے۔ اب تم یہ نہ کہنا کہ بینک والوں نے تمہارے بیمار باپ پر ترس کھا کر تمہارے اکاؤنٹ میں دو لاکھ روپے کا اضافہ کیا ہے۔"

خرم نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے سدرہ کو دیکھا پھر سرفراز سے کہا۔ "کیا میں فون پر بینک منیجر سے بات کر سکتا ہوں؟"

"نہیں۔ تم بینک میں جا کر اس سے باتیں کر سکتے ہو۔ ہمارے سامنے اداکاری نہ دکھاؤ۔ تم اپنے خلاف کتنے ثبوت جھٹلاؤ گے؟"

سدرہ نے کہا۔ "یہ مجھ سے یہی چاہتا ہے کہ اس کے خلاف جتنے ثبوت ملتے جائیں' میں پیار کی نادانی میں انہیں نظر انداز کرتی جاؤں اور اس کی حمایت میں یہی بیان دیتی رہوں کہ اس بے چارے کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔"

سرفراز نے کہا۔ "میں دوسری طرف سے کھڑکی کے پاس کھڑا تم دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ سدرہ! تمہاری یہ بات درست ہو سکتی ہے کہ یہ تمہارے سوتیلے بھائی کے لئے کام کر رہا ہے۔ وہ عمران احمد اس کی خدمت گزاری کے سلسلے میں شاید لاکھوں روپے دینے کا وعدہ کر چکا ہے اور اس کی پہلی قسط دو لاکھ روپے اس کے اکاؤنٹ میں جمع کرا چکا ہے۔"

سدرہ نے نفرت سے کہا۔ "بڑے افسوس کی بات ہے۔ تمہیں لاکھوں روپے کی ضرورت ہے۔ تم مجھ سے کہہ دیتے' میں بلینک چیک لکھ کر دے دیتی۔ تم اپنے لالچ اور ہوس کے مطابق اس میں زیادہ سے زیادہ رقم بھر لیتے وہ چیک کیش ہو جاتا۔"

"بکواس مت کرو۔ میں نے تم سے محبت کی ہے تمہاری دولت سے نہیں۔ میری خود داری اور میری غیرت کبھی یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ میں اپنے ابو کے علاج کے لئے تم سے کچھ قرض مانگوں۔ مانگنا تو دور کی بات ہے۔ میں نے کبھی تمہارے سامنے ابو کی بیماری کا ذکر نہیں کیا۔ پلیز مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ جب میں مانگ نہیں سکتا تو کوئی جرم کیسے کر سکتا ہوں؟"

سرفراز نے کہا۔ "ایسے غیرت مند بھی ہوتے ہیں جو کھل کر کسی سے مانگتے نہیں ہیں مگر چھپ کر غلط راستوں سے اپنی ضرورتیں پوری کر لیتے ہیں۔"

وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ میز پر گھونسا مار کر بولا۔ "میں غیرت مند نہیں ہوں۔ بہت بڑا مجرم ہوں۔ میں نے سدرہ کے بھائی کو قتل کیا ہے۔ آئندہ اس کے پورے خاندان کو قتل کروں گا۔ میں بہت خطرناک مجرم ہوں۔ مجھے زنجیریں پہنائیں۔ جتنی جلدی ہو سکے

مجھے پھانسی پر چڑھا دیں ورنہ میں آپ جیسے بے وقوف افسروں کو بھی قتل کرنا شروع کر دوں گا۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ تیزی سے چلتا ہوا آہنی سلاخوں کے پاس گیا پھر بولا۔ "فوراً دراوزہ کھولو۔ مجھے اندر کرو۔ میں جنونی قاتل ہوں۔"

سرفراز نے حکم دیا۔ اس کے ماتحتوں نے دروازہ کھول کر اسے آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا۔ سدرہ دور کھڑی پریشانی سے اور ایک عجیب سی بے چینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ دشمن تھا مگر دل اسے دوست مان رہا تھا۔ سارے ثبوت اس کے خلاف تھے مگر اس کی باتیں اور اس کی یہ دیوانگی اس کے دل پر اثر کر رہی تھی۔

وہ فوراً ہی منہ پھیر کر وہاں سے چلی گئی۔

☆======☆======☆

زرینہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اسے اپنے جوان بیٹے کی موت سامنے نظر آرہی تھی۔ اس کی سوکن بیگم بانو عمران کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئی تھی۔ وہ اپنے جوان بیٹے کی ہلاکت کا انتقام لینے کے لئے اپنی دولت پانی کی طرح بہا رہی تھی۔ ایسے نامور اور تجربے کار وکیلوں کی خدمات حاصل کر رہی تھی جو مجرموں کو بے گناہ اور بے گناہوں کو مجرم ثابت کرنے میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔

اس نے رئیس احمد سے کہا۔ "آپ نے اب تک کیا کیا ہے؟ عدالت میں پیشی ہوگی تو میری وہ.......... دشمن اور آپ کی چہیتی بیگم بانو کے وکیل اسے مجرم ثابت کردیں گے۔ پہلی پیشی میں ایسا نہ کرسکے تو اس کی ضمانت منسوخ کرادیں گے۔ اسے جیل.......... پہنچا دیں گے۔"

"تم سوکن کی دولت اور اس کی چالبازیوں سے ڈر رہی ہو۔ میں اس سے کم نہیں ہوں۔ میں نے بھی ایسے وکیل کئے ہیں جو جرائم کی دنیا میں چھٹے ہوئے بدمعاش وکیل مانے جاتے ہیں۔ اب میرا یہ ایک ہی بیٹا رہ گیا ہے۔ میں اس پر قاتل ہونے کا الزام سچ نہیں ہونے دوں گا۔"

"عدالت میں کس کا پلڑا بھاری ہوگا۔ نہ یہ ہم جانتے ہیں نہ وہ دشمن عورت جانتی ہے۔ خدانخواستہ اس کا پلڑا بھاری ہو گا تو پھر ہم اپنے بیٹے کو کس طرح بچائیں گے؟ عدالتی فیصلے کے بعد بچاؤ کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔ کیا آپ ایسا کچھ نہیں کرسکتے کہ یہ کیس عدالت میں نہ جائے؟ عدالت میں پیش ہونے سے پہلے ہی میرا بیٹا بے قصور ثابت ہو جائے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ میں اپنے بیٹے کو اس کیس سے باہر لے آنا چاہتا ہوں۔ میں مقدمے بازی نہیں چاہتا مگر کیا کروں بیگم بہت ہی ذلیل اور کمینی عورت ہے۔ وہ کسی طرح کا بھی سمجھوتہ نہیں کرے گی۔"

زرینہ نے کہا۔ "مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ میں بیٹے کو یہاں نہ آنے دیتی تو آج ایسی مصیبت نہ آتی۔ مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ ان سوتیلوں سے دور فیصل آباد میں ہی رہنا چاہئے تھا۔"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا' تم ماں بیٹے کو کبھی یہاں نہیں آنا چاہئے' لیکن بیٹے نے ضد کی اور تم یہاں آگئیں۔ اب تو جیسے بھی حالات ہوں ان سے نمٹنا ہی ہوگا۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "میں کیا کروں۔ اب اسے یہاں سے نہیں لے جاسکتی۔ پولیس والوں نے پابندی عائد کی ہے۔ جب تک اصل قاتل گرفتار نہیں ہوگا۔ عمران کو اسی شہر میں رہنا ہوگا۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ زرینہ نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو!"

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "کیا یہ عمران احمد کا گھر ہے؟"

"جی ہاں میں اس کی امی بول رہی ہوں۔"

"آپ کا بیٹا زخمی ہے۔ وہ سول ہسپتال میں ہے۔"

وہ ایک دم سے گھبرا کر بولی۔ "میرا بیٹا کیسے زخمی ہوگیا؟ آپ کون ہیں؟"

"میں پولیس انسپکٹر رحمٰن بول رہا ہوں۔ کوئی آپ کے بیٹے پر فائر کرتا ہوا گزر گیا تھا۔ تشویش کی بات نہیں ہے۔ گولی کا زخم گہرا نہیں ہے۔ اس کی مرہم پٹی کی جارہی ہے۔"

وہ بولی۔ "میں ابھی آرہی ہوں۔"

وہ ریسیور رکھ کر اٹھ گئی۔ رئیس احمد نے پوچھا۔ "عمران کیسے زخمی ہوگیا..........؟"

وہ تیزی سے باہر کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ "کسی نے اس پر گولی چلائی تھی اور کسی نے کیا تمہاری چہیتی نے چلوائی ہوگی اگر میرے بیٹے کو کچھ ہوگیا تو میں اسے اور اس کی دونوں بیٹیوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

وہ دونوں کار میں آکر بیٹھ گئے۔ زرینہ اسے ڈرائیو کرنے لگی۔ رئیس احمد نے موبائل کے ذریعے سرفراز خان کو مخاطب کیا۔ "ہمیں ابھی اطلاع ملی ہے کہ کسی نے ہمارے بیٹے پر گولی چلائی ہے۔ وہ زخمی ہوگیا ہے۔ سول ہسپتال میں ہے۔ ہم ادھر جارہے ہیں۔ کیا آپ ابھی وہاں آسکیں گے؟"

"مجھے انسپکٹر رحمٰن سے اطلاع مل چکی ہے۔ میں یہاں اسپتال پہنچ چکا ہوں۔ آپ

آجائیں۔"

وہ آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد اسپتال پہنچ گئے۔ عمران احمد ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بازو سے پٹی بندھی ہوئی تھی۔ انسپکٹر رحمٰن اور سرفراز خان اس کے سامنے موجود تھے۔ اس سے سوالات کر رہے تھے۔ "میں ہول سیل مارکیٹ سے نکل کر اپنی کار میں بیٹھنے جارہا تھا۔ ایسے ہی وقت فائرنگ کی آواز کے ساتھ مجھے ایک بازو میں تکلیف کا احساس ہوا۔ میں مزید فائرنگ سے بچنے کے لئے فوراً ہی زمین پر گر پڑا۔ ایک موٹر سائیکل پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک اسے چلا رہا تھا۔ دوسرا پیچھے بیٹھا ہوا فائر کر رہا تھا۔

انسپکٹر رحمٰن نے کہا۔ "میں وہاں سے کچھ فاصلے پر اپنی جیپ میں موجود تھا۔ ان نامعلوم افراد نے دو فائر کئے تھے۔ دوسری گولی ہماری طرف آئی تھی۔ یہ ان کی چالاکی تھی۔ ہمیں پیش قدمی سے روکنے کے لئے انہوں نے ہماری طرف بھی گولی چلائی تھی۔ ہم فوراً ہی ان کے پیچھے نہ جاسکے کیونکہ ہم کاؤنٹر فائرنگ کے لئے تیار نہیں تھے۔ جب اپنی جیپ اسٹارٹ کرکے ان کے تعاقب میں گئے تو وہ آگے جاکر مختلف راستوں میں اور گلیوں میں پتا نہیں کہاں گم ہوگئے۔"

سرفراز نے پوچھا۔ "کیا تم نے ان میں سے کسی کی صورت دیکھی تھی؟"

"نہیں! وہ فائر کرتے ہوئے آگے نکل گئے تھے۔ ان کی پشت نظر آرہی تھی۔ ان میں سے کسی نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔"

"کیا کسی سے کاروباری دشمنی ہے؟"

زرینہ نے کہا۔ "کاروبار کرنے والے ایسی جان لیوا دشمنی نہیں کرتے ہیں۔ وہ تو کاروباری ہتھکنڈوں سے نقصان پہنچاتے ہیں۔ آپ کسی سوال و جواب کے بغیر اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ میرا بیٹا بدقسمتی سے سوتیلا کہلا رہا ہے۔ میری سوکن میرے بیٹے کو مجرم ثابت نہیں کرسکے گی۔ اس لئے میرے بیٹے کو قتل کرا کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرنا چاہتی ہے۔"

رئیس احمد نے کہا۔ "زرینہ! خاموش رہو۔ تم سے سوالات نہیں کئے جارہے ہیں۔ مسٹر سرفراز خود ہی معاملے کی تہہ تک پہنچ جائیں گے۔"

سرفراز نے کہا۔ "ہاں میں سوچ رہا ہوں اور سمجھ رہا ہوں۔ سوتیلے آپس میں لڑ رہے ہیں۔ آپ کی بیگم بانو بہت غصہ ور خاتون ہیں۔ وہ میرے سامنے بھی قسمیں کھا چکی ہیں کہ سوتیلے بیٹے سے انتقام ضرور لیں گی۔ انتقام لینے کے لئے شاید وہ عدالتی کارروائی پر

بھروسہ نہیں کر رہی ہیں۔ عمران کو نقصان پہنچانے کے لئے اگر کوئی کارروائی کر رہی ہیں تو بہت غلط کر رہی ہیں۔"

رئیس احمد نے کہا۔ "مسٹر سرفراز! میں بیگم کو جتنا سمجھاتا ہوں وہ اتنا ہی مجھے اپنا اور اپنی اولاد کا دشمن سمجھنے لگتی ہیں۔ ایک آپ ہی ہیں جو اسے سمجھا سکتے ہیں۔"

"اس کیس نے مجھے بُری طرح الجھا دیا ہے۔ ایک نیا ملزم سامنے آیا ہے۔ شاید آپ اس کے بارے میں کچھ کام کی باتیں بتا سکتے ہیں۔"

"آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"اس کا نام خرم جمال ہے۔ آپ کی بیٹی سدرہ سے اس کے افیئرز ہیں۔ آپ تو اسے جانتے ہی ہوں گے۔"

"کسی حد تک جانتا ہوں۔ وہ ایک بے روزگار نوجوان ہے۔ بہت اونچے خواب دیکھ رہا ہے۔ میں نے اپنی بیٹی کو سمجھایا ہے کہ اسے زیادہ منہ نہ لگائے۔ بائی دا وے وہ اس کیس میں کیسے ملوث ہوگیا.........؟"

"ہم بہت اونچے اڑنے والے مجرموں کو نیچے گرا دیتے ہیں۔"

"کیا آپ اس کے ایک شناختی کارڈ کی وجہ سے اس پر شبہ کر رہے ہیں؟ اگرچہ میں اسے پسند نہیں کرتا ہوں' لیکن اس پہلو سے سوچ رہا ہوں کہ کسی نے اس کا شناختی کارڈ وہاں بیڈ روم میں پہنچا دیا ہو گا۔ پتا نہیں کیوں وہ مجھے قاتل نہیں لگتا ہے۔"

"آپ اس کی صورت پر نہ جائیں۔ بعض چالاک نوجوان اوپر سے بھولے بھالے اور اندر سے کالے ہوتے ہیں۔ اس کے خلاف ٹھوس ثبوت مل رہے ہیں۔ میں مزید انکوائری کر رہا ہوں۔"

زرینہ نے کہا۔ "انسپکٹر رحمٰن صاحب! جب میرے بیٹے پر گولی چلی تب آپ وہاں موجود تھے۔ آپ میری رپورٹ درج کریں۔ میرے بیٹے کا مکمل بیان لیں اور بیگم بانو زوجہ رئیس احمد کے خلاف ایف آئی آر لکھیں۔"

عمران نے کہا۔ "میرا زخم گہرا نہیں ہے۔ مرہم پٹی ہوچکی ہے۔ میں آپ کے ساتھ تھانے چل سکتا ہوں۔ آپ ابھی رپورٹ درج کریں۔"

رئیس احمد نے کہا۔ "ذرا ٹھہرو' جلدی نہ کرو۔ تم بھی میرے اپنے ہو اور بیگم اور اس کے بچے بھی میرے اپنے ہیں۔ میرا دماغ بُری طرح الجھ گیا ہے۔ میرے اپنے جتنے بھی

ہیں۔ جان لیوا دشمنی کی انتہا کر رہے ہیں اور میں بے بسی سے تماشا دیکھ رہا ہوں۔"

سرفراز خان نے کہا۔ "آپ دو.......... کے بیچ پس رہے ہیں۔ میرا خیال ہے اس سوتیلوں کا جھگڑا زیادہ دنوں تک نہیں چلے گا۔ خرم جمال غصے میں جھنجلا کر کہہ رہا تھا کہ وہ مجرم ہے۔ جنونی قاتل ہے۔ اگر وہ عدالت میں بھی یہی کہے گا تو پھر قصہ ہی ختم ہوجائے گا۔"

رئیس احمد نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا وہ عدالت میں خود کو جنونی قاتل کہے گا؟ کیا آپ کو یقین ہے؟"

"وہ اقبالِ جرم کرے یا نہ کرے۔ اس کے خلاف کئی ثبوت ہیں۔ وہ ایک بے روزگار ٹیکسی چلانے والا نوجوان ہے لیکن اس ایک ہفتے کے اندر اس کے بینک اکاؤنٹ میں اچانک ہی دو لاکھ روپے کا اضافہ ہوگیا ہے اسے آج یا کل' کبھی نہ کبھی یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ وہ دوسروں سے بھاری رقم وصول کرکے ان کے لئے واردات کرتا ہے پھر یہ کہ جائے واردات پر سدرہ کے بیڈ روم میں اس کا شناختی کارڈ پایا گیا ہے۔ وہ ثابت نہیں کرسکے گا کہ اس کا وہ شناختی کارڈ کہیں گم ہوگیا تھا۔"

اس کے موبائل کا بزر سنائی دیا۔ اس نے اسے آن کرکے کان سے لگایا پھر ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے بیگم بانو کی آواز سنائی دی۔ "مسٹر سرفراز! آپ کیا کر رہے ہیں؟ میرے بیٹے کا قاتل سامنے ہے۔ آزاد گھوم رہا ہے' لیکن آپ اسے گرفتار نہیں کر رہے ہیں۔"

"میڈم! آپ تعلیم یافتہ ہیں۔ قانون کو سمجھتی ہیں۔ اسے عدالت کے ضمانت نامے پر رہا کیا گیا ہے۔ اگر آپ اسے آہنی سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتی ہیں تو آپ عدالت سے اس کا ضمانت نامہ منسوخ کرا دیں۔"

"میرا وکیل کوشش کر رہا ہے اگر وہ کامیاب نہ ہوسکا اور آپ لوگوں نے قاتل کے خلاف کچھ نہیں کیا تو میں خود ہی اپنے بیٹے کے قاتل کو گولی مار دوں گی۔"

"یہ تو آپ کر ہی رہی ہیں۔ عمران زخمی ہو کر اسپتال پہنچا ہوا ہے۔ آپ قانون کو ہاتھ میں لے کر بہت بڑی غلطی کر رہی ہیں۔"

وہ حیرانی سے بولی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے اس سوتیلے کو زخمی کیا ہے؟"

"آپ نے تو مار ڈالنے کی کوشش کی وہ تو خوش قسمتی سے بچ گیا ہے۔"

"آپ میرے خلاف بکواس کر رہے ہیں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے۔"

"آپ ابھی تھوڑی دیر پہلے کہہ چکی ہیں کہ اپنے سوتیلے کو زندہ نہیں چھوڑیں گی۔"

"وہ............ وہ تو............ میں غصے میں کہہ رہی تھی۔"

"آپ لوگوں کا غصہ بھی کیا خوب ہے۔ خرم جمال بھی غصے میں یہی کہتا ہے کہ وہ ایک جنونی قاتل ہے۔ آپ کو اور آپ کی بیٹیوں کو قتل کر دے گا۔ میڈم زرینہ بھی غصے میں اسی طرح دعویٰ کر سکتی ہیں۔ ایک مسٹر رئیس احمد ایسے ہیں کہ چاروں طرف سے مسائل میں اُلجھے ہوئے ہیں پھر بھی غصہ نہیں دکھا رہے ہیں۔ صبر و تحمل سے بدترین حالات کا سامنا کر رہے ہیں۔"

"کیا رئیس احمد اسپتال میں موجود ہیں؟"

"جی ہاں! میں انہیں فون دے رہا ہوں۔ آپ بات کریں۔"

رئیس احمد نے فون کو............ کان سے لگا کر کہا۔ "بیگم! یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم اپنی دولت سے کرائے کے قاتل خرید سکتی ہو۔ میرے بیٹے پر گولیاں چلوا سکتی ہو' لیکن سوچو تمہارا انجام کیا ہوگا؟ تم سب میرے اپنے ہو' سب ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے جائیں گے اور میں تم لوگوں پر فاتحہ پڑھنے کے لئے رہ جاؤں گا۔"

"تم نے دو شادیاں کی ہیں۔ اس کا انجام تمہارے سامنے آ رہا ہے۔ میں موم کی بنی ہوئی نہیں ہوں۔ تمہاری وہ چہیتی اپنے جوان بیٹے کے ذریعے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ اس سے پہلے ہی میں انہیں فنا کر دوں گی۔"

رئیس احمد نے کہا۔ "دراصل تمہیں یقین ہو گیا ہے کہ عمران بے قصور ہے۔ تم اسے عدالت کے ذریعے سزا نہیں دلوا سکو گی۔ اس لئے ایسی مجرمانہ حرکتیں کر رہی ہو۔ میں تھوڑی دیر بعد گھر آؤں گا پھر اس سلسلے میں تم سے نمٹ لوں گا۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ بیگم بانو اپنے بیڈ روم میں یار محمد کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ریسیور رکھ کر اسے گھور کر دیکھا پھر کہا۔ "تم بالکل ہی فضول اور ناکارہ شخص ہو۔ ہمیشہ الٹی حرکتیں کرتے رہتے ہو۔ وہ زندہ ہے اسپتال میں ہے۔ اسے زخمی کرانے کا الزام مجھ پر آ رہا ہے۔"

یار محمد نے کہا۔ "تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ امیر احمد کے قتل کا الزام عمران پر آ رہا

ہے اور اس کا بھی کچھ نہیں بگڑ رہا ہے۔ ہمارے ملک کا قانون اور قانون کے محافظ دونوں ہی کمزور ہیں۔ ان حالات میں قانون کو اپنے ہاتھوں میں لینا پڑتا ہے۔"

بیگم نے کہا۔ "مجھے یہ بات پریشان کرتی ہے کہ رئیس اپنے بیٹے کو سزائے موت سے بچا لے گا اور میں اسے زندہ دیکھوں گی تو زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔ مر جاؤں گی۔"

"مریں گے تمہارے دشمن۔ ہمارا عشق بے مثال ہے۔ ہم دونوں بڑی بڑی رکاوٹوں کو توڑتے اور کچلتے رہے ہیں۔ آج بھی تمام رکاوٹوں کو کچل ڈالیں گے۔ وہ رئیس کیا کہہ رہا تھا؟"

"وہ کیا کہے گا۔ اپنے بیٹے کو الزامات سے بری کرانے کے لئے جی جان سے کوششیں کر رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہاں آنے والا ہے۔ اب تمہیں یہاں سے جانا چاہئے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ مجھے تین لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔"

وہ گھور کر بولی۔ "تم پچھلے ہفتے تین لاکھ لے گئے تھے۔ قسم کھاتے ہو کہ تمہارے اکاؤنٹ میں پچاس ہزار سے زیادہ نہیں ہوں گے پھر اتنی رقم کہاں جاتی ہے؟ کیا کسی دوسرے کے اکاؤنٹ میں جمع کرا رہے ہو؟"

"میں تمہیں ایک ایک بات کھل کر بتانا چاہتا ہوں لیکن تم اپنے ہی معاملات میں بُری طرح اُلجھی رہتی ہو۔ ویسے میں تمہارے لئے ہی یہ رقم خرچ کر رہا ہوں۔ جلد ہی اس کا ایسا زبردست نتیجہ سامنے آئے گا کہ تم خوشی کے مارے مجھ سے لپٹ جاؤ گی۔ آہ اب تو لپٹنے کی عمر گزر چکی ہے۔ بیگم! کبھی تو دل خوش کر دیا کرو۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر الماری کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ "اب ایسی باتیں نہ کرو۔ ایک تو بچے جوان ہو گئے ہیں۔ پھر اس رئیس نے اور اس کے سوتیلوں نے میری زندگی عذاب بنا دی ہے۔"

اس نے الماری کھول کر بڑے بڑے روپوں کی تین گڈیاں نکالیں۔ الماری کو بند کیا پھر اس کے پاس آ کر اسے وہ رقم دیتے ہوئے بولی۔ "جس دن تم میرے بیٹے کے قاتلوں کو عدالت سے سزائے موت دلاؤ گے یا اپنے آدمیوں کے ذریعے انہیں سزائے موت دو گے۔ اس روز میں تمہیں مالا مال بھی کروں گی اور تمہارے ساتھ ہنی مون کے لئے بھی کہیں جاؤں گی۔"

وہ رقم لے کر وہاں سے چلا گیا۔ رئیس احمد نے وہ سارا دن ز[illegible] اور ا[illegible]
بیٹے کے ساتھ گزارہ تھا۔ پھر اپنے وکیل اور سرفراز سے ملاقاتیں کرتا رہا تھا۔ رات کو بڑی
دیر سے گھر واپس آیا' آتے ہی بیگم بانو پر برس پڑا۔ "تم کیا سمجھتی ہو۔ جسے تقدیر نہ مارے
کیا اسے تم مار سکتی ہو؟"

"میں جانتی تھی۔ تم باہر سے پی کر آؤ گے اور مجھ سے خواہ مخواہ جھگڑا کرو گے۔ میں
نے کسی زر خرید بندے کے ذریعے تمہارے بیٹے پر گولی نہیں چلوائی ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ امیر بھی میرا تھا۔ عمران بھی میرا ہے۔ تم نے تو ایک بیٹا کھویا
ہے۔ عمران کو کچھ ہو جائے گا تو میں دونوں بیٹوں سے محروم ہو جاؤں گا۔ میں تمہیں کیسے
یقین دلاؤں کہ عمران نے امیر کو قتل نہیں کیا تھا' اس کا قاتل وہ دو کوڑی کا بے روزگار
نوجوان خرم ہے۔"

"میں نے سنا ہے۔ سدرہ نے مجھے بتایا ہے کہ خرم کو حوالات میں رکھا گیا ہے لیکن
سدرہ کشمکش میں ہے۔ وہ اسے مجرم نہیں سمجھ رہی ہے۔"

"عاشق کو مجرم کیسے سمجھے گی اور تم بھی سوتیلے کی موجودگی میں خرم کو نظر انداز کر
رہی ہو یا پھر یقین ہو گیا ہے کہ خرم قاتل ہے۔ عمران بے قصور ہے مگر سوتیلا ہے۔ تمہیں
زہر لگ رہا ہے۔ اس گھر میں جوان بیٹا نہیں رہا۔ اس لئے تم میرے دوسرے گھر میں بھی
جوان بیٹے کا وجود برداشت نہیں کر رہی ہو۔"

"تم خواہ مخواہ میرے بارے میں ایسی باتیں سوچ رہے ہو۔ اگر عدالت میں خرم
قاتل ثابت ہو گا تو میں اس سوتیلے سے دشمنی نہیں رکھوں گی مگر سوکن سے دوستی بھی
نہیں کروں گی۔"

"تم بولتی کچھ اور ہو اور کرتی کچھ اور۔ عدالتی فیصلے کا انتظار نہیں کر رہی ہو۔ اس
سے پہلے ہی میرے بیٹے پر قاتلانہ حملے کرا رہی ہو۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کرایا ہے۔ کیا میں قسم کھاؤں گی تو یقین کرو گے؟"

"نہیں جھوٹوں کی قسمیں بھی جھوٹی ہوتی ہیں۔ میں نے شادی کے پہلے دن سے
اب تک تمہیں قابل اعتماد نہیں سمجھا ہے اور نہ ہی سمجھوں گا۔"

وہ غصے سے چیخنے لگی۔ "ہاں میں قابل اعتماد نہیں ہوں۔ جھوٹی ہوں' مکار ہوں۔ و
تم کون سے پارسا ہو۔ تم شادی شدہ تھے۔ تم نے میرے باپ کو دھوکا دے کر خود کو کنوارا

ظاہر کر کے مجھ سے شادی کی۔ تم سے بڑا کامیاب جواری کوئی نہیں ہے۔ تم نے میرے
باپ کی عاقبت نااندیشی سے فائدہ اٹھا کر تمام دولت جائیداد اور کاروبار جیت لیا ہے۔"

"تم اتنی رات کو حلق پھاڑ کر کیوں چلا رہی ہو؟ اتنی زور زور سے چلاؤ گی تو تمہارا
باپ قبر میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے گا۔ مجھے جھوٹا اور مکار کہتے وقت یہ بھی یاد رکھو کہ میں نے
تمہارے باپ کے کاروبار کو اور زیادہ بڑھایا ہے اور پھیلایا ہے۔ پہلے سے کئی گنا زیادہ منافع
حاصل ہو رہا ہے۔ یہ منافع تمہیں اور تمہاری اولاد کو مل رہا ہے۔"

"اور میرے سوتیلوں کو بھی مل رہا ہے۔"

"اس کاروبار میں میرا جو حصہ ہے۔ میں صرف اسی حصے کا منافع عمران کو اور اس کی
ماں کو دیتا ہوں۔ اگر بے ایمان ہوتا تو بہت پہلے ہی تمہیں اس کاروبار کے منافع سے دودھ
کی مکھی کی طرح نکال پھینکتا۔"

شہلا اور سدرہ اپنے بنگلے میں تھیں مگر اپنی ممی اور ڈیڈی کے لڑنے جھگڑنے اور
چیخنے چلانے کی آوازیں سن رہی تھیں۔

شہلا نے کہا۔ "ان کے جھگڑے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ جاہل' ان پڑھ اور گنوار
لوگوں کی طرح چیختے چلاتے رہتے ہیں۔"

سدرہ نے کہا۔ "جب تک اس سوتیلے عمران کو عدالت سے سزا نہیں ملے گی تب
تک ممی کو دماغی سکون حاصل نہیں ہو گا۔"

شہلا نے کہا۔ "تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ خُرم قاتل نہیں ہے۔ سزا عمران کو ملنا
چاہئے۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "میں تمہیں دل کی بات بتا چکی ہوں۔ دل اسے مجرم نہیں مان
رہا ہے۔"

"دل سے نہیں دماغ سے سوچو۔ اس جیسے کنگال کو اپنے باپ کے علاج کے لئے
سات لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ یہ رقم وہ کبھی خواب میں بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا
لیکن یہی رقم اسے قسطوں میں مل رہی ہے۔ اس نے امیر کو قتل کیا۔ اس کے اکاؤنٹ میں
دو لاکھ پہنچ گئے اگر تمہیں قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اسے اور دو لاکھ مل جاتے۔
تمہارے بعد میری باری آتی۔"

"مجھ سے پہلے تمہاری باری آنے والی تھی۔ وہ پچھلی بار پہلے تمہارے کمرے میں آیا

تھا مگر اس نے تمہیں قتل نہیں کیا۔ تمہاری عزت لوٹ کر مجھے قتل کرنے آیا تھا۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس نے تمہیں قتل کیوں نہیں کیا؟ جبکہ ہماری طرح تم بھی سوتیلی ہو؟"

"میں بھی اکثر یہی سوچتی ہوں کہ اس نے مجھے قتل کیوں نہیں کیا۔ مجھے نوچ کھسوٹ کر چلا گیا۔ جاتے جاتے کہہ گیا کہ مجھ میں بلا کی کشش ہے وہ پھر کبھی آئے گا۔ میں یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ اس کے لباس میں سے اس کا شناختی کارڈ گر پڑا تھا۔ اس حوالے سے وہ خرم ہے۔ وہ قاتل بھی ہے اور دوغلا عاشق بھی ہے۔ تم سے عشق کرتا ہے مگر میری عزت سے کھیل کر گیا ہے۔"

سدرہ نے کہا۔ "میں کبھی یقین نہیں کروں گی کہ خرم دوغلا ہے۔ نہیں شہلا! وہ بدنیت نہیں ہے۔ کئی بار تنہائیوں میں اسے موقع ملتا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے محبت کی' میرا ہاتھ پکڑا مگر اخلاق اور تہذیب سے گری ہوئی کوئی حرکت نہیں کی۔ وہ بہت خود دار ہے۔ اس نے کبھی مجھ سے باپ کی بیماری کا ذکر نہیں کیا۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ میں علاج کے لئے لاکھوں روپے دے سکتی ہوں اور وہ مجھ سے لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی کئی ایسی باتیں ہیں۔ کئی اچھے طور طریقے ہیں جو مجھے اس کی حمایت میں سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔"

شہلا نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "جب عشق کا بھوت سر پر سوار ہو جاتا ہے تو ہر طرف عاشق ہی عاشق دکھائی دیتا ہے۔ اس کی خامیوں میں بھی خوبیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ وہ تمہارا کتنا اچھا اور سچا عاشق ہے۔ اب رات ہو چکی ہے۔ مجھے سونے دو۔ اپنے بیڈ روم میں جاؤ۔"

شہلا نے اسے کِس کیا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ وارڈ روب سے سونے کے لئے ایک لباس نکال کر چینج کرنے لگی۔ ایسے وقت فون کا بزر سنائی دیا پھر اس نے کارڈلیس آن کرتے ہوئے کہا۔ "ہیلو!"

دوسری طرف سے ایک بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "سوتیلوں کو اس دنیا میں نہیں رہنا چاہئے۔ بڑی نصیب والی ہو۔ پہلے حملے سے بچ گئی تھیں۔ آج نہیں بچ سکو گی۔ ذرا پیچھے پلٹ کر دیکھو۔"

اس نے اجنبی کی آواز سنتے ہی بڑی آہستگی سے لباس میں ہاتھ ڈال کر پستول نکال لیا

تھا۔ یہ یقین کر چکی تھی کہ پستول پوری طرح لوڈ ہے۔ فون پر اسے پلٹ کر دیکھنے کے لئے کہا گیا۔ وہ ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر پھسل کر زمین پر گر پڑی۔ زمین پر کروٹ بدل کر کسی کو دیکھے سمجھے بغیر گولی چلادی۔ اس طرح وہ حملے سے پہلے جوابی حملہ کر کے اس قاتل کو اپنے بچاؤ کی فکر میں مبتلا کر چکی تھی۔ دوسری طرف اس نے فائرنگ کی آواز کے ذریعے دور تک یہ اطلاع پہنچائی تھی کہ وہ خطرے میں ہے۔

کبھی کبھی اناڑی پن سے کیا ہوا حملہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ قاتل اس کے پیچھے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سدرہ پہلے گر کر اپنا بچاؤ کرے گی پھر اس پر گولی بھی چلائے گی۔ گولی اس کے بازو پر لگی تھی ریوالور اس کے ساتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ وہ اسے جھک کر اٹھانا چاہتا تھا۔ دوسری گولی اس کے قدموں کے پاس آئی ادھر کا قالین ذرا سا ادھڑ گیا۔ وہ ایک دم سے بوکھلا گیا۔

وہ یہ سمجھ گیا کہ اپنا ریوالور نہیں اٹھا سکے گا۔ وہ چھلانگ لگا کر بیڈ کے اوپر آیا پھر وہاں سے چھلانگ لگا کر دروازے کی طرف جانا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت تیسری گولی اس کی پسلیوں میں آکر لگی۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ وہ بیڈ پر سے اچھل کر نیچے قالین پر گر پڑا۔

تین بار فائرنگ کی آوازیں گونجتی ہوئی دور تک گئی تھیں۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ رئیس احمد' بیگم اور دو گن مین دوڑتے ہوئے ادھر آئے۔ شہلا خوفزدہ ہو کر بنگلے سے باہر آگئی تھی۔ ماں باپ کو دیکھ کر بولی۔ "سدرہ کے بیڈ روم میں فائرنگ ہو رہی ہے۔"

دونوں گن مین للکارتے ہوئے اندر آئے۔ "خبردار یہاں جو بھی ہے وہ اپنا ہتھیار پھینک دے۔ ہم اسے زندہ نہیں جانے دیں گے۔"

سدرہ کی آواز سنائی دی۔ "یہاں گولی نہ چلانا۔ اس قاتل کو میں نے گولی مار دی ہے۔ یہاں چلے آؤ۔"

اس کی باتیں سنتے ہی بیگم' رئیس احمد اور شہلا بھی دوڑتے ہوئے اندر آئے۔ بیڈ روم میں ایک نقاب پوش قالین پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اس کے بازو اور اس کی پسلیوں سے لہو بہہ رہا تھا۔ سدرہ اب تک اسے نشانے پر رکھے ہوئے تھی اور کہہ رہی تھی۔ "یہ زندہ ہے۔ پولیس کو فون کریں۔"

رئیس احمد نے کہا۔ "بیگم! تم سرفراز کو اطلاع دو۔ فوراً یہاں بلاؤ۔"

پھر اس نے ایک گن مین سے کہا۔ "آگے جاؤ اس کے چہرے کا نقاب اٹھاؤ۔ بیگم فون کرتی رہو اور ادھر بھی دیکھتی رہو۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ میرا بیٹا عمران نہیں ہے۔"

وہ فون پر سرفراز کو اطلاع دے رہی تھی۔ "میری بیٹی سدرہ نے آج اس قاتل کو گولی مار دی ہے۔ وہ یہاں بیڈ روم میں زخمی پڑا ہے۔ اگر اسے اسپتال نہ پہنچایا گیا تو یہ مر جائے گا۔ آپ فوراً یہاں کارروائی کے لئے آجائیں۔ ہم قاتل کے چہرے سے نقاب ہٹا رہے ہیں۔"

دوسری طرف سے سرفراز نے پوچھا۔ "جب نقاب ہٹایا جارہا ہے تو مجھے بتاؤ وہ کون ہے؟"

اس گن مین نے نائیلون کی جراب والا نقاب ہٹادیا تھا۔ اس قاتل کا چہرہ دیکھتے ہی سب دنگ رہ گئے۔ وہ نہ تو عمران تھا اور نہ ہی خرم تھا۔ وہ اسد تھا۔ شہلا کا محبوب اور اس کا منگیتر تھا۔ بیگم نے فون پر کہا۔ "مائی گاڈ! ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ اسد ہے میرا ہونے والا داماد۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ سدرہ پر جیسے دیوانگی طاری ہوگئی تھی۔ وہ خوشی سے رو رہی تھی اور چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ "دیکھیں! آپ سب دیکھیں۔ میرا دل شروع سے کہتا تھا کہ خرم بے قصور ہے مگر یہ اسد اسے بری طرح قتل کے الزام میں پھنسا رہا تھا۔ یہ ہمیشہ خرم سے ملتا رہتا تھا۔ اس نے اس کا شناختی کارڈ چرایا تھا اور اس کارڈ کو یہاں چھوڑ گیا تھا۔ میرا خرم بے گناہ ہے۔ بے قصور ہے۔"

رئیس نے تھپکتے ہوئے کہا۔ "چپ ہو جاؤ۔ تمہاری طرح میری بھی خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ میرے بیٹے پر اب کسی طرح کا الزام نہیں آئے گا۔ اب تمہاری ماں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ شہلا کا رشتہ ایک لالچی خاندان میں کرایا گیا ہے۔"

شہلا دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی اور رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "یا خدا! ایک بار اسد نے باتوں ہی باتوں میں کہا تھا اگر میں اپنے باپ کی ایک ہی بیٹی ہوتی۔ میری کوئی بہن کوئی بھائی نہ ہوتا تو ساری دولت' جائیداد اور کاروبار صرف ہمارے حصے میں آتے۔ میں نے اسے ڈانٹ دیا تھا پھر اس نے ایسی بات نہیں کی تھی۔ بات نہ کرنے

سے کیا ہوتا ہے۔ وہ عملی طور پر میرے ایک بھائی کو مٹا چکا تھا اور دوسری بہن کو مٹانے آیا تھا۔ داماد بننے سے پہلے ہی تمام کاروبار کا مالک بننے کے راستے ہموار کر رہا تھا۔"

بیگم نے کہا۔ "اس دنیا میں کس پر بھروسا کیا جائے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اسد اس قدر لالچی ہوگا۔ اب یہ کمینہ اسپتال پہنچ کر زندہ رہے گا تب بھی میں اسے زندہ نہیں رہنے دوں گی۔ اسے عدالت سے سزائے موت ضرور ملے گی۔"

سدرہ نے کہا۔ "ڈیڈی! جہنم میں گیا اسد۔ آپ ابھی اپنے وکیل کو فون کریں۔ وہ کل صبح کوٹ سے خرم کی رہائی کے لئے ضمانت نامہ لے کر آئے گا۔ اب میں اسے حوالات میں نہیں رہنے دوں گی۔"

رئیس احمد اگرچہ خرم کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن اپنے بیٹے عمران سے الزام ختم ہو رہا تھا۔ اس خوشی میں اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میرے بیٹے کی طرح وہ بھی بے گناہ ہے۔ کل اس کی ضمانت ہو جائے گی۔"

سرفراز خان اپنے ماتحتوں کے ساتھ وہاں آگیا تھا۔ اس نے اسد کو فوراً ہی اسپتال پہنچایا۔ اس کی حالت بہت ہی نازک تھی۔ اسے فوراً آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ ایک گولی اس کی پسلی کے پاس پیوست ہوگئی تھی۔ اسے آپریشن کے ذریعے نکالنا ضروری تھا۔ اس کا خون بہت بہہ چکا تھا۔ آپریشن مشکل مگر ناممکن نہیں تھا۔

اسد کے ماں باپ اور دوسرے رشتے دار اس اسپتال میں آئے تھے۔ بیگم نے اسد کے والدین کو دیکھتے ہی غصے سے کہا۔ "کیا یہاں سے بیٹے کی لاش لے جانے آئے ہو؟"

اسد کے باپ نے کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ ہمارا جوان بیٹا آپریشن تھیٹر میں ہے۔ اپنی موت سے لڑ رہا ہے۔ آپ سب کو اس کے لئے دعا کرنی چاہئے لیکن آپ کے تیور بدل گئے ہیں۔"

"اس لئے تیور بدل گئے ہیں کہ تم سب کی اصلیت سامنے آگئی ہے۔ تمہارے بیٹے نے ہمارے بیٹے امیر احمد کو قتل کیا تھا۔"

اسد کی ماں نے کہا۔ "یہ جھوٹ ہے۔"

"یہاں انٹیلی جینس کے جاسوس اور پولیس والے بیٹھے ہیں۔ تمہارے بیٹے کو جائے واردات پر زخمی کر کے گرفتار کیا گیا ہے۔ جب یہ ہوش میں آکر بیان دے گا کہ یہ میرے بیٹے کو اور بیٹی سدرہ کو ہلاک کرنے کے بعد ہمارا اکلوتا داماد بننا چاہتا تھا اور پورے کاروبار کا

مالک بنا چاہتا تھا تب تمہیں یقین آئے گا۔ تم سب لالچی کتے ہو۔"

اسد کے باپ نے کہا۔ "آپ ہمیں گالی نہ دیں۔ ہم آپ سے زیادہ عزت دار لوگ ہیں۔ ہم بھی پلٹ کر گالیاں دے سکتے ہیں۔"

سرفراز خان نے کہا۔ "تم گالیاں دو گے تو تمہیں قانون کے جوتے پڑیں گے۔ تمہارے بیٹے نے امیر احمد کو قتل کیا ہے اور سدرہ پر دو بار قاتلانہ حملے کر چکا ہے۔ دوسری بار جائے واردات پر اسے گرفتار کیا گیا ہے۔ اس کے خلاف ٹھوس ثبوت اور گواہ موجود ہیں۔"

"ہمارے بیٹے کے خلاف سازش ہو سکتی ہے۔ میں آپریشن کے بعد اس سے ملوں گا پھر اس سے حقیقت معلوم کروں گا۔"

سرفراز نے کہا۔ "سوری! جب تک ہم اس سے مکمل بیان نہیں لیں گے۔ تب تک کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ آپ یہاں بھیڑ نہ لگائیں۔ میرا حکم ہے یہاں سے چلے جائیں۔"

"ہم اپنے بیٹے کو ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ اسپتال کے باہر کھڑے رہیں گے۔"

سرفراز نے بیگم اور رئیس احمد سے کہا۔ "رات کے دو بج چکے ہیں۔ آپ لوگوں کو بھی جانا چاہئے۔ جائیں آرام کریں۔ یہ اب ہماری دردسری ہے۔"

وہ بھی اسپتال سے باہر آگئے اور اس کے والدین کو حقارت سے دیکھتے ہوئے اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر چلے گئے۔ رئیس احمد تشویش میں مبتلا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ پتا نہیں اسد اپنے بچاؤ کے لئے کیا بیان دے گا۔ ویسے اس کا جو بھی بیان ہو گا وہ اس بات سے کبھی انکار کر ہی نہیں سکتا تھا کہ سدرہ پر قاتلانہ حملہ کرنے کے لئے اس کے بیڈ روم میں آیا تھا۔

آپریشن کے ذریعے اس کی پسلیوں سے گولی نکال دی گئی تھی۔ وہ بچ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "اسے صبح تک ہوش آسکتا ہے لیکن جب تک مریض بہتر حال میں نہیں ہو گا۔ ہم بیان لینے کی اجازت نہیں دیں گے۔ پلیز آپ پولیس والوں کو یہاں سے ہٹادیں۔ اسپتال میں ان کی موجودگی مناسب نہیں ہے۔"

سرفراز نے اپنے ماتحت سے کہا۔ "تم ایک مسلح سپاہی کے ساتھ یہاں صبح تک ڈیوٹی

پر رہو گے اور اسد کے کسی بھی رشتے دار کو اس کے کمرے میں جانے نہیں دو گے۔ میں گھر جا کر ذرا نیند پوری کروں گا۔ یہاں کوئی مسئلہ پیدا ہو تو فوراً ہی موبائل پر مجھ سے رابطہ کرو۔ میں کسی بھی مسئلے سے نمٹنے کے لئے تیار رہوں گا۔"

وہ اپنے ماتحت کو ہدایات دے کر چلا گیا۔ دوسرے سپاہیوں کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ رئیس احمد' بیگم اور شہلا ایک آدھ گھنٹے کے وقفے سے فون کر رہی تھیں۔ سرفراز نے کہہ دیا تھا کہ اس کے موبائل پر رابطہ نہ کیا جائے۔ اس کا ماتحت اسپتال میں ہے۔ اس سے رابطہ کیا جائے۔ وہ صحیح صورتِ حال بتاتا رہے گا۔

اس کے ماتحت نے انہیں بتا دیا تھا کہ صبح سے پہلے اسے ہوش نہیں آئے گا۔ اس کے ماں باپ کو اور رشتے داروں کو پولیس والوں نے بھگا دیا ہے۔ وہ بھی اس کی خیریت معلوم کرنے کے لئے صبح آئیں گے۔"

وہ ماتحت فون اٹینڈ کرتے کرتے پریشان ہو گیا تھا۔ صبح پانچ بجے تک اسے ذرا سکون نصیب ہوا۔ سب ہی کی تسلی ہو گئی تھی کہ جب اسے ہوش آئے گا اور جب تک سرفراز اس سے بیان نہیں لے گا تب تک کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ کوئی اس کے کمرے میں قدم نہیں رکھ سکے گا۔

لیکن ٹھیک پانچ بج کر چھ منٹ پر شہلا نے اس کے کمرے میں قدم رکھا۔ اسے ہوش آگیا تھا۔ اس کی ناک اور منہ پر ایک چھوٹا سا پلاسٹک گیس ماسک چڑھا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں کھولے اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ شہلا اندر آئی تو اسے دیکھ کر اس نے اپنی آنکھوں سے اطمینان کا اظہار کیا۔ وہ بول نہیں سکتا تھا لیکن کانوں سے سن سکتا تھا اور آنکھوں سے اظہار کر سکتا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے دائیں طرف آئی۔ اس نے دائیں طرف دیدے گھما کر دیکھا اور بولی۔ "میں تمہارے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ بولو' پولیس کو کیا بیان دو گے؟"

وہ اسے بے بسی سے دیکھنے لگا۔ وہ جو کہنا چاہتا تھا' اسے شہلا سمجھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ "شہلا! تم نے مجھے ڈبو ہی دیا ہے۔ مجھ سے اسی شرط پر شادی کے لئے راضی ہوئی تھیں کہ میں تمہارے سوتیلے بھائی امیر احمد اور سوتیلی بہن سدرہ کو قتل کروں گا۔ تم اپنی ماں کی دولت میں سے سوتیلوں کو حصہ نہیں دینا چاہتی تھیں مگر اب

کیا ہو گا؟"

وہ بولی۔ "تمہاری زبان ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گی تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ سب یہی سمجھ رہے ہیں کہ تم میرے مجازی خدا بننے سے پہلے تمام کاروبار کے مالک بننا چاہتے تھے۔ تم لالچی تھے۔ اپنی موت کے بعد بھی لالچی اور خود غرض سمجھے جاؤ گے۔"

اس نے اپنے پرس کو کھول کر اس میں سے ایک ریوالور نکالا۔ پھر ایک سائیلنسر نکال کر ریوالور سے منسلک کرنے لگی۔ اسد سہم کر دیکھنے لگا۔ بستر پر کسمسانے لگا۔ وہ بول رہی تھی۔ "تم اناڑی ہو۔ تم نے سدرہ پر دو حملے کئے مگر ایک بار بھی اس پر حاوی نہ ہو سکے۔ میں نے بتایا تھا کہ وہ مارشل آرٹ کی کھلاڑی ہے لیکن تم یہ بھول گئے تھے۔"

اس نے ریوالور سے اس کا نشانہ لیا۔ اس کے پیچھے سرفراز دبے قدموں آ رہا تھا۔ اس نے گولی چلنے سے پہلے ہی ریوالور والا ہاتھ پکڑ کر اوپر اٹھا دیا۔ گولی سامنے دیوار پر جا کر لگی۔ وہ سرفراز کو دیکھتے ہی اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ شاید وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

سرفراز نے اس سے ریوالور چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اسے پھینک دو۔ ورنہ پھر گولی چل جائے گی۔"

وہ غصے سے کہہ رہی تھی۔ "چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ میرے خلاف جتنے ثبوت اور گواہ ہیں میں ان سب کو ختم کر دوں گی۔"

ان دونوں کی جدوجہد کے دوران میں ریوالور دائیں سے بائیں اور اوپر سے نیچے ہو رہا تھا۔ سرفراز اس ہتھیار کو اس سے چھین نہیں پا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت پھر گولی چل پڑی۔ اس کے حلق سے ایک آخری چیخ نکلی پھر دوسرے ہی لمحے اس کا دم نکل گیا۔

سرفراز نے الٹا ہاتھ شہلا کے منہ پر رسید کیا۔ اس کے بھی حلق سے چیخ نکلی۔ ایک ہاتھ پڑنے سے چیخ نہیں نکلی تھی بلکہ اسے بھی گولی لگی تھی۔ اس کے سینے سے لہو بہہ رہا تھا۔ اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ چکرا کر فرش پر گر پڑی پھر ذرا دیر تڑپ کر ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گئی۔ وہ سوتیلوں کو ختم کرنے والی خود ختم ہو گئی۔

سرفراز نے حیرانی سے ریوالور کو دیکھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ ریوالور کا رخ شہلا کی طرف نہیں تھا۔ پھر اس کے سینے میں گولی کیسے پیوست ہو گئی؟ چند سیکنڈ بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ اس کمرے کے باہر سے کسی نے گولی چلائی تھی۔ وہ

دوڑتا ہوا کمرے کے باہر آیا۔ ایک ماتحت نے کہا۔ "سر! ادھر کھڑکی کے پاس کوئی تھا۔ ہمارے آدمی اس کے پیچھے گئے ہیں۔"

"وہ کون تھا؟ تم اس کے پیچھے کیوں نہیں گے؟"

"سر! میں اس کی صورت نہیں دیکھ پایا۔ ہمارے بہترین آدمی اس کے پیچھے گئے ہیں۔ اسے بھاگنے نہیں دیں گے۔ آپ نے مجھے یہاں ڈیوٹی پر رہنے کا حکم دیا تھا۔ میں اسد اور شہلا کے رشتے داروں کو یہاں آنے سے روک رہا ہوں۔ وہ بار بار آ رہے ہیں۔ اسد سے ملنے کی ضد کر رہے ہیں۔"

سرفراز فون کے ذریعے اپنے اعلیٰ افسران کو اسد اور شہلا کے قتل کے سلسلے میں رپورٹ دینے لگا۔ سرفراز قریبی تھانے سے مزید مسلح سپاہیوں کو بلا رہا تھا۔ رشتے داروں کو کنٹرول کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ اسد اور شہلا بے موت مارے گئے ہیں اور شہلا ہی اپنی اور اسد کی موت کی ذمے دار ہے۔

ان دونوں کے والدین ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ ان کے قتل کے الزامات ایک دوسرے پر عائد کر رہے تھے۔ ان سب کو پھر اسپتال سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ سرفراز کے دو ماتحت یار محمد کو پکڑ کر لے آئے۔ "سر! یہ اسپتال کے ایک پچھلے دروازے سے بھاگ رہا تھا۔"

سرفراز نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

"میں مسز رئیس احمد کا کزن ہوں۔ شہلا میری بھتیجی تھی۔ میں نے ایک شخص کو ریوالور لئے بھاگتے دیکھا تو اسے للکارتے ہوئے اس کا تعاقب کرنے لگا۔ وہ ایک کھڑکی سے چھلانگ لگا کر باہر کود گیا۔ میں اس عمر میں اتنی اونچائی سے کود نہیں سکتا تھا۔ زینے سے اتر کر پچھلے دروازے سے جانے لگا تو آپ کے آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ میں ان سے کہتا آ رہا ہوں کہ مجھے چھوڑ دو' قاتل کے پیچھے جاؤ لیکن یہ مجھے قاتل سمجھ رہے ہیں۔"

سرفراز نے یار محمد سے کہا۔ "میں نے تمہیں مسٹر رئیس احمد کی کوٹھی میں دیکھا ہے۔ تم صورت سے ہی مکار دکھائی دیتے ہو۔"

"یہ صورت اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ کیا اس کی تلاشی لی گئی ہے؟"

"یس سر! اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔"

یار محمد نے کہا۔ "پنسل چھیلنے والا چاقو ہے۔ آپ کے آدمیوں نے یہ ہتھیار مجھے واپس کر دیا ہے۔"

سرفراز نے اسے گھور کر دیکھا پھر کہا۔ "اسے حراست میں رکھو۔ میں بعد میں اس سے نمٹ لوں گا۔"

اسپتال کے باہر بیگم' رئیس احمد اور اسد کے والدین کھڑے ہوئے تھے۔ بیگم اپنی بیٹی پر رو رہی تھی۔ رئیس احمد خوش تھا۔ سوتیلوں کی حقیقت سامنے آگئی تھی۔ سوتیلا صرف عمران نہیں تھا۔ شہلا بھی سوتیلی تھی۔ اس نے اپنے سوتیلے بھائی امیر احمد کو قتل کرایا تھا۔ اس کے بعد سدرہ کو بھی اسد کے ذریعے قتل کرانا چاہتی تھی مگر خود ہی اپنے برے انجام کو پہنچ گئی اور عمران کو شبہات سے بالاتر کر دیا تھا۔ اب اس سوتیلے پر الزام نہیں آسکتا تھا۔

☆======☆======☆

وہاں سے بہت دور سرفراز کے دفتر میں فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ ایک ماتحت نے ریسیور اٹھا کر پوچھا۔ "ہیلو۔ کون؟"

کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ "میں خرم کی ایک عزیزہ ہوں۔ پلیز اس سے بات کرا دیں۔"

"آپ ہولڈ کریں۔ ابھی بات کراتا ہوں۔"

وہ ریسیور رکھ کر آہنی سلاخوں کے پاس آیا۔ ایک سپاہی کو دروازہ کھولنے کا حکم دیا' پھر خرم سے بولا۔ "تمہاری ملاقات آئی ہے۔ فون پر۔ باہر آؤ............"

سلاخوں والا آہنی دروازہ کھل گیا۔ خرم نے پوچھا۔ "کس کا فون ہے؟"

"اس نے نام نہیں بتایا ہے۔ شاید وہی ہوگی' جو تم سے یہاں ملنے آئی تھی۔"

خرم کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ دل نے کہا۔ "سدرہ نے یاد کیا ہے۔ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ نفرت ظاہر کر کے گئی ہے مگر دل سے مجبور ہو کر فون پر اپنی آواز سنا رہی ہے۔"

اس نے میز کے پاس آکر ریسیور اٹھایا پھر کہا۔ "ہیلو' میں بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے اپنی جانِ حیات کی آواز سنائی نہیں دی۔ ایک مردانہ بھاری بھرکم آواز نے کہا۔ "میں وائس چینجر سے بول رہی ہوں' بول رہا ہوں۔ تم بہت اچھے جا رہے ہو۔ تمہارے بینک اکاؤنٹ میں مزید دو لاکھ روپے جمع کئے جا رہے ہیں۔"

اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے چور نظروں سے سرفراز کے ماتحت کو دیکھا۔ فون پر جو کچھ کہا جا رہا تھا' وہ اس کا جواب کسی کے سامنے نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تم ضرور ملو گے لیکن مناسب وقت پر۔ میری حکمت عملی دیکھو' میں نے شہلا کو ہلاکت سے پہلے تمہیں حوالات میں بند کرادیا۔ آئندہ واردات کرو گے تو کوئی تم پر شبہ

نہیں کرے گا۔"

خرم کوئی سخت بات کہنا چاہتا تھا مگر اس نے ماتحت کو دیکھ کر سختی سے ہونٹوں کو بھینچ لیا پھر کہا۔ "مجھ پر اتنے مہربان ہو تو مجھے یہاں سے رہائی نہیں دلا سکتے؟ میری ضمانت نہیں لے سکتے۔"

"ضمانت لینے کے لئے مجھے سامنے آنا ہوگا اور میں آ نہیں سکتا۔ صبر کرو۔ پچھلی تمام واردات کا الزام شہلا اور اسد پر درست ثابت ہوا ہے۔ اب سدرہ تم پر شبہ نہیں کرے گی۔ وہ بڑی محبت سے تمہاری ضمانت کے لئے آئے گی۔"

وہ بڑی بے بسی سے بولا۔ "میں مجبور ہوں۔ یہاں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دے سکوں گا۔"

"میں تمہیں ایک بات سمجھاتا ہوں۔ محبت کے معاملے میں مجبور نہ ہونا۔ سدرہ کی محبت جوش مارے تو یہ نہ بھولنا کہ بیمار باپ کو لندن لے جانا ہے۔ اگلے ماہ کی دس تاریخ کو آپریشن ہے اور تمہیں سات لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ زبان بند رکھو اور عقل مندی کا ثبوت دیتے رہو۔"

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ اس نے ہیلو ہیلو کہہ کر مخاطب کیا پھر جواب نہ پاکر ریسیور رکھ دیا۔ سرفراز کے ماتحت نے پوچھا۔ "کس کا فون تھا؟ پہلے میں نے فون اٹینڈ کیا تھا۔ کسی لڑکی کی آواز سنائی دی تھی۔ تمہاری باتوں سے پتا چل رہا تھا' کسی مرد سے بول رہے ہو؟"

"تمہارے نصیب میں لڑکی تھی۔ میرے نصیب میں لڑکی کا باپ تھا۔"

"کیا کہہ رہا تھا؟"

"کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا۔ ٹیلی فون کہنے اور سننے کے لئے ہوتا ہے۔"

"تم نہیں بتانا چاہتے کوئی بات نہیں' اس فون پر جتنی کالیں آتی ہیں' وہ سب ریکارڈ کی جاتی ہیں۔ سرفراز صاحب آئیں گے تو تم سے ہونے والی تمام گفتگو سن لیں گے۔"

وہ پریشان ہو کر اس ماتحت کو دیکھنے لگا۔ یہ بات سرفراز کو معلوم ہونے والی تھی کہ وہ کسی سے لاکھوں روپے لے کر واردات کیا کرتا ہے اگر وہ قسمیں کھا کر کہتا ہے کہ وہ مجرم نہیں ہے۔ واردات نہیں کرتا ہے' تب بھی اس کی قسموں کے باوجود کوئی اس کی باتوں کا یقین نہ کرتا۔

ماتحت نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "حوالات میں چلو۔"

وہ ناگواری سے بولا۔ "ہاتھ نہ لگاؤ۔ میں کوئی مجرم نہیں ہوں۔ مجھے فون پر معلوم ہوا ہے' شہلا اور اسد پر الزامات ثابت ہو چکے ہیں۔ انہوں نے امیر احمد کو قتل کیا تھا۔ مجھ سے مجرموں جیسا سلوک نہ کرو۔"

"ہمارے صاحب ہم سے زیادہ سمجھتے ہیں کہ تم سے کیسا سلوک کرنا چاہئے۔ انہیں آنے تو دو۔ وہ تو بچ نکلنے والے ملزموں کو بھی مجرم ثابت کر دیتے ہیں۔"

وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے آگیا۔ سلاخوں والے دروازے کو مقفل کر دیا گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سلاخوں کو تھام کر پریشانی سے سوچنے لگا۔ وہ فون کرنے والا مہربان ہے۔ لاکھوں روپے دے رہا ہے لیکن مجھے بری طرح پھنسا رہا ہے۔ ابو کا علاج ہو جائے گا۔ انہیں نئی زندگی ملے گی لیکن وہ مجھے موت کی طرف دھکیل رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد یار محمد کو ہتھکڑیاں پہنا کر لایا گیا۔ سرفراز کے دفتر کے ساتھ ایک ہی حوالاتی کمرہ تھا۔ لہٰذا یار محمد کو خرم کے ساتھ لاک کر دیا گیا۔ خرم نے اسے دیکھ کر کہا۔ "میں نے تمہیں سدرہ کی کوٹھی میں دیکھا ہے۔ یاد ہے تم نے مجھے اس کوٹھی میں آنے اور سدرہ سے ملنے پر اعتراض کیا تھا۔ کیا تم اس کے سگے رشتے دار ہو؟"

"میں بانو بیگم کا کزن ہوں۔ سدرہ کا ماموں۔"

اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "سدرہ کا ماموں یہاں کیا کر رہا ہے؟"

یار محمد نے پوچھا۔ "تم یہاں کس خوشی میں آئے ہو؟"

"تمہارے سوال کا مطلب یہ ہے کہ یہاں خوشی سے آیا کرتے ہیں اور تم امیر اور شہلا کی موت سے خوش ہو کر آئے ہو۔"

وہ غصے سے بولا۔ "بکواس مت کرو۔ وہ دونوں معصوم تھے۔ میرا دل ان کے لئے رو رہا ہے۔ یہ انٹیلی جینس والے مجھ پر شبہ کر رہے ہیں۔ خواہ مخواہ مجھے یہاں بند کیا ہے۔ میں جانتا ہوں مجھے چند گھنٹوں میں رہائی مل جائے گی۔"

"رہائی مل جائے گی تو پھر کیوں رو رہے ہو؟"

"کون رو رہا ہے؟"

"ابھی تم نے کہا ہے کہ تمہارا دل رو رہا ہے۔"

"ہاں وہ تو بچوں کے لئے روتا رہے گا۔ مگر میری آنکھیں نہیں رو رہی ہیں۔ میں

دکھاوے کے لئے آنسو نہیں بہاتا۔"

"تم نے مجھے سدرہ سے دور رہنے کو کیوں کہا تھا؟"

"وہ بہت بڑے باپ کی امیر کبیر بیٹی ہے۔ تمہارے ہاتھ آسمان تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ تم اس کے لئے تارے توڑ کر نہیں لاسکو گے۔"

"بے شک وہ آسمان ہے' میں زمین ہوں۔ دولت پر لگاتی ہے' تب آسمان کی طرف پرواز کی جاتی ہے۔ میں پروں کے بغیر پرواز کررہا تھا۔ اس کا نتیجہ بھگت رہا ہوں۔"

"ابھی تو کچھ نہیں ہے۔ آگے اور بھگتنا ہے۔"

اس نے یار محمد کو ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم سدرہ کے سگے ماموں نہیں ہو۔ تمہارے جیسے دور کے رشتے دار بڑے گھرانوں میں ماموں بن کر پہنچ جاتے ہیں اور لمبا ہاتھ مارنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ تم نے بھی ایسا ہی کچھ کیا ہوگا۔"

"بکواس کرو گے تو منہ توڑ دوں گا۔"

"اپنی عمر اور میری جوانی دیکھو اور اپنا منہ بچا کر رکھو۔"

"تم ابھی دیکھو گے' سدرہ کی ماں مجھے ضمانت پر رہا کرانے آئے گی۔"

"سدرہ کی ماں رشتے میں تمہاری کون ہے؟"

"یہ کوئی سوال ہے؟ سدرہ مجھے ماموں کہتی ہے۔ مجھ سے اس کی ماں کا رشتہ خود سمجھ لو۔"

"اپنی زبان سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ تمہاری بہن ہے؟"

وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔ چڑ کر بولا۔ "جب تم سمجھ رہے ہو تو میں زبان سے کیوں بولوں؟"

"عجیب سنکی بوڑھا ہے۔ بہن کو بہن نہیں کہتا' سدرہ کی ماں کہتا ہے۔"

یار محمد نے اسے غصے سے دیکھ کر منہ پھیرلیا۔ خرم سوچنے لگا' ابھی فون پر وہ نامعلوم شخص کہہ رہا تھا' پچھلی تمام واردات کا الزام شہلا اور اسد پر درست ثابت ہوا ہے۔ اب سدرہ تم پر شبہ نہیں کرے گی۔ وہ بڑی محبت سے تمہاری ضمانت کے لئے آئے گی۔"

اگرچہ وہ نامعلوم شخص خرم کے دل و دماغ پر بوجھ بنا ہوا تھا۔ تاہم ابھی اس نے یہ خوشخبری سنائی تھی کہ ناراض ہو کر جانے والی سدرہ بڑی محبت سے آنے والی ہے۔

وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے قید ہونے کے بعد سدرہ کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس لئے دعائیں مانگتا رہا تھا۔ وہ دعائیں قبول ہو رہی تھیں۔ اس پر

لگے ہوئے الزامات ختم ہو رہے تھے۔

سرفراز نے دفتر میں آتے ہی یار محمد کو طلب کیا۔ ایک سپاہی اسے حوالات سے نکال کر سامنے لے آیا۔ وہ کرسی پر بیٹھنا چاہتا تھا۔ سرفراز نے کہا۔ "کھڑے رہو۔"

"میں مجرم نہیں ہوں۔ میرا کوئی جرم ثابت نہیں ہوا ہے پھر بھی آپ نے مجھے حوالات میں رکھا۔ اب یہاں بیٹھنے سے منع کر رہے ہیں۔"

"زیادہ مت بولو۔ تم سے جو پوچھا جائے' اسی سوال کا جواب دو۔ شہلا صبح پانچ بجے اسپتال گئی تھی۔ تم نے بیان دیا ہے کہ کوٹھی سے اس کا تعاقب کرتے آئے تھے۔ کیا تم کوٹھی میں تھے؟ وہاں تمام رات جاگتے رہے تھے؟ کیا تمہیں معلوم تھا کہ شہلا صبح منہ اندھیرے اٹھ کر اسپتال جانے والی ہے؟"

یار محمد نے کہا۔ "میں ایسی کوئی بات نہیں جانتا تھا۔ بیگم نے مجھے رات کو کوٹھی میں رہنے کو کہا تھا۔ وہ خطرہ محسوس کر رہی تھیں۔ میں نے حوصلہ دیا کہ میں صبح تک جاگتا رہوں گا۔"

"تم بیگم رئیس احمد کو بیگم کہتے ہو؟"

"بیگم صرف بیوی کو نہیں کہتے۔ سدرہ کی ماں کا نام ہی بیگم بانو ہے۔ میں عمر میں بڑا ہوں۔ اس لئے انہیں بیگم کہتا ہوں۔ ویسے اس سوال کا مطلب کیا ہے؟"

"کوئی سوال نہ کرو۔ صرف جواب دو۔ اسد ہوش میں آنے والا تھا اور ہمیں بیان دینے والا تھا۔ تم نہیں چاہتے کہ وہ شہلا کے خلاف بیان دے۔ تم جانتے تھے کہ شہلا نے اسد کے ذریعے پہلے سوتیلے بھائی امیر احمد کو قتل کرایا پھر سوتیلی بہن سدرہ کو ہلاک کرانا چاہتی تھی۔"

"یہ کہانی آپ اپنے دماغ سے بنا رہے ہیں۔ ذرا عقل سے سوچیں مجھے صرف شہلا سے لگاؤ کیوں ہوگا۔ امیر احمد اور سدرہ بھی میرے اپنے ہیں۔ میں ان کا بھی ماموں ہوں۔ انہیں قتل کرانے والی کو کیوں بچانا چاہوں گا؟"

"یہ راز کھل چکا ہے کہ شہلا' رئیس احمد کی بیٹی نہیں تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس کی بیٹی تھی؟ اس کا باپ کون ہے؟"

ایسے ہی وقت بیگم بانو ایک وکیل کے ساتھ وہاں آگئی۔ سرفراز نے کہا۔ "آیئے بیگم صاحبہ! آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔"

بیگم یار محمد کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بولا۔ "انہوں نے مجھے ایک مجرم کی طرح کھڑا کر رکھا ہے۔ بیٹھنے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔"

بیگم نے کہا۔ "میں کورٹ سے ضمانت نامہ لائی ہوں۔ جلیل صاحب! انہیں ضمانت نامہ دکھائیں۔"

وکیل نے اپنی فائل میں سے ایک کاغذ نکال کر سرفراز کے سامنے پیش کیا۔ سرفراز نے اسے پڑھتے ہوئے کہا۔ "بیگم صاحبہ! آپ نے یار کو رہائی دلانے کے لئے بڑی پھرتی دکھائی ہے۔"

وہ طنز کو سمجھتے ہوئے بولا۔ "میرا نام صرف یار نہیں ہے۔ یار محمد ہے۔"

"بے شک۔ اب آپ بیٹھ سکتے ہیں۔ بیگم صاحبہ! آپ بھی تشریف رکھیں۔"

بیگم نے خشک لہجے میں کہا۔ "ہمیں جانا ہے اور بھی کام پڑے ہیں۔"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ ضمانت پر رہا کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے آپ لوگوں کا محاسبہ نہیں کرنا چاہئے۔ کچھ ضروری باتیں ہیں۔ وہ ہو جائیں تو پھر چلی جائیں۔"

بیگم اور یار محمد نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر بیٹھ گئے۔ سرفراز نے کہا۔ "شہلا آپ کی پہلی اولاد ہے۔ آپ کو یہ تشویش نہیں ہے کہ اس بیٹی کو کس نے قتل کیا ہے؟"

"تشویش ہے کہ آپ میری بیٹی کے قاتل کو گرفتار نہیں کریں گے۔ جبکہ سیدھی سی بات سمجھ میں آرہی ہے' اس کے سوتیلے باپ نے اسے قتل کیا ہے۔ میری بیٹی کا کوئی اور دشمن نہیں تھا۔"

"آپ اپنے شوہر رئیس احمد کو الزام دے رہی ہیں۔ وہ واردات کے وقت اسپتال سے بارہ کلومیٹر دور اپنے بیڈ روم میں سو رہے تھے۔ جاگ رہے تھے یہ' آپ کے یار محمد........."

"آپ رئیس کی چالبازی نہیں سمجھ رہے ہیں۔ وہ خود سو رہے تھے اور اپنے بیٹے عمران سے واردات کرا رہے تھے۔"

"میں عمران کا اور تمام مشکوک افراد کا محاسبہ کر رہا ہوں۔ آپ یہ بتائیں شہلا کا سوتیلا باپ رئیس احمد ہے۔ سگا کون ہے؟"

بیگم نے اسے گھور کر دیکھا پھر کہا۔ "یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ ایسے سوالات کریں گے تو جواب نہیں ملے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں زبردستی نہیں کروں گا لیکن عدالت میں اس سوال کا جواب دینا ہوگا۔ وہاں نجات نہیں ملے گی۔"

"جب عدالت میں سوال کیا جائے گا' تب دیکھا جائے گا۔"

سرفراز نے بیگم اور یار محمد کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ "ابھی یار محمد نے کہا ہے' آپ عمر میں چھوٹی ہیں۔ اس لئے یہ آپ کو بیگم کے نام سے مخاطب کرتے ہیں۔ یہ آپ سے بڑے ہیں۔ آپ انہیں بھائی جان کہتی ہوں گی۔"

"آپ ہمارے ذاتی معاملات کو کیوں کرید رہے ہیں؟"

"میں نے کوئی مشکل سوال نہیں کیا ہے پھر بھی ناراض ہو رہی ہیں۔ ویسے آپ کی ناراضگی میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ آپ یار کو بھائی جان نہیں کہیں گی۔ یار کہیں گی' تب بھی کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ تو نام ہے۔"

وکیل جلیل الدین نے کہا۔ "پلیز آپ ضمانت نامہ پر دستخط کرکے ڈپلیکیٹ ہمیں دیں۔"

وہ قلم اٹھا کر دستخط کرنا چاہتا تھا پھر رک گیا۔ رئیس احمد آرہا تھا۔ سرفراز نے کہا۔

"آیئے جناب! مجھے آپ ہی کا انتظار تھا۔"

رئیس احمد نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میں نے آپ سے یہاں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہم حالات کی نبض ٹٹول کر بتا دیتے ہیں کہ کون آنے والا ہے اور کون جانے والا ہے۔ پہلے بیگم صاحبہ آئیں' یار محمد کی رہائی کے لئے۔ اب آپ آئے ہیں۔ یقیناً اپنے بیٹے عمران کی طرف سے صفائیاں پیش کرنے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"آپ درست کہہ رہے ہیں۔ میں گرفتاری سے قبل ہی بیٹے کے لئے ضمانت نامہ لایا ہوں۔ یہ دیکھیں۔"

رئیس نے ضمانت نامہ پیش کیا۔ سرفراز نے کہا۔ "اب آپ کی صاحبزادی' خرم کی ضمانت کے لئے آئیں گی۔ یہ عجیب تماشا ہے۔ آپ کے گھر میں دو قتل ہو چکے ہیں۔ ایک بیٹے اور ایک بیٹی کو ہلاک کیا گیا ہے۔ ہم کچے پکے ثبوتوں کے ساتھ جنہیں گرفتار کرتے ہیں' آپ لوگ انہیں ضمانت پر رہا کرانے کے لئے آجاتے ہیں۔"

بیگم نے کہا۔ "میں تو بے قصور کو رہائی دلانے آئی ہوں۔ آپ سمجھ دار ہیں۔ آپ

کے پاس تجربات ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں۔ میرے بچوں کو کوئی سوتیلا ہی قتل کر سکتا ہے۔"

رئیس نے ڈانٹ کر کہا۔ "بکواس مت کرو۔ تم میرے بیٹے کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ اس نے کبھی ایک چیونٹی نہیں ماری اور تم اس پر دو قتل کے الزامات لگا رہی ہو۔ اپنی حماقت سے اصل قاتل کو بچ نکلنے کا موقع دے رہی ہو۔"

اس نے سرفراز سے کہا۔ "یہ فرماتی ہیں کہ سوتیلے نے قتل کیا ہے تو پھر یہ بھی میرے بیٹے کی سوتیلی ماں ہیں۔ انہوں نے میرے عمران پر قاتلانہ حملہ کرایا ہوگا۔"

بیگم بانو نے کہا۔ "میں نادان نہیں ہوں۔ اس سوتیلے کو قتل کرا کے اپنی گردن نہیں پھنساؤں گی۔ میں تو اسے عدالت کے راستے پھانسی پر چڑھاؤں گی۔ میں اپنے دونوں مقتول بچوں کی قسمیں کھا چکی ہوں۔"

سرفراز نے کہا۔ "پلیز' یہ پولیس اسٹیشن ہے۔ آپ میاں بیوی گھر جا کر لڑتے رہیں۔ میں ان کاغذات پر دستخط کر چکا ہوں۔"

بیگم بانو اور رئیس نے اپنے اپنے ضمانت نامے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی اٹھالی۔ بیگم نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میرے پیچھے نہ آنا۔"

رئیس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "بڑی خوش فہمی ہے۔ اس عمر میں تو کتے بھی تمہارے پیچھے نہیں آئیں گے۔"

وہ چیخ کر بولی۔ "یُو شٹ اَپ! تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ میں تمہارے بیٹے کو نہیں چھوڑوں گی۔ میرا جوان بیٹا مارا گیا ہے۔ تمہارا جوان بیٹا بھی نہیں رہے گا۔ میں تمہیں خون کے آنسو رلاؤں گی۔"

سرفراز نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ "کیوں چیخ رہی ہو۔ مسٹر رئیس جا چکے ہیں۔ آپ کو باہر جا کر چیخنا چاہئے۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی یار محمد کے ساتھ جانے لگی۔ سرفراز نے زیرِ لب کہا۔ "پتا نہیں یہ میاں بیوی ایک چھت کے نیچے کیسے رہتے ہیں۔"

وہ اپنی کرسی پر آکر بیٹھتے ہوئے ماتحت سے بولا۔ "خرم کو لے آؤ۔"

ماتحت نے کہا۔ "صبح کسی نے خرم سے فون پر بات کی تھی۔ ایکس چینج والوں نے فون کرنے والے کا موبائل نمبر نوٹ کر کے بھیجا ہے۔"

وہ ایک پرچی دیتے ہوئے بولا۔ "یہ ہے وہ نمبر۔ وہ معلوم کر رہے ہیں کہ اس نمبر کا موبائل فون کس کے پاس ہے۔"

ماتحت وہاں سے چلتا ہوا آہنی سلاخوں کے پاس آیا۔ ایک سپاہی سے بولا۔ "دروازہ کھولو۔ خرم! باہر آؤ۔"

دروازہ کھل گیا۔ وہ باہر آکر ماتحت کے ساتھ چلتا ہوا سرفراز کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ سرفراز نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ "تمہیں کس نے فون کیا تھا؟"

"آپ یقین نہیں کریں گے پھر بھی یہ سچ ہے کہ میں اسے نہیں جانتا۔"

"میں کیسے یقین کروں۔ وہ تمہیں جانتا ہے۔ تم سے فون پر باتیں کرتا ہے اور تم اسے نہیں جانتے۔"

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا پھر چپ ہوگیا۔ سدرہ نے دروازہ کھول کر پوچھا۔ "کیا میں اندر آسکتی ہوں؟"

سرفراز نے کہا۔ "تمہیں تو آنا ہی تھا۔ چلی آؤ۔"

سدرہ نے اندر آکر خرم کو دیکھا۔ خرم نے منہ پھیرلیا۔ وہ بولی۔ "میں جانتی تھی' مجھ سے ناراض ہو۔ سامنے آؤں گی تو منہ پھیرلو گے۔"

سرفراز نے کہا۔ "بیٹھو۔ خرم! تم بھی بیٹھ سکتے ہو۔ تم پر قاتل ہونے کا شبہ تھا' وہ نہیں رہا۔ البتہ دو باتیں ایسی ہیں جن سے شبہ ہوتا ہے کہ تم مجرمانہ زندگی گزار رہے ہو۔"

سدرہ نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "وہ کون سی دو باتیں ہیں؟"

"ایک تو یہ کہ اس کے بینک اکاؤنٹ میں دو لاکھ سترہ ہزار آٹھ سو روپے کہاں سے آگئے۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور اتنی بچت نہیں کر سکتا۔ کوئی تم سے غلط کام کراتا ہے اور اتنی بڑی رقمیں دیتا ہے۔"

وہ بے بسی سے بولا۔ "میں اس بات کا کیا جواب دوں؟ کوئی یقین نہیں کرے گا کہ ایک نامعلوم شخص میرے اکاؤنٹ میں اتنی بڑی رقم جمع کراتا رہتا ہے۔ وہ مجھے قاتل ثابت کرنا چاہتا ہے۔"

"تم پر شبہ کرنے والی دوسری بات یہ ہے کہ تم فون کرنے والے کا نام نہیں بتا رہے ہو۔"

"نہ میں اس کا نام جانتا ہوں۔ نہ اسے صورت و شکل سے پہچانتا ہوں۔"

سرفراز نے سدرہ سے کہا۔ "کیا یہ یقین کرنے والی باتیں ہیں کہ کوئی اسے پھانسنے کے لئے لاکھوں روپے مفت میں دے رہا ہے؟ اور کوئی فون کرنے والا بھی اس کے لئے بالکل اجنبی ہے؟"

خرم نے کہا۔ "آپ اس رئیس زادی سے نہ پوچھیں۔ یہ میری کچھ نہیں لگتی۔ آپ میرے معاملات مجھ تک ہی رہنے دیں۔"

سدرہ نے اسے بڑے دکھ سے دیکھا پھر کہا۔ "پلیز' غصہ تھوک دو۔ جب میں نے تم پر شبہ کیا' اس وقت تمام ثبوت تمہارے خلاف تھے۔"

"اب بھی میرے خلاف ثبوت ہیں۔ میں واردات کرتا ہوں اور لاکھوں روپے بینک میں جمع کرتا ہوں۔ تم جاؤ یہاں سے۔ ایک مجرم سے محبت اور ہمدردی جتانے کے لئے یہاں نہ آؤ۔ مجھے سزا پانے دو۔"

سدرہ کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ اپنی آنکھوں کے پیچھے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ سرفراز اس کے جذبوں کو بھانپ رہا تھا۔ اس نے خرم سے کہا۔ "کیوں اسے غصہ دکھا رہے ہو؟ میں نے تمہیں بیٹھنے کے لئے کہا تھا۔"

"مجرم کو بیٹھنا نہیں چاہئے۔ میں کھڑا رہوں گا۔"

"تم کچھ زیادہ ہی اکڑ دکھا رہے ہو۔"

"جب سزا پانا ہی ہے تو اکڑنے سے کیا ڈرنا؟ یہ تو میں کبھی ثابت نہیں کرسکوں گا کہ کوئی مجھے پھانسنے کے لئے لاکھوں روپے دے رہا ہے۔ عدالت میں بھی مجھے جھوٹا سمجھا جائے گا۔"

سدرہ اسے محبت اور توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سرفراز سے کہا۔ "میں ایک ایسی بات کہنا چاہتی ہوں' جو کبھی کسی سے کہنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ بات زبان پر آنے سے خرم کی انا اور خود داری کو ٹھیس پہنچتی لیکن اب مجھے بولنا ہی ہوگا۔ کیا آپ اس بات کو راز میں رکھیں گے؟"

اس نے پوچھا۔ "بات کیا ہے؟"

سدرہ نے ایک نظر خرم پر ڈالی پھر بڑے مستحکم لہجے میں کہا۔ "میں خرم کے بینک

اکاؤنٹ میں بڑی رقمیں جمع کرتی رہتی ہوں۔"

"کیا.........؟" سرفراز اور خرم نے چونک کر اسے دیکھا۔

وہ بولی۔ "میں چاہتی تھی' خرم کو کوئی کاروبار کرنے کے لئے لاکھوں روپے دوں لیکن یہ بہت خود دار ہے۔ میں دینا چاہتی تو یہ مجھ سے ایک روپیہ بھی نہ لیتا۔ تب میں نے یہی سوچا کہ چپ چاپ اس کے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرتی رہوں۔ اسے معلوم ہوگا تو یہ پریشان ہوگا لیکن سمجھ نہیں پائے گا کہ میں اس کی مدد کر رہی ہوں اور وہ لاکھوں روپے اپنے اکاؤنٹ سے نکال کر نہیں پھینکے گا۔ مجبور ہو کر یہ رقم کسی کاروبار میں لگائے گا ہی۔"

خرم نے کہا۔ "تم جھوٹ بول رہی ہو۔ کوئی نامعلوم شخص مجھے فون پر بتاتا رہتا ہے کہ وہ میرے اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے جمع کر رہا ہے۔"

سدرہ نے کہا۔ "سرفراز صاحب! اصلی قاتل اب تک گرفتار نہیں ہوا۔ وہ بہت چالاک ہے۔ ہمارے بارے میں گہری معلومات رکھتا ہے۔ اسے کسی نہ کسی طرح یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ میں خرم کے اکاؤنٹ میں رقمیں جمع کر رہی ہوں۔ وہ خرم کو احسانات کے بوجھ تلے دبا رہا ہے۔ میں نہیں جانتی۔ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔"

سرفراز نے کہا۔ "مس سدرہ! کل خرم کو گرفتار کرکے یہاں رکھا گیا تھا۔ میں نے بینک منیجر سے معلومات حاصل کرکے خرم پر شبہ کیا تھا کہ یہ لاکھوں روپے لے کر واردات کرتا ہے۔ تب آپ نے اس کی طرف سے صفائی کیوں نہیں پیش کی۔"

"کل میں نفرت سے بھری ہوئی تھی۔ ایک شناختی کارڈ کے ذریعے ثابت ہو رہا تھا کہ یہ میرے بھائی کا قاتل ہے اور مجھے بھی قتل کرنا چاہتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ غصہ دلانے والی بات یہ تھی کہ اس نے میری بہن کی آبرو لوٹی ہے۔ اس بات پر اس نے مجھے طمانچہ مارا تھا۔ اچھا ہی کیا تھا۔ یہ مجھے دل و جان سے چاہتا ہے اور میں اس پر شرمناک الزام لگا رہی تھی۔ میں نے اس کی محبت کی توہین کی تھی۔"

وہ بولتے بولتے رونے لگی۔ خرم کا سر جھک گیا۔ اس نے سدرہ کو دیکھا پھر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میں تمہیں غلط سمجھ رہا تھا۔ میں تم سے معافی نہیں مانگوں گا کیونکہ تم بھی مجھے غلط سمجھ رہی تھیں۔ حساب برابر ہوگیا ہے۔"

وہ خوش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ سرفراز نے کہا۔ "بہت پرانا شعر ہے لیکن موقع کی مناسبت سے سنا رہا ہوں۔ میں جاسوس ہوں۔ مجھے شعر یاد نہیں

رہتے۔ وہ کچھ یوں ہے کہ بڑا مزہ ہے ایسے ملاپ میں' جو صلح ہوجائے' جنگ ہوکر.........."

سدرہ نے ضمانت نامہ پیش کرتے ہوئے کہا۔ "شاعر حضرات آپ کی زبان سے سنیں گے تو اپنا سر پیٹ لیں گے۔"

سرفراز نے ہنستے ہوئے دستخط کئے پھر اسے فوٹو اسٹیٹ کاپی دیتے ہوئے کہا۔ "تم ضمانت نامہ نہ لاتیں تب بھی میں خرم کو رہا کر دیتا۔"

وہ دونوں اس کا شکریہ ادا کرکے تھانے سے باہر آئے۔ باہر اس کی ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ سدرہ نے کہا۔ "میری کار میں چلو۔"

اس نے کہا۔ "یہ ٹیکسی کل رات سے کھڑی ہے۔ اسے مالک کے پاس پہنچانا ہے۔ وہ پریشان ہو رہا ہوگا۔"

"پہلے میری کار میں بیٹھو۔ مالک کے پاس چلو۔ اس سے کہہ دو کہ آج سے ٹیکسی نہیں چلاؤ گے۔ وہ یہاں سے اپنی ٹیکسی لے جائے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟ یہ میری روزی کا ذریعہ ہے۔"

وہ.......... کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر بولی۔ "مجھے دل و جان سے چاہتے ہو تو سوسائٹی میں میرے اونچے مقام کا خیال کرو۔ تمہیں گاڑیوں کا تجربہ ہے۔ مہنگی کاروں کے شو روم کے مالک بن جاؤ۔ تمہارے پاس سرمائے کی کمی نہیں ہوگی۔ میں تمہاری ہوں تو میری دولت بھی تمہاری ہے۔"

"نہیں سدرہ! تم میرے مزاج کو سمجھتی ہو۔ میں تم سے رقم نہیں لوں گا۔"

"تمہارے مزاج کو سمجھتی ہوں' اس لئے چوری چھپے تمہارا بینک بیلنس بڑھا رہی تھی۔ جب بیلنس بڑھتا ہی چلا جاتا تو کیا تم بڑھتی ہوئی رقم کو قبول نہ کرتے۔"

"وہ بات کچھ اور ہے۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ نامعلوم شخص ہمارے بارے میں گہری معلومات رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میرے ابو کو کینسر ہے اور لندن میں ان کے علاج کے لئے مجھے سات لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔"

سدرہ نے بڑے دکھ سے پوچھا۔ "تمہارے ابو کو کینسر ہے اور تم نے مجھ سے کبھی ذکر نہیں کیا۔ کیا میں تمہیں سات لاکھ روپے نہیں دے سکتی تھی؟"

"میں تم سے کیا کہتا؟ مجھے یہ رقم مل رہی تھی۔ تم سے ہی مل رہی تھی اور وہ

نامعلوم شخص اپنا نام کر رہا تھا لیکن بڑے ڈرامائی انداز میں کہتا رہتا تھا کہ میں نے امیر احمد کو بڑی چالاکی سے قتل کیا ہے۔ میرے اکاؤنٹ میں دو لاکھ جمع کیے جا رہے ہیں۔ آج صبح اس نے فون کیا کہ میں اس کی مرضی کے مطابق کام کر رہا ہوں۔ میرے اکاؤنٹ میں اور دو لاکھ جمع کئے جا رہے ہیں۔"

سدرہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا وہ پاگل ہے؟ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟"

"میں کیا بتاؤں؟ میں سمجھ رہا تھا۔ وہ ابو کے علاج کے لئے مہربان ہو کر رقمیں بھی دے رہا ہے اور مجھے قتل کی واردات میں بھی ملوث کر رہا ہے۔ اب پتا چلا کہ یہ رقم تمہاری ہے اور وہ کوئی خطرناک کھلاڑی ہے۔"

وہ پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

اس نے پوچھا۔ "تم ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟"

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "کیا وہ یہ کہتا ہے کہ امیر احمد کو قتل کرنے کے سلسلے میں رقم دے رہا ہے؟"

"ہاں۔ میں حیران ہوتا رہا کہ میں نے کوئی واردات نہیں کی پھر اس نے میرے اکاؤنٹ میں دو لاکھ روپے کا اضافہ کیوں کیا ہے؟ جب تم پر قاتلانہ حملہ ہوا تب بھی اس نے میری تعریف کی اور کہا کہ میرے اکاؤنٹ میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔"

"خرم! وہ قاتل بہت چالاک اور خطرناک ہے۔ وہ سرفراز کا دھیان اپنی طرف سے ہٹانے کے لئے تمہارے اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے کا اضافہ کر رہا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟ یہ لاکھوں روپے تو تمہارے ہیں۔"

"نہیں۔ سرفراز تم پر شبہ کر رہا تھا۔ تم اپنی سچائی ثابت نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے جھوٹ کہہ کر تمہیں سچا ثابت کر دیا۔"

وہ اسے حیرانی سے تکنے لگا۔ "میں تو تمہارا بینک اکاؤنٹ نمبر بھی نہیں جانتی۔ میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ میں سرفراز کے سامنے جھوٹ بول کر تمہیں تمام شبہات سے بالاتر کر سکتی ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے۔ واقعی کوئی مجھے مرڈر کیس میں پھانسنے کی کوششیں کر رہا ہے۔ میری غربت سے اور ابو کی بیماری سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔"

"سرفراز نے اسی بنیاد پر شبہ کیا تھا کہ تمہارے جیسے غریب شخص کے اکاؤنٹ میں

لاکھوں روپے جمع ہو رہے ہیں اور تم بڑی رقمیں لے کر واردات کرتے رہتے ہو۔ سوچ کر بتاؤ۔ کیا تمہارا کوئی جانی دشمن ہے؟"

"جب سے وہ مجھے فون کرنے لگا ہے۔ تب سے سوچتا آرہا ہوں۔ میرا ایسا کوئی بدترین دشمن نہیں ہے۔ وہ مکار میرے بدترین حالات سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔"

وہ دونوں تھوڑی دیر کے لئے چپ ہوگئے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگے پھر سدرہ نے کہا۔ "میرا جھوٹ بہت کام آرہا ہے۔ تم پر سے شبہات ختم ہوچکے ہیں۔ اس نے تمہیں لاکھوں روپوں کی دلدل میں پھینکا تھا۔ میں نے تمہیں اس دلدل سے نکالا ہے۔ آئندہ وہ فون کرے گا تو تمہارا ردعمل کیا ہوگا؟"

"اس سے کہوں گا اور لاکھوں روپے میرے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرتا رہے۔ پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو یقین ہوگیا ہے کہ یہ رقم میری ارب پتی محبوبہ مجھے دے رہی ہے۔"

اس نے ہنستے ہوئے خرم کے شانے پر سر رکھ دیا۔ "اچھا ہے۔ آئندہ وہ تمہیں اپنا مہرہ نہیں بنائے گا۔"

"تم اتنے پیار سے قریب آؤ گی تو کار یہیں کھڑی رہے گی۔"

اس نے مسکرا کر خرم کو دیکھا پھر کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا دی۔

☆======☆======☆

زبیر حسن صدمات سے ٹوٹ رہا تھا۔ شہلا کے عشق میں اس کا جوان بیٹا اسد بھری جوانی میں بے موت مارا گیا تھا۔ بیٹے کے سوگ میں وہ کم کھاتا' کم سوتا تھا اور کم بولتا تھا۔ سوچتا زیادہ تھا۔

یہ سوچتا تھا کہ اسد کو صرف شہلا نے نہیں' اس کی ماں بیگم بانو نے بھی پھانسا تھا۔ وہ اپنی بیٹی شہلا کو شہ دیتی تھی۔ اسد اس کا دیوانہ بن کر اس کے ساتھ لندن اور پیرس جاتا تھا اور اسے لاکھوں روپے کی شاپنگ کراتا تھا۔

بیٹے کی ہلاکت کے بعد زبیر حسن زیادہ سے زیادہ اس کے کمرے میں وقت گزارتا تھا۔ البم میں اس کی تصویریں دیکھتا تھا۔ اس کی زیادہ تر تصویریں شہلا کے ساتھ تھیں۔

وہ بیٹے کا لباس' شیونگ کا سامان اور اس کے جوتوں کو بڑی محبت سے دیکھتا رہتا تھا۔ ایک رات اس کی کتابوں کے درمیان بیٹے کی ایک ڈائری مل گئی۔ اس نے اسے کھول کر

پہلا صفحہ پڑھا تو پھر پڑھتا ہی چلا گیا۔

اسد نے لکھا تھا۔ "شہلا میرے حواس پر چھا رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے وہ جادو جانتی ہے اور مجھے سحرزدہ کرتی رہتی ہے۔ اس کی ممی بیگم بانو جانتی ہیں کہ میں کروڑ پتی باپ کا بیٹا ہوں۔ اس لئے وہ ہمارے گیٹ ٹوگیدر رہنے پر اعتراض نہیں کرتی ہیں۔

"میں نے شہلا کو کئی بار گہری سوچ میں غرق دیکھا ہے۔ پوچھنے پر وہ کہتی ہے۔ "کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"میں نے کہا۔ "تم مجھ سے کہنا نہیں چاہتیں؟"

"ہاں۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو صرف اپنے دل و جان کے مالک سے اور اپنے ہم راز سے کہی جاتی ہیں۔"

"کیا میں تمہارا ہم راز نہیں بن سکتا؟"

شہلا نے پوچھا۔ "میں کیسے یقین کروں کہ میرے رازدار بن کر رہو گے؟"

"ایک بار آزما کر دیکھو پھر زندگی بھر مجھ پر اندھا اعتماد کرتی رہو گی۔"

"میں اپنے گھر کا ایک راز بتا رہی ہوں۔ تم کسی کو نہیں بتاؤ گے؟"

"میرے دل میں تمہارے لئے جو محبت ہے' اس محبت کی قسم کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

"میں رئیس احمد کی بیٹی نہیں ہوں۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم انکل کی بیٹی نہیں ہو؟ وہ تمہارے باپ نہیں ہیں؟"

"نہیں۔ میں اس گھر میں ایک گالی ہوں۔ میرے اصلی باپ کا نام نہ پوچھنا۔ میری ممی کو گالی پڑے گی۔ میں اپنی ممی کو جان سے زیادہ چاہتی ہوں۔ اب تم مجھ سے نفرت کرو۔ میں ناجائز ہوں۔"

"میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "میرے دل میں تمہاری محبت اور بڑھ گئی ہے۔ دنیا کو معلوم ہوگا تو ناجائز کہلاؤ گی۔ میرے جیتے جی یہ راز کسی کو معلوم نہیں ہوگا۔"

"اس دن کے بعد سے ہماری محبت میں پختگی آگئی۔ وہ مجھ پر بھروسا کرنے لگی۔ ایک روز اس نے کہا۔ "سدرہ اور امیر احمد دنیا کی نظروں میں میرے سگے بہن بھائی ہیں لیکن حقیقتاً سوتیلے ہیں۔ میرا باپ بھی سوتیلا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری ممی کی دولت اور جائیداد میرے سوتیلوں کو ملے۔"

میں نے پوچھا۔ "تم کیا چاہتی ہو؟"

"ممی کی تمام دولت پر میرا حق ہے۔ یہ مجھے ملے گی تو گویا شادی کے بعد تمہیں ملے گی۔"

"اس بات نے مجھے سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کیا۔ وہ درست کہہ رہی تھی۔ اس سے شادی کے بعد تمام کاروبار کا مالک میں بن سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ "تمہاری بات سمجھ میں آرہی ہے۔ مگر یہ سوتیلے حصے دار ضرور رہیں گے۔"

وہ بڑے مستحکم لہجے میں بولی۔ "اگر یہ سوتیلے نہ رہیں تو؟"

"میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بولی۔ "انہیں موت آسکتی ہے۔ ہماری بد دعا سے یہ نہیں مریں گے۔ تین سوتیلے ہیں۔ سدرہ' امیر احمد اور میرا باپ کہلانے والا رئیس احمد۔ یہ ضروری نہیں کہ بیک وقت تینوں کو حادثہ پیش آئے اور یہ تمام دولت ہمارے لئے چھوڑ کر چلے جائیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ہم ان کی موت کا انتظار کرتے رہیں گے تو ہمیں موت آجائے گی۔"

"میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ ہمیں کسی بھی طرح ان سے نجات پانا ہے۔"

"کیسے نجات پاؤ گے؟"

"تم بولو' کیا ان کی ہلاکت چاہتی ہو.........؟ مرڈر؟"

"ہاں تم میرے ہم مزاج ہو۔ میری طرح سوچتے ہو۔ تم صحیح معنوں میں میرے لائف پارٹنر بن سکتے ہو۔ جانتے ہو' ہمارے کاروبار میں لگی ہوئی رقم اور تمام جائیداد کی مالیت کا حساب کیا جائے تو ہم دس ارب روپے کے مالک بن سکتے ہیں۔"

"میں کروڑ پتی باپ کا بیٹا ہوں۔ ارب پتی بننے کے خواب دیکھتا رہتا ہوں۔ شہلا اس خواب کی تعبیر بتا رہی تھی۔ میں گھر آکر سوچنے لگا۔ مجھے شہلا کی محبت مل رہی تھی۔ آئندہ دولت ملنے والی تھی۔ ایسے وقت آدمی عقل کا اندھا ہوجاتا ہے۔ دوسرے پہلوؤں پر غور کرنا بھول جاتا ہے۔"

لیکن میں تاجر باپ کا بیٹا ہوں۔ اپنے نفع و نقصان پر پہلے نظر رکھتا ہوں۔ ذہن میں بات آئی کہ یہ سنگین معاملہ ہے۔ اگر مقدر کی خرابی سے ٹھوکر کھاؤں گا تو کیا ایسے وقت شہلا ساتھ دے گی؟ یا وہ ٹھوکر کھانے سے پہلے ہی بچ نکلے گی؟

دانش مندی یہ ہوگی کہ شہلا کو پہلے اچھی طرح سے گرفت میں رکھا جائے۔ اگر وہ

کامیابی میں حصے دار ہے تو ناکامی میں بھی اسے برابر کا حصہ ملے۔

"اس رات میں دیر تک سوچتا رہا اور منصوبے بناتا رہا۔ دوسرے دن میں نے ایک پاکٹ سائز ریکارڈر اپنے لباس میں چھپایا۔ تاکہ میں اس کی تمام گفتگو ریکارڈ کرتا رہوں۔ اس کے تمام سازشی منصوبے بھی ریکارڈ ہوتے رہیں۔

"میں اس کی کوٹھی میں پہنچا تو ملازم نے بتایا' وہ پائیں باغ میں ہے۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا کوٹھی کے پچھلے حصے میں آیا۔ شہلا باغیچے میں تھی۔ ایک درخت کے سائے میں ماں سے باتیں کررہی تھی۔

"میں ایک جگہ رک کر انہیں دیکھنے لگا۔ دونوں ہاتھ نچا نچا کر یوں باتیں کر رہی تھیں جیسے کسی بات پر جھگڑ رہی ہوں اور اپنی اپنی بات ایک دوسرے سے منوانا چاہتی ہوں۔ جب ان کی نظر مجھ پر پڑی تو ان کا موڈ اچانک ہی بدل گیا۔ دونوں مسکرانے لگیں۔

شہلا تیزی سے چلتے ہوئے میرے پاس آئی پھر بولی۔ "آؤ ہم بیڈ روم میں چلیں۔"

میں نے اس کے بیڈ روم میں آکر پوچھا۔ "کیا تم ممی سے جھگڑا کر رہی تھیں؟"

"نہیں جھگڑا تو نہیں کر رہی تھیں۔ وہ مجھ سے بحث کر رہی تھیں۔"

"پھر تو کوئی اہم معاملہ ہوگا۔"

"وہی سوتیلوں کا مسئلہ ہے۔"

"سدرہ اور امیر احمد تو تمہاری ممی کے سوتیلے نہیں ہیں۔ وہ دونوں ان کی اپنی اولاد ہیں۔"

"وہ صرف میرے سوتیلے باپ سے نفرت کرتی ہیں۔ ان سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہیں۔ وہ نہیں جانتی کہ میں ان کی سدرہ اور امیر احمد سے نفرت کرتی ہوں اور انہیں جہنم میں پہنچانے والی ہوں۔ تم بتاؤ' ہماری پلاننگ پر غور کیا ہے۔ ہمیں ہر پہلو سے محتاط رہنا چاہئے۔"

"میں چاہتا ہوں' پلاننگ پر عمل کرنے سے پہلے ہمیں ایک دوسرے کا بھرپور اعتماد حاصل کرنا چاہئے۔"

"کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟"

"ہے۔ یہ اعتماد اور مضبوط ہوجائے تو اچھا رہے گا۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"پہلے ہماری شادی ہوجائے پھر ہمارا رشتہ اور مضبوط ہوجائے گا۔"

"پہلے شادی نہیں ہوگی۔ میں اپنے مقاصد حاصل کرنے کے بعد شادی کروں گی۔"

"شادی کے بعد اور زیادہ جوش و جذبے سے مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔"

"میں ابھی ممی سے بحث کرتے کرتے بیزار ہوگئی ہوں۔ اب تم بحث کرنے آئے ہو۔ کیا یہی تمہاری محبت ہے۔ آزمائش کے وقت شرائط پیش کر رہے ہو۔"

"میں شادی کی ضد نہیں کروں گا لیکن ہمارے درمیان گہرا رشتہ ہونا چاہئے۔ میں تم سے جسمانی تعلقات چاہتا ہوں۔"

"میرا جسم، میری جان سب تمہارے لئے ہے مگر شادی کے بعد۔"

"میری کوئی تو بات مانو۔ چلو شادی نہ سہی۔ ہماری منگنی ہونی چاہئے۔"

"ہاں منگنی ہوسکتی ہے۔ میں آج ہی ممی سے بات کروں گی۔"

"تمہاری ممی اور ڈیڈی کا کیا مسئلہ ہے؟"

"میں ان سے کہہ رہی تھی کہ انہیں ڈیڈی سے ہمیشہ کے لئے نجات دلاؤں گی تم ہمارا یہ کام کرو گے اور ہمارے رازدار رہو گے۔ مگر وہ ڈیڈی سے خود نمٹنا چاہتی ہیں۔ انہوں نے اپنے طور پر پلاننگ کی ہے۔"

"اچھا ہے۔ انہیں اپنے حساب سے کام کرنے دو۔ تم کیوں جھگڑ رہی تھیں۔"

"جھگڑے کی تو بات ہے۔ ان کا منصوبہ ناکام رہے گا تو وہ سوتیلا باپ مجھ پر مسلط رہے گا۔"

"مسلط نہیں رہے گا۔ امیر احمد اور سدرہ کے بعد اس سے بھی نمٹ لیا جائے گا۔"

"وہ مطمئن ہوگئی۔ اس رات میں نے گھر آکر ریکارڈ کی ہوئی کیسٹ کو ریوائنڈ کرنے کے بعد سنا۔ شہلا کی باتیں دوبارہ توجہ سے سن کر یہ سمجھ میں آیا کہ وہ اپنے معاملات میں بہت چالاک ہے۔ نہ شادی کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی جسمانی تعلقات رکھنا چاہتی تھی۔ دور ہی دور سے سر سہلا کر اپنا کام نکالنا چاہتی تھی۔ کام نکلنے کے بعد دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک سکتی تھی۔

"میں نے دوسری اہم بات جو ریکارڈ کی وہ یہ ہے کہ شہلا کی ممی اپنے شوہر سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ رئیس احمد کو ٹھکانے لگانے کی پلاننگ کر رہی ہیں۔ شہلا اپنی ممی کی یہ باتیں اپنی زبان سے بول رہی تھی اور یہ تمام باتیں ریکارڈ ہوچکی تھیں۔ اگر وہ

کبھی مجھے کسی مصیبت میں چھوڑ کر جانا چاہتی تو میں اس کے اور اس کی ممی کے تمام سازشی منصوبوں کو طشت ازبام کر سکتا تھا۔

"وہ زیادہ سے زیادہ وقت میرے ساتھ گزارتی ہے۔ پیار و محبت کی باتیں کرتی ہے۔ ادائیں دکھاتی ہے، ترساتی ہے، للچاتی ہے۔ پھر پوچھتی ہے۔ "بولو واردات کیسے کرو گے؟ اس سلسلے میں کیا طریقہ کار سوچ رہے ہو؟"

"میں نے اسے سمجھایا ہے، کسی کو قتل کرنا جتنا مشکل ہے، اتنا ہی آسان ہے۔ یوں سمجھو بزدلوں اور نادانوں کے لئے مشکل ہے۔ خوف زدہ رہ کر واردات کی جائے تو کوئی نہ کوئی غلطی سرزد ہوجاتی۔ پھانسی کا پھندا اگردن تک پہنچ جاتا ہے۔

"اور جو دلیر ہوتے ہیں، وہ کھیل تماشا سمجھ کر ایسی واردات کر گزرتے ہیں اور اپنے پیچھے ایک انگلی کا نشان بھی نہیں چھوڑتے۔ میں بزدل نہیں ہوں۔ دلیر ہوں۔ نادان نہیں ہوں کہ فوراً ہی امیر احمد یا سدرہ پر حملہ کردوں۔ جلد بازی کی ضرورت ہی کیا ہے؟

"پہلے واردات کی جگہ کو اچھی طرح دیکھ لیا جائے۔ سمجھ لیا جائے، میں پوری طرح اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ میرے کام کے دوران میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی۔ میں کسی کی نظروں میں نہیں آؤں گا اور کام کے بعد واپسی میں کوئی میرا راستہ نہیں روکے گا۔

"وہ میری احتیاطی تدابیر سے متفق ہوتی ہے پھر بھی بیزار ہوکر پوچھتی ہے۔ "آخر کتنا وقت لوگے؟ مجھ سے انتظار نہیں ہورہا ہے۔"

"اس بار میں نے وعدہ کیا ہے، ایک ہفتے کے اندر اندر پہلی وارات ہوگی لیکن مجھے ایک رات اس کوٹھی میں چھپ کر رہنا ہوگا۔ یہ اسٹڈی کرنی ہوگی کہ امیر احمد رات کے کھانے کے بعد صبح تک اپنے بنگلے میں کس طرح وقت گزارتا ہے؟ وہ سوجاتا ہے یا رات گئے تک جاگتا رہتا ہے؟ اور اپنی راتیں بنگلے کے کس حصے میں گزارتا ہے؟"

"شہلا ایک رات کے لئے سدرہ کے بیڈ روم میں چلی گئی۔ میں اس کے بیڈ روم میں آکر چھپ گیا۔ رات کی تاریکی اور سناٹے میں کمرے سے نکل کر امیر احمد کے بنگلے کے اطراف چکر لگاتا رہا۔ بڑی اہم معلومات حاصل کرتا رہا۔

"ایسے وقت ایک ایسی اہم معلومات حاصل ہوئی، جس کی توقع نہیں تھی۔ رات کے تین بجے میں نے یار محمد کو دیکھا۔ وہ شہلا کی ممی کے ساتھ تھا۔ بیڈ روم سے باہر آرہا

تھا۔ میں اس بیڈ روم کی دیوار سے لگ کر ان کی باتیں سننے لگا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم اس کام میں دیر کیوں کر رہی ہو؟ میں برسوں پہلے ہی رئیس کا کام تمام کردیتا مگر تم ہمیشہ روک دیتی ہو۔"

شہلا کی ممی نے کہا۔ "میں اندھی کارروائی نہیں چاہتی۔ اپنے بچوں کی بہتری چاہتی ہوں۔ اس انتظار میں ہوں کہ رئیس وصیت لکھے اور اپنے حصے کی دولت اور جائیداد میرے بچوں کے نام کردے۔ وصیت لکھنے کے بعد اسے ٹھکانے لگایا جائے گا۔"

"وہ وصیت میں اپنے بیٹے عمران کے نام بھی بہت کچھ لکھے گا۔"

"یہی تو میں کہتی ہوں۔ کسی طرح عمران کو جہنم میں پہنچاؤ۔ وہ نہیں رہے گا تو رئیس کو سب کچھ میرے ہی بچوں کے نام لکھنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے میری جان! اب میں عمران کی تاک میں رہوں گا۔ تمہیں بہت جلد اس کی حرام موت کی خوش خبری ملے گی۔ اچھا اب مجھے پیار سے رخصت کرو۔"

"اس نے یار محمد کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ میں نے دیوار کی آڑ سے انگریزی فلم کا منظر دیکھا۔ اس عمر میں بھی ان کا عشق جوان تھا پھر وہ تاریکی میں چھپتا ہوا چلا گیا۔ شہلا کی ممی نے اپنے بیڈ روم میں جاکر دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔

"میں شہلا کے کمرے میں آیا۔ وہ بھی سدرہ کے بیڈ روم سے آگئی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں اب تک جاگ رہی ہوں۔ مجھے صرف اپنے بیڈ پر نیند آتی ہے۔ تمہیں دن نکلنے سے پہلے یہاں سے جانا چاہئے۔"

"جارہا ہوں۔ یہ نہیں پوچھو گی کہ میں نے ایک رات میں کتنی اہم معلومات حاصل کی ہیں؟"

"تم لنچ کے وقت آؤ گے تو باتیں ہوں گی۔"

"مگر یہ بتانے کے لئے میرا پیٹ پھول رہا ہے کہ ابھی میں نے تمہارے اصلی باپ کو دیکھا ہے۔"

"کیا.........؟" وہ حیرانی سے بولی۔ "تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"جو تم سن رہی ہو۔ میں نے تمہاری ممی کے کمرے کی طرف سے گزرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ تمہارے اصلی پاپا کے ساتھ بڑے رومینٹک موڈ میں تھیں۔ وہ دونوں رئیس انکل کے بیٹے عمران کو ٹھکانے لگانے کی باتیں کر رہے تھے۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "ممی تو حد کرتی ہیں۔ اس عمر میں بھی تماشے کرتی رہتی ہیں۔ شٹ.......... اور تم اس بات پر مسکرا کیوں رہے ہو؟"

"کیا ماتم کروں؟ ہم دونوں بہت ہی سنگین معاملات میں ہم راز ہیں لیکن تم نے اصلی باپ کے سلسلے میں مجھے رازدار نہیں بنایا۔ ابھی خود ہی یہ راز کھل گیا۔ ویسے تم خود غرض ہو۔ صرف اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے مجھ سے دوستی کر رہی ہو۔"

"تم نے پہلی بار مجھے خود غرض کہا ہے۔ تمہارے دل میں کیا ہے؟ کیا ہماری دوستی آگے نہیں بڑھے گی؟ میرا کام نہیں کرو گے؟"

"ضرور کروں گا۔ منگنی کی رسم ادا ہوجانے دو۔"

"میں وہاں سے چلا آیا۔ شہلا مجبور تھی۔ یہ سمجھ رہی تھی کہ منگنی نہیں ہوگی تو میں اس کا کام نہیں کروں گا۔ بہرحال بڑی دھوم دھام سے منگنی ہوگئی.........."

☆======☆======☆

زبیر حسن اپنے مقتول بیٹے اسد کی ڈائری پڑھ رہا تھا۔ وہ پڑھتے پڑھتے رک گیا۔ بڑے دکھ سے سوچنے لگا۔ "آہ! میرا ایک ہی بیٹا تھا۔ نہ جانے کن بازاری ماں بیٹی کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔ ان کا خاندان بظاہر اعلیٰ ہے۔ وہ ارب پتی لوگ ہیں لیکن ان کے اعمال شیطانی ہیں۔"

زبیر حسن صدمے سے نڈھال تھا۔ بڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا پھر ڈائری کا ورق الٹ کر پڑھنے لگا۔ اس نے لکھا تھا۔

"میں اپنا ایک وعدہ پورا کرچکا ہوں۔ امیر احمد کا کام تمام کرچکا ہوں۔ شہلا بہت خوش ہے۔ قسمیں کھا رہی ہے کہ سدرہ کی ہلاکت کے بعد مجھ سے ضرور شادی کرے گی۔

"اب میں اس کی باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ اس کے لئے جو کر رہا ہوں۔ اس کا معاوضہ سود سمیت وصول کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا۔ "شہلا! میں ایک بات صاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں۔ مجھے تم پر بھروسا نہیں ہے۔ آئندہ تم میری خواہش پوری کرو گی۔ تب میں سدرہ کا کام تمام کروں گا۔"

"تمہاری خواہشات کو خوب سمجھتی ہوں۔ تم میرے حسن وشباب کو دیکھ کر للچاتے رہتے ہو اور للچاتے رہو گے۔ میں تمہیں کام کے عوض لاکھ دو لاکھ دس لاکھ روپے دے

سکتی ہوں مگر یہ حسن و شباب نہیں دوں گی۔ یہ کسی اور کے لئے ہے۔"

"کون ہے وہ خوش نصیب؟"

"نام نہیں بتاؤں گی۔ وہ میرے حکم کا غلام ہے۔ تم کام نہیں کرو گے تب میں اسے استعمال کروں گی۔"

"تم خود کو بہت چالاک سمجھتی ہو۔ یہ میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تم وفا نہیں کرو گی۔ لہٰذا تمہیں شروع ہی سے اپنے شکنجے میں رکھنا چاہئے۔"

"اچھا تو تم نے مجھے شکنجے میں رکھا ہے؟ بھلا وہ کیسے؟"

"میں نے لباس کے اندر سے پاکٹ سائز ریکارڈر نکالا۔ اسے ریوائنڈ کر کے سنایا۔ وہ اب تک جو بول رہی تھی' وہ اسے ریکارڈر سے سنائی دے رہا تھا۔ وہ سن رہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "یہ صرف ایک کیسٹ نہیں ہے۔ تم جس دن سے سدرہ اور امیر احمد کے مرڈر کی پلاننگ کر رہی ہو' اس دن سے میں تمہاری ایک ایک بات ریکارڈ کرتا جا رہا ہوں۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "اس ریکارڈنگ سے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟ پلاننگ میں تم میرے ساتھ ہو۔ کسی کو بھی سناؤ گے تو میرے ساتھ تم بھی قانون کی گرفت میں آؤ گے۔"

"جب ڈوبنے لگوں گا تو تمہیں بھی ساتھ لے کر ڈوب جاؤں گا۔ ایسا وقت نہ آنے دو۔ کسی حکم کے غلام کو میرا رقیب نہ بناؤ۔ پولیس اور عدالت کے چکر میں ڈالوں گا تو چکرا کر رہ جاؤ گی۔"

"وہ بڑی دیر تک سوچتی رہی۔ ٹہلتی رہی۔ مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "میں تمہاری بات مانوں گی لیکن ایک شرط ہے۔ اب تک جتنے کیسٹ ریکارڈ کئے ہیں' انہیں میرے حوالے کر دو پھر میری راتیں تمہارے لئے ہوں گی۔"

"بہت معمولی شرط ہے۔ میں تمام کیسٹس تمہیں دے دوں گا لیکن انہیں لے کر کیا کرو گی؟ وہ تو ڈپلیکیٹس ہوں گی۔ تمام ماسٹر کیسٹس میرے پاس رہیں گے۔"

"وہ مٹھیاں بھینچنے لگی۔ ہونٹ چبانے لگی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ مجھے گولی مار دیتی۔ میں نے کہا۔ "جلدی نہیں ہے۔ اچھی طرح سوچ لو۔"

وہ بولی۔ "سوچنے کے لئے کیا رہ گیا ہے؟ تم ساری زندگی بلیک میل کرتے رہو گے۔

بہتر یہ ہوگا کہ تم سے شادی کرلوں۔ میں ممی سے کہوں گی تو وہ جلد ہی شادی کی تاریخ مقرر کریں گی۔"

"شادی تو ہوتی رہے گی۔ اس سے پہلے تم میری راتیں رنگین کرو گی۔ پہلی بار جب رات گزارو گی تب میں اسی رات سدرہ کو ختم کر دوں گا۔"

"وہ راضی ہوگئی۔ ہم نے ایک مکمل منصوبہ بنایا۔ اس کے مطابق میں نے ایک رات شہلا کے بیڈ روم میں آکر بیڈ پر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔ اس کی رضامندی سے اس کا لباس پھاڑ دیا تاکہ معلوم ہو کہ قاتل نے اس کے ساتھ زیادتی کی' اس کے بعد سدرہ کے بیڈ روم میں جا کر اسے قتل کرنے کی کوشش کی۔

"یہ منصوبہ زبردست تھا۔ کسی کو شبہ نہ ہوتا کہ یہ واردات شہلا کرا رہی ہے۔ وہ مظلوم بن گئی تھی۔ اس کی عزت لٹ گئی تھی۔ میری خواہش بھی پوری ہوگئی تھی لیکن میں سدرہ کے بیڈ روم میں جا کر ناکام رہا۔ اگرچہ شہلا نے پہلے ہی سدرہ کے پستول کو خالی کر دیا تھا۔ وہ میری فائرنگ سے ضرور ہلاک ہوتی لیکن وہ بڑی چالاکی سے باتھ روم میں جا کر بند ہوگئی۔ میرے حملے سے بچ گئی۔

"بعد میں شہلا نے ناراضگی دکھائی اس نے کہا۔ "تم جانتے تھے کہ سدرہ نے مارشل آرٹ سیکھا ہے۔ وہ بہت تیز طرار ہے پھر تم نے وقت کیوں ضائع کیا۔ اس کے سامنے پہنچتے ہی فائر کرتے تو اسے بچ نکلنے کا موقع نہ ملتا۔"

"مجھ سے واقعی غلطی ہوئی تھی۔ دراصل میں خرم کے انداز میں بول کر یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ اپنے ہی عاشق کے ہاتھوں ماری جا رہی ہے۔

"یہ سچ ہے کہ مقدر میں زندگی لکھی ہو تو موت نہیں آتی۔ آئندہ میں مکمل احتیاطی تدابیر پر عمل کرتے ہوئے اس پر حملہ کروں گا۔ اس بار وہ بچ نہیں پائے گی۔ میں ایک بار ٹھوکر کھانے کے بعد سنبھل جاتا ہوں۔ اس کی موت لازمی ہے۔"

☆======☆======☆

اس کے بعد ڈائری کے صفحات خالی تھے۔ لکھنے والے کو موت نے مہلت نہیں دی تھی کہ وہ واپس آکر سدرہ پر دوسرا ناکام حملہ کرنے کی روداد لکھتا۔ زبیر حسن ڈائری بند کرکے رونے لگا۔

ایک گھنٹے بعد وہ ڈائری لے کر سرفراز کے پاس آیا اور بولا۔ "امیر احمد کے مرڈر کیس کو آپ ڈیل کر رہے ہیں۔ بے شک میرے بیٹے نے اسے قتل کیا تھا۔ اس نے سدرہ پر بھی قاتلانہ حملے کئے تھے اس کا خود ہی قتل ہوگیا۔"

سرفراز نے کہا۔ "وہ اسپتال میں مارا نہ جاتا تو اسے پھانسی کے پھندے سے لٹکا دیا جاتا۔ اسے تو مرنا ہی تھا۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔"

وہ اس کے سامنے ڈائری رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ میرے بیٹے کی ڈائری ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ کس طرح شہلا نے اسے پھانس کر قاتل بنایا تھا۔ آپ اسے پڑھیں گے تو بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوسکیں گی۔"

سرفراز نے کہا۔ "اس مرڈر کیس نے اُلجھا دیا ہے۔ یہ تو ثابت ہوچکا ہے کہ شہلا اور اسد کی سازشوں سے امیر احمد کو مارا ہے۔ وہ دونوں عدالت سے سزا پانے سے پہلے خود ہی سزائے موت تک پہنچ گئے۔ یہ کیس پھر بھی ختم نہیں ہوا۔ اس سوال کا جواب نہیں مل رہا کہ شہلا کو کس نے قتل کیا ہے؟"

زبیر حسن نے کہا۔ "شاید اس ڈائری سے کچھ معلوم ہوسکے۔"

وہ ڈائری پڑھنے لگا۔ اس کیس نے اسے الجھا دیا تھا۔ کئی سوالات جواب طلب تھے۔

ایک سوال یہی تھا کہ شہلا کو اسپتال میں کس نے گولی ماری ہے؟

دوسرا سوال یہ تھا کہ رئیس احمد کے بیٹے عمران پر کس نے گولی چلائی تھی۔ تیسرا مسئلہ یہ تھا کہ بیگم بانو اور رئیس احمد دولت مند اور اثر ورسوخ والے تھے۔ سرفراز جسے گرفتار کرتا تھا' اسے ضمانت پر چھڑا کرلے جاتے تھے۔

اس نے ڈائری پڑھنے کے بعد کہا۔ "شہلا نے آپ کے بیٹے کو پھانسا تھا۔ یہ الگ بات ہے لیکن آپ کا بیٹا اسد نادان نہیں تھا۔ اس نے بڑی چالاکی سے کیسٹس ریکارڈ کرکے شہلا کو جکڑ لیا تھا۔"

اس نے ڈائری کے ایک صفحے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں بیگم بانو اور یار محمد پر شبہ کر رہا تھا۔ اسے پڑھ کر میرے شبہے کو تقویت حاصل ہورہی ہے۔ بیگم اپنے شوہر رئیس احمد کی جانی دشمن ہے۔ وہ وصیت لکھنے کا انتظار کر رہی ہے۔ اس کے بعد رئیس احمد کو ہلاک کرائے گی۔"

زبیر حسن نے کہا۔ "یہ ڈائری اس عورت کے مجرمانہ عزائم کو پیش کر رہی ہے۔ آپ اسے اور یار محمد کو گرفتار کرسکتے ہیں۔"

سرفراز نے کہا۔ "ڈائری میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ رئیس احمد سے پہلے اس کے بیٹے عمران کو قتل کرنا چاہتے ہیں اور عمران پر قاتلانہ حملہ ہوچکا ہے۔"

زبیر حسن نے کہا۔ "اب تو شبہے کی گنجائش ہی نہیں رہی آپ سوچ کیا رہے ہیں۔ انہیں گرفتار کریں۔"

"میں ٹھوس ثبوت کے بغیر گرفتار نہیں کرسکوں گا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ ڈائری سب سے بڑا ثبوت ہے۔"

"یہ ڈائری اسد نے لکھی ہے۔ وہ مجرم تھا۔ قاتل تھا۔ یہ ڈائری ایک مجرم کا تحریری بیان ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بیگم بانو اور یار محمد عشق کر رہے ہیں۔ سازش کر رہے ہیں اور رئیس احمد سے پہلے عمران کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سب ایک مجرم نے لکھا ہے اور کسی ثبوت کے بغیر لکھا ہے۔ عدالت میں اس ڈائری پر غور کیا جائے گا لیکن ٹھوس ثبوت تسلیم نہیں کیا جائے گا۔"

زبیر حسن نے کہا۔ "یہ ڈائری مجرموں کی نشاندہی کر رہی ہے لیکن آپ انہیں کبھی گرفتار نہیں کرسکیں گے۔ گرفتاری کے بعد ان کا محاسبہ کیا جاسکتا ہے۔ ان سے اقبال جرم کرایا جاسکتا ہے لیکن آپ ایسا نہیں کریں گے۔ لائیے میرے بیٹے کی ڈائری دیجئے۔"

"یہ ڈائری ہمارے پاس رہے گی۔ تفتیش کے دوران میں کام آئے گی۔ عدالت میں پیش کی جاسکے گی۔ یہ آپ کی امانت ہے۔ کام نکلنے کے بعد اسے واپس کردیا جائے گا۔"

زبیر حسن اٹھ کر جانے لگا۔ سرفراز نے کہا۔ "جسٹ اے منٹ! آپ چاہتے ہیں

میں بیگم بانو اور یار محمد کو گرفتار کروں۔ ایسا آپ کے تعاون سے ہو سکتا ہے۔"

"میں نے اپنے بیٹے کی ڈائری دی ہے' اس سے زیادہ تعاون کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ کا بیٹا شہلا کی اہم باتیں ریکارڈ کرتا رہا تھا۔ وہ تمام کیسٹس کہیں چھپا کر رکھتا تھا۔ ڈائری کے مطابق شہلا نے کہا تھا کہ اس کی ماں رئیس احمد کو ہلاک کرانا چاہتی ہے لیکن اس سے پہلے عمران کو قتل کرانا چاہتی ہے۔ اگر آپ یہ کیسٹ لا کر مجھے دے دیں تو پھر میں بیگم بانو کا سختی سے محاسبہ کروں گا۔"

زبیر حسن نے کہا۔ "میں بیٹے کے کمرے میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارتا ہوں۔ اس کی تمام چیزوں کو محبت سے دیکھتا رہتا ہوں' لیکن کیسٹوں کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا۔ ویسے اس کی ایک الماری میں گانوں کے بہت سے کیسٹس رکھے ہوئے ہیں۔ میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں۔"

اس نے اٹھ کر مصافحہ کیا۔ سرفراز نے کہا۔ "مطلوبہ کیسٹ ملتے ہی آپ مجھے فون کریں۔ میں آپ کے گھر آؤں گا۔"

وہ چلا گیا۔ سرفراز بڑی سنجیدگی سے بیگم بانو کے بارے میں سوچنے لگا۔

☆======☆======☆

بیگم بانو نے دروازہ کھول کر پوچھا۔ "اندر آجاؤں؟"

لیڈی ڈاکٹر ہما نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بیگم بانو کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اپنی کرسی چھوڑ کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "آپ میرے ہسپتال میں آئی ہیں۔ فون کر دیتیں تو.......... میں فوراً آپ کے پاس چلی آتی۔"

بیگم اس کے ساتھ اندر آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہاں دو مریض عورتیں پہلے سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر ہما نے ان سے کہا۔ "ابھی باہر جاؤ۔ میں تھوڑی دیر بعد بلاؤں گی۔"

وہ دونوں ناگواری سے منہ بنا کر چلی گئیں۔ بیگم نے کہا۔ "ادھر سے گزر رہی تھی۔ سوچا تم سے ملتی چلوں۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہے۔ آپ یہاں آئی ہیں۔ کیا پئیں گی ٹھنڈا یا گرم؟"

"کچھ نہیں۔ ایک اہم معاملے میں مشورہ لینا چاہتی ہوں۔ تم ہماری فیملی ڈاکٹر ہو۔ ہمارے گھریلو حالات سے اچھی طرح واقف ہو۔"

"جی ہاں۔ میں امیر احمد کے سلسلے میں تعزیت کے لئے آئی تھی۔ آپ صدمے سے نڈھال تھیں۔ شہلا کا پوسٹ مارٹم میں نے ہی کیا تھا۔ ایک مہینے میں آپ کے دو جوان بچے آپ کو جدائی کا صدمہ دے گئے ہیں۔ پتا نہیں کس بدبخت کو آپ سے دشمنی ہے۔ کیا کسی قاتل کا سراغ مل رہا ہے؟"

"وہ دشمن تو نظروں کے سامنے ہے۔ رئیس کی پہلی بیوی کا بیٹا ہے لیکن رئیس احمد اسے قتل کے الزام سے بچا رہا ہے۔ ایک بیٹی سدرہ رہ گئی ہے۔ اس پر بھی قاتلانہ حملے ہو رہے ہیں۔ اگر رئیس کے بیٹے عمران کو قیدی بنا کر رکھا جائے تو حملے بند ہو جائیں گے۔ ثابت ہو جائے گا کہ وہی قاتل ہے۔"

"تو پھر اسے گرفتار کیوں نہیں کیا جا رہا؟"

"رئیس نے اس کی ضمانت لی ہے۔ اسے گرفتار نہیں کیا جائے گا۔"

"میں آپ کے بارے میں سوچتی ہوں تو دل دکھتا ہے۔ جوان بیٹا بہت بڑا سرمایہ ہوتا ہے۔ آپ سے یہ سرمایہ چھین لیا گیا ہے۔"

"دولت اور جائیداد چھین لی جائے تو دوبارہ حاصل ہو جاتی ہے۔ ایک ہی بیٹا اور وہ قتل ہو جائے تو کیا دوسرا بیٹا حاصل ہو سکتا ہے؟"

"نہیں ہو سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔"

"میں سمجھ سکتی ہوں' یہ ناممکن نہیں ہے۔"

ڈاکٹر ہما نے بیگم کو حیرانی سے دیکھا پھر پوچھا۔ "یہ کیسے ممکن ہے؟"

"کیا میں ماں نہیں بن سکتی؟ ایک بیٹا پیدا نہیں کر سکتی؟"

"او آئی سی۔ میں آپ کی محرومی سمجھ رہی ہوں۔ میرے حساب سے آپ پینتالیس برس کی ہیں۔ صحت اچھی ہے۔ کوئی میجر پرابلم نہیں ہے۔ آپ ماں بن سکتی ہیں۔"

"میں چاہتی ہوں تم ابھی میرا مکمل چیک اپ کرو۔ میں اسی لئے آئی ہوں۔ اپنی پوزیٹو رپورٹ دیکھ کر مطمئن ہونا چاہتی ہوں۔"

ڈاکٹر ہما نے اٹھ کر کہا۔ "میرے ساتھ آیئے۔"

بیگم اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ کر ایک بیڈ پر لیٹ گئی۔ ڈاکٹر ہما دروازے کو اندر سے بند کر کے اسے چیک کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "اگر بیٹا زندہ ہوتا تو آپ دوسرے بیٹے کی آرزو نہ کرتیں۔"

"دوسرا بیٹا صرف آرزو نہیں ہے' میری بہت اہم ضرورت ہے؟"

"رئیس کا ایک جوان بیٹا ہے۔ اگر میں نے بیٹا پیدا نہ کیا اور مرگئی تو میری تمام دولت و جائیداد رئیس کو ملے گی اور رئیس میرا سب کچھ اپنے بیٹے کو دے دے گا۔ میں ایک بیٹا پیدا کر کے ہی اپنا سب کچھ اس کے نام لکھ دوں گی۔ کسی کو ایک پھوٹی کوڑی نہیں دوں گی۔"

"پھر تو واقعی ایک بیٹا ضروری ہے لیکن وہ بھی تو آپ کے شوہر رئیس سے ہوگا۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ میرا ہوگا۔ میں اسے جنم دوں گی۔ میں اسے دودھ پلاؤں گی۔ وہ میرا کہلائے گا۔ میرا وارث ہوگا۔"

وہ ایک گھنٹے تک اسپتال میں رہی۔ ڈاکٹر ہما سے باتیں کرتی رہی پھر میڈیکل رپورٹ آئی کہ کوئی میجر پرابلم نہیں ہے۔ وہ اچھی خاصی صحت مند ہے۔ ڈاکٹر ہما نے کہا۔ "آپ ماں بن سکتی ہیں۔"

وہ ہما کا شکریہ ادا کر کے گھر آئی۔ سدرہ کہیں باہر جا رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کہاں جا رہی ہو؟"

سدرہ نے کہا۔ "کیا مجھے بتا کر کہیں جانا ہوگا؟"

"دشمن تمہاری جان کے پیچھے پڑے ہیں۔ تمہیں اپنے ساتھ ایک باڈی گارڈ رکھنا چاہئے۔"

"ایک نہیں دس باڈی گارڈز رکھے جائیں۔ تب بھی موت آئے گی۔ اگر مقدر میں موت نہ ہو تو کوئی مجھے ہزار تدابیر کے باوجود نہیں مار سکے گا۔"

"پھر بھی اپنی طرف سے احتیاطی تدابیر ضروری ہیں۔ تم دو چار مہینوں کے لئے ملک سے باہر چلی جاؤ؟"

"شادی کے بعد خرم کے ساتھ سوئٹزر لینڈ جاؤں گی۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "دوستی کی حد تک خرم ٹھیک ہے' اسے لائف پارٹنر بنانا حماقت ہوگی۔"

اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "لائف پارٹنر کیسا ہوتا ہے؟ ڈیڈی کے جیسا' یا انکل یار محمد کے جیسا؟"

اس نے سختی سے ہونٹوں کو بھینچ لیا۔ وہ اس بات پر بیٹی کو گالیاں دے سکتی تھی۔

کوئی معقول جواب نہیں دے سکتی تھی۔ سدرہ منہ توڑ جواب دے کر چلی گئی۔ وہ تھوڑی دیر تک غصے سے سوچتی رہی پھر اس نے ملازم کو بلا کر پوچھا۔ "صاحب گھر میں ہیں؟"

"جی ہاں۔ اپنے کمرے میں ہیں۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے' سوچتے ہوئے ادھر جانے لگی۔ اپنے دماغ میں تدبیر پکانے لگی کہ آئندہ اسے کیا کرنا ہوگا؟

اس نے دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔ اندر سے رئیس احمد کی آواز ئی۔ "کم ان۔"

وہ دروازہ کھول کر اندر آئی۔ رئیس احمد نے اسے دیکھ کر کہا۔ "اچھا تم ہو۔ آج میرے بیڈ روم میں کیسے آگئیں؟"

"رشتہ ایسا ہے کہ آنا ہی پڑتا ہے۔ ہمارے دو بچوں کو بے دردی سے ہلاک کیا گیا ہے۔"

"آگے کچھ کہنے سے پہلے گنتی درست کرو۔ ہمارے دو نہیں تھے۔ ان میں سے امیر احمد میرا بیٹا تھا۔ شہلا میری بیٹی نہیں وہ تمہاری تھی۔"

"میرے ہوں یا تمہارے ہوں۔ ہمارے دو بچے مارے گئے ہیں۔ صرف ایک بیٹی رہ گئی ہے۔ آپ اس کی حفاظت کے لئے کیا کر رہے ہیں؟"

"میں نے کوٹھی کے اندر اور باہر سکیورٹی گارڈز کی تعداد بڑھائی ہے۔ سدرہ اپنے ساتھ کسی گارڈ کو پسند نہیں کرتی۔ ویسے وہ مارشل آرٹ جانتی ہے۔ نشانہ بھی اچھا ہے۔ اسد کو دو گولیاں اسی نے ماری تھیں۔ اس کے پاس بھرا ہوا پستول رہتا ہے۔ تم اور کیا چاہتی ہو؟"

"میں جو چاہوں گی' وہ تم کبھی نہیں کرو گے۔"

"معلوم تو ہو کہ کیا چاہتی ہو؟"

"اپنے بیٹے عمران کو ملک سے باہر بھیج دو۔ وہ یہاں نہیں رہے گا تو میری بیٹی کے سر سے خطرہ ٹل جائے گا۔"

وہ مسکرانے لگا۔ اس نے پوچھا۔ "کیوں مسکرا رہے ہو؟"

"میرا بیٹا باہر جائے گا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس ملک کے کس شہر میں رہنے گیا ہے۔ وہاں تم آسانی سے اس پر حملے کرا سکتی ہو۔"

"تم بکواس کر رہے ہو؟"

"یہ بکواس نہیں ہے۔ تم ایک بار اس پر حملہ کرا چکی ہو۔ وہ صرف زخمی ہوا۔ اس کا تمہیں سخت افسوس ہے۔"

"تمہارے الزام دینے سے میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔"

"اسی طرح میرے بیٹے کا بھی کچھ نہیں بگڑ رہا ہے۔ تم اسے قاتل کہتی پھر رہی ہو۔ تم نے اس کے خلاف رپورٹ درج کرائی ہے۔ اس کے خلاف عدالتی کارروائی کی تیاریاں کر رہی ہو۔ کرتی رہو۔ میں تمہیں منہ توڑ جواب دیتا رہوں گا۔"

"تم تو شادی کے پہلے دن سے میرے دشمن ہو۔ پچھلے چوبیس برسوں میں ہر معاملے میں مخالفت کرتے آ رہے ہو۔ یہ میرا ہی حوصلہ ہے کہ میں ایک چھت کے نیچے گزارا کر رہی ہوں۔"

"تم میرے ساتھ گزارا کرنے پر مجبور ہو۔ اپنے باپ کی وصیت کے مطابق مجھ سے طلاق نہیں لے سکتیں۔ طلاق لو گی تو کروڑوں کے کاروبار سے تمہیں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔ میری بیوی بن کر رہو گی تو اپنی اولاد کے لئے کروڑوں کی جائیداد چھوڑ کر مرو گی' اولاد دعائیں دے گی اور اب تو ایک ہی بیٹی رہ گئی ہے۔"

وہ زیرِ لب مسکرانے لگی۔ رئیس نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنی کروڑوں کی جائیداد کا وارث پیدا کرنے والی ہے۔ اس نے کہا۔ "مجھے الزام دیتے ہو کہ میں تمہارے بیٹے کو ہلاک کرانا چاہتی ہوں۔ میں ایسے جھوٹے الزام سے بچنے کے لئے یہاں سے جا رہی ہوں۔ دو مہینے کسی پہاڑی علاقے میں گزاروں گی۔"

"معلوم ہوتا ہے' دور کی کوڑی لانے والی ہو.......... اس لئے جا رہی ہو۔"

"تم اپنے طور پر کچھ بھی سمجھ لو۔ میں کل یہاں سے جا رہی ہوں۔"

وہ مزید کچھ کہے سنے بغیر کمرے سے چلی گئی۔ رئیس احمد سوچنے لگا' یہ دو مہینے کے لئے پہاڑی علاقے میں کیوں جا رہی ہے؟ کیا وہاں سے میرے بیٹے کی طرف میزائل داغے گی؟ وہ طنزیہ انداز میں میزائل کی بات سوچ کر مسکرانے لگا۔ وہ اس پہلو سے سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بیگم بیٹے کی صورت میں میزائل تیار کرنے والی ہے۔ اگر سوتیلا عمران کسی طرح مر جائے گا تو رئیس کا تمام کاروبار تمام دولت اور جائیداد بیگم کے بیٹے کو قانونی طور پر ملے گی۔

اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر پنچ کئے پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ "میں بول رہی ہوں۔ کیا رپورٹ ہے؟"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "جناب! بیگم صاحبہ روٹین کے مطابق ڈومین ویلفیئر ایسوسی ایشن گئی تھیں پھر وہاں سے ہما اسپتال گئیں۔"

"کیا وہاں اس کی کوئی سہیلی یا شناسا بیمار ہے؟"

"وہ کسی بیمار کے پاس نہیں گئیں۔ دو گھنٹے تک ڈاکٹر ہما کے ساتھ اس کے چیمبر میں رہیں۔ شاید میڈیکل چیک اَپ کرا رہی تھیں۔"

"ہوں۔ اپنے تمام آدمیوں سے کہو۔ وہ کل کسی پہاڑی علاقے میں جا رہی ہے۔ مجھے یہ رپورٹ ملتی رہنا چاہئے کہ وہ کہاں جائے گی اور وہاں اپنے شب و روز کیسے گزارے گی۔"

وہ ریسیور رکھ کر سوچنے لگا۔ ہما ان کی فیملی ڈاکٹر تھی۔ اس کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ اس نے ریسیور اٹھا کر اس کے نمبر پنچ کئے پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ "ہیلو ہما' میں ہوں رئیس احمد۔"

وہ چہک کر بولی۔ "او۔ آپ ہیں۔ دو گھنٹے پہلے بیگم صاحبہ آئی تھیں۔ وہ اسپتال کو کم از کم ایک لاکھ روپے ڈونیشن ضرور دیں گی۔ وہ بہت خوش ہیں۔"

"میں تمہیں دو لاکھ روپے ڈونیشن دوں گا۔ وہ خوش کیوں ہے؟"

"آہ۔ وہ.......... بس یونہی.......... آپ تو جانتے ہیں وہ موڈی ہیں۔"

"تم کچھ چھپا رہی ہو۔"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"کیا تم دو لاکھ نہیں لینا چاہتیں؟ اپنا اکاؤنٹ نمبر بتاؤ۔ کل یہ رقم جمع ہو جائے گی۔"

اس نے بینک اکاؤنٹ نمبر بتانے کے بعد کہا۔ "آپ بیگم صاحب سے نہیں کہیں گے کہ میں نے یہ بتایا ہے۔"

"مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں نہیں بتاؤں گا۔"

"آپ کی بیگم صاحبہ ایک بیٹا پیدا کرنا چاہتی ہیں۔"

"وہاٹ؟" رئیس نے حیرانی سے پوچھا۔ "اس عمر میں؟"

"وہ.......... صحت مند ہیں۔ میں نے چیک اپ کیا ہے۔ پازیٹو رپورٹ ہے۔ وہ ماں

بن سکتی ہیں۔"

"ہوں۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جوان بیٹا مارا گیا اس لئے وہ بیٹے کی کمی پوری کرنا چاہتی ہے مگر اس میں ایسی کیا بات ہے کہ تم بتانے سے کترا رہی تھیں۔"

"بات کچھ اور بھی ہے۔ وہ اپنی اور آپ کی تمام دولت اپنے نام کرنا چاہتی ہیں۔"

"آئی سی۔ بات سمجھ میں آگئی۔ تھینک یو ہما۔ دو لاکھ تمہارے اکاؤنٹ میں پہنچ جائیں گے۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ بیگم کی اس پلاننگ سے یہ بات اور واضح ہوگئی کہ وہ عمران پر قاتلانہ حملے کرا رہی ہے۔ عمران کی ہلاکت کے بعد وہی ایک بیٹا وارث بنے گا جو ابھی پیدا نہیں ہوا ہے۔ اسے یقین ہے کہ پیدا کرلے گی۔

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ یہ اچھی طرح سمجھ میں آگیا تھا کہ دو ماہ کے لئے کسی پہاڑی علاقے میں کیوں جا رہی ہے؟ اس کے دماغ میں ایک بات مستحکم ہو رہی تھی۔ اگر اس بیٹے کو' اس وارث کو پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم کر دیا جائے تو؟"

اس کی عقل نے سمجھایا۔ یہ مناسب نہیں ہوگا۔ تین انسانی جانیں جا چکی ہیں۔ سدرہ پر قاتلانہ حملے ہو رہے ہیں۔ اسے کسی واردات میں ملوث نہیں ہونا چاہئے۔ کسی سیدھی اور آسان سی تدبیر پر عمل کر کے بیگم کو اس کے ارادوں میں ناکام بنانا چاہئے۔

وہ بڑی دیر تک سوچتا رہا پھر فون کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ریسیور اٹھا کر نمبر پنچ کرنے لگا۔ چند سیکنڈ میں رابطہ ہوگیا۔ اس نے کہا۔ "ہیلو' میں رئیس احمد بول رہا ہوں۔ زبیری کو میرا نام بتاؤ۔"

اسے انتظار کرنے کے لئے کہا گیا۔ تھوڑی دیر بعد زبیری کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو رئیس! بڑے دنوں بعد یاد کیا ہے؟ خیریت تو ہے میں کیسے یاد آگیا؟"

"مجھے کھاتے وقت ٹھسکا لگا تو خیال آیا کہ تم مجھے یاد کر رہے ہو۔ بھئی لنچ اور ڈنر کے وقت یاد نہ کیا کرو۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "باتیں نہ بناؤ۔ تم پکے کاروباری ہو۔ تم نے کسی مقصد سے فون کیا ہے۔"

"یہ تو ہے۔ جب دوستی ہے تو ایک دوسرے سے کوئی کام پڑ ہی جاتا ہے۔ شہر میں ہزاروں ڈاکٹر ہیں لیکن تم صرف ڈاکٹر نہیں دوست بھی ہو۔ رازداری سے میرا ایک کام کر

سکتے ہو۔"

"کام بولو۔"

"تم خاندانی منصوبہ بندی کے شعبے میں ہو۔ تم لوگوں کا مشن ہے کہ بچے کم ہوں۔ اب میں یہی چاہتا ہوں بچے کم خوشحال گھرانہ۔"

زبیر نے کہا۔ "تمہاری آخری بیٹی سدرہ ہے۔ اس کے بعد بیس برس ہو چکے ہیں۔ تمہاری کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ کیا اس عمر میں اندیشہ ہے کہ بچے ہوں گے؟"

"ہو سکتے ہیں۔ میرا میڈیکل چیک اپ کرو گے تو پتا چلے گا۔ میں گیا گزرا نہیں ہوں۔"

"مانتا ہوں' بڑھاپے میں بھی اولاد ہوتی ہے۔ تم محتاط رہنا چاہتے ہو۔ آئندہ کوئی بچہ نہیں چاہتے؟"

"ہاں احتیاط لازمی ہے۔"

"تو پھر کئی طرح کی بے ضرر دوائیں ہیں۔ میں دوائیں دوں گا۔ عارضی طور پر بچے کی پیدائش رک جائے گی۔"

"عارضی طور پر نہیں۔"

"پھر؟"

"میں ہمیشہ کے لئے بچے روکنا چاہتا ہوں۔ تم میری نس بندی کرو گے۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟"

"کیا تمہیں اعتراض ہے؟"

"مجھے کیا اعتراض ہوگا۔ یہ تو تمہارا کام ہے لیکن تمہاری دو بیویاں ہیں۔ کیا وہ اعتراض نہیں کریں گی؟"

"میں تم سے یہی رازداری چاہتا ہوں۔ میری کسی بیوی کو میری نس بندی کے بارے میں معلوم نہیں ہونا چاہئے۔"

"تم رازداری چاہتے ہو تو یہ بات میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

"تھینک یو زبیر!"

"کام ہونے کے بعد شکریہ ادا کرنا۔ کل صبح دس بجے چلے آؤ۔"

☆======☆======☆

وہ پہاڑی علاقے میں جانے کے لئے شاپنگ کرتی رہی۔ عورتیں صبح سے شام تک شاپنگ کرتی رہیں، تب بھی تھکن سے ان کی کمر نہیں جھکتی۔ گھر میں اگر ایک چیز یہاں سے اٹھا کر وہاں رکھنا ہو تو ہائے ہائے کرتے ہوئے بستر پر لیٹ جاتی ہیں۔ بیگم تین گھنٹوں تک ضروری اور غیر ضروری چیزیں خریدتی رہی پھر ایک ریسٹورنٹ میں آ گئی۔

وہاں یار محمد اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بیگم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے یہاں ایک بجے ملنے کو کہا تھا۔ میں اس وقت سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

وہ میز کی دوسری طرف بیٹھتے ہوئے بولی۔ "کوئی احسان نہیں کر رہے ہو۔ میں شام تک آتی تو تمہیں رات تک یہاں بیٹھنا تھا۔ تمہارا اور کام ہی کیا ہے؟"

"دوسرا اہم کام ہے۔ تم نے کہا تھا' اب عمران کے معاملے میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔ اب نہیں ہوگی۔ آج شام چھ بجے موقع ملے گا۔"

"کہاں موقع ملے گا؟ کیسے ملے گا؟ پہلے مجھے پلاننگ بتاؤ۔ پچھلی بار تم اسے گولی مارنے گئے تھے۔ تم سے پہلے کسی نامعلوم شخص نے اس پر گولی چلائی۔ اگرچہ اس نے وہی کیا جو تم کرنا چاہتے تھے لیکن اس کا نشانہ درست نہیں تھا۔ عمران زخمی ہو کر اسپتال گیا اور مرہم پٹی کروا کے واپس آ گیا۔"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ ہمارے علاوہ کوئی دوسرا بھی اس کا جانی دشمن ہوگا۔ آج تک معلوم نہ ہو سکا' وہ کون ہے؟"

"تم آج کیا کرنے والے ہو؟"

"مجھے چند گھنٹے پہلے معلوم ہوا آج شام چار بجے کلاتھ مرچنٹ یونین کے عہدے داروں کی میٹنگ ہے۔ عمران اس یونین کا جنرل سیکرٹری ہے۔ میٹنگ ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہے گی۔ عمران چھ بجے تک ہال سے باہر آئے گا۔ اس کاروبار سے تعلق رکھنے والے جلوس کی صورت میں ہوں گے۔ نعرے لگا رہے ہوں گے۔ اس بھیڑ میں اور ہنگامے میں اس پر گولی چلانا آسان ہوگا۔ میرے ریوالور میں سائیلنسر لگا ہوگا۔ شور غل میں فائرنگ کی مردہ آواز کسی کو سنائی نہیں دے گی۔"

"تم سینکڑوں افراد کے درمیان رہ کر گولی چلاؤ گے۔ کوئی تمہیں دیکھ بھی سکتا ہے؟"

"میرے آس پاس اپنے لوگ موجود ہوں گے۔ میں نے تمام پہلوؤں پر غور کیا ہے۔ اس بار وہ میرے ہاتھ سے نہیں بچے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم پورے اعتماد سے جا رہے ہو۔ میں منع نہیں کروں گی لیکن آج اس سوتیلے کو جہنم میں پہنچنا چاہئے' ورنہ میں تمہیں اپنے قریب نہیں آنے دوں گی۔"

"آج چھ بجے کے بعد تمہیں خوش خبری سناؤں گا اور انعام لوں گا۔ ویسے تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟"

"آج یہ کام کرو۔ کل میرے ساتھ پہاڑی علاقے میں چلو۔ تمہیں یہی کہنا تھا۔ سفر کی تیاری کرو۔ ہم دو ماہ تک مختلف علاقوں میں رہیں گے۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "اس کا مطلب ہے۔ نان اسٹاپ ہنی مون منائیں گے۔"

وہ مسکرانے لگی۔

یار محمد نے فون کے ذریعے اپنے آدمیوں سے رابطہ کیا۔ ان سے ہول سیل کلاتھ مارکیٹ کے حالات پوچھے۔ جواب ملا چار بج چکے ہیں۔ بڑے ہال میں میٹنگ جاری ہے۔ اس نے کہا۔ "میں ابھی وہاں پہنچ رہا ہوں۔ میرا سامان سائیلنسر کے ساتھ تیار رکھو۔"

وہ کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں جا رہا ہوں۔ میرے فون کا انتظار کرو۔ خوشخبری سناؤں گا۔"

وہ ریسٹورنٹ سے باہر آ کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ وہاں سے اپنے ٹارگٹ کی طرف جانے لگا۔

ہول سیل کلاتھ مرچنٹ کے دفتر کے سامنے سینکڑوں افراد ہاتھوں میں پلے کارڈ اور کپڑے کے بینر اٹھائے کھڑے تھے۔ سیلز ٹیکس میں اضافہ ہونے کے باعث احتجاج کر رہے تھے۔ اندر بڑے ہال میں میٹنگ جاری تھی۔ وہ اپنے بڑے عہدے داروں کا فیصلہ سننا چاہتے تھے۔

یار محمد وہاں آیا۔ اس کے چھ خاص آدمیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ایک نے کہا۔ "یار بھائی! اس تھیلے میں سامان ریڈی ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "سائیلنسر لگا ہوا ہے۔ یا لگانا ہوگا؟"

"لگا ہوا ہے۔ یہ پوری طرح لوڈ ہے۔ تم کو کچھ نہیں کرنا ہوگا۔ یہ تھیلا میرے ہاتھ میں ہے۔ ضرورت کے وقت اس میں ہاتھ ڈال کے سامان نکال لینا۔"

وہ آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ واردات کے بعد فرار ہونے کے راستوں کا جائزہ لینے لگا۔ سڑک کے اطراف کاریں اور دوسری طرف گاڑیاں کھڑی تھیں۔ پولیس والے'

جلوس کے شرکا کو ایک طرف ہٹا رہے تھے۔ ٹریفک کے لئے راستہ صاف کر رہے ...

ساڑھے پانچ بجے وہ تمام عہدیدار میٹنگ سے فارغ ہو کر باہر آئے۔ ان میں ... بھی تھا۔ جلوس کے شرکا انہیں دیکھ کر نعرے لگانے لگے۔ چیئرمین نے مائیک ... آکر کہا۔ "ہم نے اپنے اور آپ کے حق میں فیصلہ کیا ہے۔ اضافی ٹیکس ادا نہیں ... گے۔"

تمام لوگ تالیاں بجانے اور نعرے لگانے لگے۔ اتنے شور میں گولی چلائی جا ... لیکن عمران دو عہدے داروں کے پیچھے کھڑا تھا۔ یار محمد نے ساتھیوں سے کہا۔ "عمران ... کار کے قریب چلو۔ وہ ابھی اسی طرف جائے گا۔"

وہ ادھر جانے لگا۔ عہدے دار فیصلہ سنا رہے تھے کہ حکومت نے اضافی ٹیکس ... کیا تو ہڑتال کی کال دی جائے گی۔ تمام لوگ اس فیصلے سے خوش ہو کر نعرے لگا ... تھے۔ وہ تمام عہدے دار وہاں سے اپنی گاڑیوں کی طرف جانے لگے۔ عمران بھی اپنی ... کی طرف بڑھنے لگا۔ یار محمد اس کی کار سے دو گز کے فاصلے پر تھا۔ اس نے تھیلے میں ہا... ڈالا۔ ریوالور کے دستے کو مضبوطی سے پکڑا۔ عمران قریب آکر اپنی کار کا دروازہ کھولنا چاہتا تھا۔ یار محمد نے ریوالور تھیلے سے نکال لیا۔

ٹھیک اسی وقت ایک چپڑاسی دوڑتا ہوا عمران اور یار محمد کے درمیان آگیا۔ وہ ... سے بولا۔ "سر! دفتر میں آپ کے ڈیڈی کا فون ہے۔ وہ کوئی ضروری بات کرنا چاہ... ہیں۔"

عمران پلٹ کر دفتر کی طرف جانے لگا۔ چپڑاسی اس کے پیچھے تھا۔ وہ ذرا بھی ... اُدھر ہوتا تو یار محمد گولی چلا دیتا۔ ویسے عمران دور ہوتا جا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت عمران کی ... میں ایک زبردست دھماکا ہوا۔ کار کے پرخچے اڑنے لگے۔ آس پاس کے لوگ بھی اس کی ... زد میں آکر تنکوں کی طرح اچھلنے لگے اور گرنے لگے۔ ان میں یار محمد بھی تھا۔ وہ دور جا... گرا پھر گرنے کے بعد اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

عمران دفتری عمارت میں پہنچ کر حیرانی سے اور خوف سے اپنی کار کو دیکھ رہا تھا جس کا صرف ڈھانچہ باقی رہ گیا تھا۔ وہاں سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ دھواں دور تک پھیل رہا تھا۔ تمام لوگ بھاگتے ہوئے دور جاکر تماشہ دیکھ رہے تھے۔

سرفراز اپنے دفتر سے نکل کر گھر جانا چاہتا تھا۔ ایک ماتحت نے آکر کہا۔ "ہول سیل ...

کلاتھ مارکیٹ کے قریب کار کو بم کے دھماکے سے تباہ کیا گیا ہے۔ بڑی تباہی پھیلی ہے۔"

وہ بولا۔ "کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمارے شہر میں دہشت گردی روز کا معمول بن چکی ہے۔"

"سر! وہاں سے جو زخمی اسپتال پہنچائے گئے ہیں' ان میں یار محمد بھی ہے۔"

سرفراز نے چونک کر پوچھا۔ "یار محمد.........؟ کس اسپتال میں ہے؟"

وہ ماتحت کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر سول اسپتال پہنچا......... وہاں پہنچائے جانے والے زخمیوں کو فوری طبی امداد فراہم کی جا رہی تھی۔ دو چار زخمی ایسے بھی تھے جن پر سفید چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ وہ زخموں کی تاب نہ لاکر مر گئے تھے۔

سرفراز نے وہاں آکر ایک زخمی کو دیکھا پھر ایک لاش پر سے چادر ہٹائی تو یار محمد دکھائی دیا۔ اسے پھر چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ پولیس انسپکٹر نے پوچھا۔ "کچھ معلوم ہوا' کس کی کار میں بم رکھا گیا تھا۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "یونین کے جنرل سیکرٹری عمران احمد کی کار تھی۔ وہ تو بال بال بچ گیا۔ دوسرے مارے گئے۔"

سرفراز نے چونک کر پوچھا۔ "کون عمران احمد؟ معروف ٹیکسٹائل ملز کے مالک رئیس احمد کا بیٹا؟"

"جی ہاں۔ میں نے سنا ہے۔ اس سے پہلے بھی مسٹر عمران پر قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے؟"

سرفراز نے اسپتال کے کاؤنٹر پر آکر فون کے ذریعے رئیس احمد کو مخاطب کیا۔ "ہیلو۔ آپ کے صاحبزادے عمران کہاں ہیں؟"

"یہاں اپنے گھر میں اپنی ماں کے پاس۔ میرے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے دوسری بار بچایا ہے۔ وہ بری طرح سہما ہوا ہے۔"

"آپ اسے ریسیور دیں۔ میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ توجہ سے نہیں سن رہے ہیں۔ میں کہہ رہا ہوں۔ وہ حواس باختہ ہے۔ ہم سے بات نہیں کر رہا ہے۔ آپ سے کیا بات کرے گا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے۔ اسے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ وہ خود بخود نارمل ہو جائے گا۔"

"وہ مضبوط اعصاب رکھنے والا جوان ہے۔ یقیناً شاک پہنچا ہوگا لیکن دو چار گھنٹے میں

نارمل ہوجائے گا۔ میں اسے اپنے دفتر میں حاضر ہونے کا حکم نہیں دوں گا۔ رات دس بجے خود حاضر ہوجاؤں گا۔"

فون کا رابطہ ختم ہوگیا۔ رئیس نے ریسیور رکھ کر اپنی بیوی زرینہ کو اور عمران کو دیکھا۔ عمران ان کے سامنے بیٹھا جوس پی رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "آپ نے خواہ مخواہ سرفراز کو ٹال دیا۔ اب وہ رات دس بجے بور کرنے آئے گا۔"

"آنے دو۔ اس کی ڈیوٹی ہے سوالات کرنا۔ ہمارا فرض ہے جواب دینا۔ اس بار اسے یقین کرنا پڑے گا کہ تمہاری سوتیلی ماں نے تم پر حملہ کرایا ہے۔"

زرینہ نے کہا۔ "وہ ذلیل عورت نہ مرتی ہے۔ نہ میرے بیٹے کا پیچھا چھوڑتی ہے۔ بس بہت ہوچکا ہے۔ عمران اب یہاں نہیں رہے گا۔"

اس نے پوچھا۔ "یہاں نہیں رہوں گا۔ کیا آپ مجھے شہر چھوڑ کر جانے کو کہہ رہی ہیں؟"

"شہر نہیں' یہ ملک چھوڑ کر جاؤ گے تم۔"

"ممی! یہاں میرا لاکھوں روپے کا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔"

رئیس نے کہا۔ "میرا کروڑوں کا کاروبار ہے۔ ایک دن یہ تمہارا ہونے والا ہے۔ لاکھوں کا حساب نہ کرو۔ تمہاری ممی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تم یہ ملک چھوڑ کر جاؤ گے۔ ہم تمہاری سلامتی اور لمبی عمر چاہتے ہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے' مجھے کہاں جانا چاہئے؟"

"تم جہاں بھی جاؤ گے' رازداری سے جاؤ گے۔ میرا مشورہ ہے۔ یہاں سے نیویارک جاؤ۔ دشمن تم پر نظر رکھیں گے۔ تم موقع پا کر بڑی رازداری سے نیویارک چھوڑ دو گے۔ یورپ آجاؤ گے۔ وہاں لندن' پیرس' فرینکفرٹ کہیں بھی محفوظ رہ سکو گے۔"

زرینہ نے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ نیویارک جاؤں گی۔ تم وہاں ڈومیسٹک فلائٹ سے دوسرے شہر جاؤ گے۔ اس شہر سے یورپ چلے جاؤ گے۔ دشمن مجھے نیویارک میں دیکھ کر یہی سمجھیں گے کہ تم میرے ساتھ وہیں ہو۔"

"ممی! وہ اپنی ناکامی پر جھنجلا کر آپ کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

"میں اور تمہارے ڈیڈی مضبوط ڈھال ہیں۔ ڈھال کو زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا۔ تمہیں ہر حال میں محفوظ رہنا چاہئے۔"

"آپ دونوں کی یہی مرضی ہے تو میں جاؤں گا لیکن میری عدم موجودگی میں ڈیڈی میرے بزنس کی نگرانی کریں گے۔"

"ضرور کروں گا۔ فکر نہ کرو۔ یہاں جلد ہی تمہاری سوتیلی ماں کو اس کے اعمال کی سزا ملے گی۔ ہمیں ہمیشہ کے لئے اس سے نجات حاصل ہوگی پھر تم واپس آجاؤ گے۔"

زرینہ نے کہا۔ "جاؤ بیٹے! آرام کرو۔ ڈنر کے بعد سرفراز پریشان کرنے آئے گا۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ زرینہ نے کہا۔ "اس کمینی عورت نے بہت ہی زبردست حملہ کرایا ہے۔ میرے دل میں دہشت بیٹھ گئی ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ میں عمران کو کل کسی بھی فلائٹ سے روانہ کردوں گا۔ وہ اپنے بیٹے کی ہلاکت کے بدلے ہمارے بیٹے کی جان لینا چاہتی ہے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا ہے لیکن یہ سمجھنا نہیں چاہتی کہ اس کے بیٹے کو خود اس کی بیٹی شہلا نے ہلاک کرایا ہے۔"

زرینہ نے کہا۔ "وہ عورت نہیں چڑیل ہے۔ میرا بس چلے تو میں سیدھی اس کے سامنے پہنچ کر اسے گولی مار دوں۔ وہ تو یہ الزام دے رہی ہے کہ ہمارا بیٹا سدرہ پر حملے کر رہا ہے۔"

"وہ بکواس کرتی رہے گی۔ ہمارا عمران باہر جاکر محفوظ رہے گا۔"

وہ رئیس احمد کے قریب آکر بیٹھ گئی پھر دھیمی آواز میں بولی۔ "میں چاہتی ہوں' عمران آٹھ دس ماہ تک یورپ میں رہے۔"

"تم اتنے عرصے تک بیٹے کو نظروں سے دور رکھنا چاہتی ہو؟"

"ہاں' میں مجبور ہوں۔ اسے دور رہنا چاہئے۔"

"مجبوری دور ہوجائے گی۔ بیگم بانو اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ جائے گی۔"

"اس کا انجام تو برا ہے ہی۔ میری مجبوری دوسری ہے۔"

"دوسری مجبوری؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

وہ مسکرا کر بولی۔ "میں ماں بننے والی ہوں۔"

وہ حیرانی سے خوش ہو کر بولا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟ میں کیا سن رہا ہوں؟"

"آپ خوشخبری سن رہے ہیں۔"

"عمران کی پیدائش کے بعد ایک اور بیٹا اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں مگر کسی کو زندگی نہیں ملی۔ اس بار پوری طرح تمہارا میڈیکل چیک اپ کرایا جائے گا۔ تمہارے لئے ایک

لیڈی ڈاکٹر اور ایک نرس مقرر کروں گا۔ لیڈی ڈاکٹر روز تمہیں اٹینڈ کرتی رہے گی۔"

وہ خوش ہو کر رئیس کے سینے سے لگ گئی۔ رئیس نے پوچھا۔ "ابھی تم کس ... کا ذکر کر رہی تھیں؟"

"ہاں دو چار مہینوں میں میرا جسم پھولتا رہے گا اور میں نہیں چاہتی کہ ... یہاں رہے اور ماں کا پھولا ہوا جسم دیکھے۔ میں اس کے سامنے جھجکتی رہوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ بیٹا ہم سے دور رہے گا۔ بھئی تم نے تو کمال کر دیا۔ ... سوکن ماں بننے کی آرزو کر رہی ہے اور تم ماں بننے کی دوڑ میں اس سے آگے نکل ... ہو۔"

وہ گھور کر بولی۔ "وہ میرے بچے کی دشمن ماں بننا چاہتی ہے اور آپ اسے بننے دیں گے؟"

"ہرگز نہیں، میں کبھی نہیں چاہوں گا۔"

"مردوں کا کیا بھروسہ؟ آپ تو پی کر بہک جاتے ہیں۔ وہ آپ کو خوب پلائے گی۔ بوڑھی ادائیں دکھائے گی۔ آپ کو نشے میں جوان دکھائی دے گی پھر آپ اسے ایک بچے کا سرٹیفکیٹ دے دیں گے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "یہ سرٹیفکیٹ دینے والی بات خوب کہی۔ ویسے میں خوب پیوں گا۔ بہک بھی جاؤں گا پھر بھی وہ ماں نہیں بن سکے گی۔"

"اگر بنے گی تو میں آپ کا کیا بگاڑ لوں گی؟"

وہ جھک کر سرگوشی میں بولا۔ "میں نس بندی کرا رہا ہوں پھر وہ ماں کیسے بنے گی؟"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "وہ خوش فہمی میں مبتلا رہے گی۔ قبر میں جانے تک ماں بننے کی آس لگائے رہے گی۔"

وہ دل کھول کر ہنسنے لگی پھر بولی۔ "ایک بات بتاؤں۔ یہ بات تو کھل چکی ہے کہ شہلا آپ کی بیٹی نہیں تھی۔ بیگم کی بے شرمی کا جیتا جاگتا ثبوت تھی۔ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

رئیس نے جھوٹ کہا۔ "میں نہیں جانتا تھا۔ مجھے بھی بعد میں حقیقت معلوم ہوئی۔"

"میں اس بار آپ کو عمران کی قسم دیتی ہوں۔ آپ اس بے شرم عورت کو اپنی نس

بندی کے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔"

"میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں، نہیں بتاؤں گا۔"

"وہ بے حیا ہے گناہ کرے گی اور دوسرے کا گناہ آپ کے نام کرے گی۔ تب آپ دنیا والوں پر اس کی بے حیائی ثابت کر سکیں گے۔"

"میں یہی چاہتا ہوں۔"

☆======☆======☆

بیگم بڑی بے چینی سے یار محمد کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے کہا تھا، چھ بجے کے بعد اسے عمران کی ہلاکت کی خبر سنائے گا۔ اس نے گھر آ کر کسی سے فون پر بات نہیں کی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ فون بزی رہے اور وہ یار محمد کی کال نہ سن سکے۔

ایک بار فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے وومنز کلب کی سیکرٹری بول رہی تھی۔ بیگم نے کہا۔ "سوری، میں ابھی بات نہیں کر سکوں گی۔ اوور سیز سے ایک ضروری کال آنے والی ہے۔ میں بعد میں تمہیں کال بیک کروں گی۔"

وہ ریسیور رکھ کر بڑبڑانے لگی، پتا نہیں وہ خوشخبری سنانے والا کہاں مر گیا ہے؟ اگر وہ ناکام رہا ہے تب بھی اسے فون کرنا چاہئے تھا۔

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ سوچنے لگی، شام کو ہول سیل کلاتھ مارکیٹ میں اعلیٰ عہدے داروں کی میٹنگ تھی۔ یار محمد نے کہا تھا، وہاں لوگوں کا ہجوم رہے گا۔ وہ اس بھیڑ میں اپنا کام کر جائے گا اور اس نے ایسا کیا ہوگا۔ وہاں ہنگامہ ہوا ہوگا۔ اس علاقے کے تھانے سے کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

وہ پھر فون کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر پنچ کئے۔ رابطہ ہونے پر ایک سپاہی سے پوچھا۔ "ہیلو یہ پولیس اسٹیشن ہے۔ تم کون ہو؟"

"صاحب سیٹ پر نہیں ہیں۔ میں ان کا رائٹ ہینڈ بول رہا ہوں۔"

بیگم نے کچھ سوچ کر کہا۔ "میں صاحب کی وائف بول رہی ہوں۔ کیا اس علاقے میں کوئی واردات ہوئی ہے۔"

سپاہی نے اٹینشن ہو کر کہا۔ "سلام میڈم! ادھر دہشت گردی کی واردات ہوئی ہے۔ یونین کے ایک جنرل سیکرٹری ہیں۔ ان کا نام عمران احمد ہے۔ ان کی کار کو بم سے اڑایا گیا ہے۔ صاحب ادھر گئے ہیں۔"

بیگم نے خوشی سے چیخ کر پوچھا۔ "عمران احمد؟ وہ مرگیا؟"

"میڈم! کار کے پرخچے اڑ گئے پھر کار والا کیا بچا ہوگا؟"

وہ خوشی سے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ کر قہقہے لگانے لگی۔ بستر پر گر کر اِدھر اُدھر لوٹنے لگی۔ وہ دولت سے دنیا جہان کی خوشیاں خریدتی آئی تھی لیکن اتنی بڑی خوشی اس نے زندگی میں پہلی بار خریدی تھی۔ ایک سوتیلے کی موت نے اس کے اندر مسرتیں بھر دی تھیں۔

وہ بیڈ سے اتر کر کھڑکی کے پاس آئی پھر دروازے کے پاس گئی۔ اس کا جی اچھلنے کودنے اور ناچنے گانے کو چاہتا تھا۔ وہ خوب کھانا پینا اور کھلی فضا میں اڑتی پھرنا چاہتی تھی۔

اس نے آئینے کے سامنے آکر خود کو دیکھا۔ الماری سے دوسرا لباس نکال کر پہنا۔ ہلکا سا میک اپ کیا۔ اپنے ہینڈ بیگ میں نوٹوں کی گڈیاں رکھیں پھر گنگناتی ہوئی دروازے کے پاس آئی۔ اسے کھولا۔ سامنے ملازم کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "انسپکٹر سرفراز آئے ہیں۔"

جیسے خوشی سے جھوم جھوم کر ناچتی ہوئی مورنی اپنے بھدے پاؤں دیکھ کر اداس ہوجاتی ہے اسی طرح بیگم اپنی خوشی بھول گئی۔ سرفراز کا کوئی خوف نہیں تھا۔ صرف ایک بیزاری تھی کہ ایسے خوشی کے موقع پر وہ اپنے سوالات سے پریشان کرنے آگیا تھا۔

وہ ملنے سے انکار نہیں کرسکتی تھی۔ اسے کسی بہانے سے ٹال نہیں سکتی تھی۔ اگر ٹالنا چاہتی تو وہ اسے اپنے دفتر میں طلب کرسکتا تھا۔

وہ بڑی ناگواری سے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئی۔ وہاں سرفراز بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "سوری! آپ کو بے وقت زحمت دینے آیا ہوں۔ کیا کروں' میری ڈیوٹی ہی ایسی ہے۔"

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میں ایک ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنے جارہی ہوں۔ میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ آپ کو پندرہ منٹ دے سکتی ہوں۔"

وہ بولا۔ "ٹائم نکل آئے گا۔ آپ کو خبر ملی ہوگی کہ آپ کے سوتیلے بیٹے عمران کی کار کو ایک بم کے ذریعے تباہ کردیا گیا ہے۔"

وہ انجان بن کر بولی۔ "مجھے ایسی کوئی خبر نہیں ملی۔ یہ آپ کے منہ سے سن رہی ہوں۔ اگر وہ سوتیلا بم کے دھماکے میں مارا گیا ہے تو آپ مجھ پر شبہ کریں گے۔ اس کا باپ

تو مجھے ہی الزام دے گا۔"

"یہ تو ہو ہی رہا ہے۔ آپ اپنے بچوں کے قتل کے سلسلے میں عمران کو الزام دیتی ہیں اور عمران پر قاتلانہ حملے ہوتے ہیں تو مسٹر رئیس آپ کو الزام دیتے ہیں۔ ایک موٹی عقل سے بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ جتنی بھی وارداتیں ہو رہی ہیں' ان کے پیچھے میاں بیوی کی دشمنی چھپی ہوئی ہے۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم میاں بیوی ایک دوسرے کے بچوں کو قتل کرا رہے ہیں؟"

"اس پہلو سے شبہ ہوتا ہے اور ہو رہا ہے کہ آپ کے بچے رئیس کے بھی بچے ہیں لہٰذا ان بچوں سے عمران اور اس کی ماں کو دشمنی ہے۔"

"آپ درست سمجھ رہے ہیں۔ اب میری ایک ہی بیٹی سدرہ رہ گئی ہے۔ اس پر وہی سوکن اور اس کا بیٹا حملے کرا رہے ہیں۔ اب تو یہ کہنا چاہئے' حملے کرا رہا تھا۔ میری بیٹی کی جان لیتے لیتے خود اپنی جان سے چلا گیا۔"

"ٹھیک اسی طرح آپ کی سوکن اور مسٹر رئیس الزام دیتے ہیں کہ آپ عمران پر جان لیوا حملے کرا رہی ہیں پھر ہم کیوں نہ سوچیں اور سمجھیں کہ قاتل آپ ہی لوگوں کے درمیان چھپے ہوئے ہیں۔"

"میرے ہاتھ صاف ہیں۔ آپ ہمارے درمیان قاتل کو تلاش کریں۔ میرے سوتیلے ہی پکڑے جائیں گے۔ مجھ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ عمران میری سدرہ کے لئے موت کا گڑھا کھود رہا تھا۔ خود اس میں گرچکا ہے۔"

"آپ باربار یہ کیوں کہہ رہی ہیں کہ عمران گڑھے میں گرچکا ہے۔ عمران اپنی جان سے جاچکا ہے۔ کیا کسی نے آپ کو اس کی موت کی اطلاع دی ہے۔"

"ابھی تو آپ فرما رہے تھے کہ اس کی کار کو بم سے اڑایا گیا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ عمران اس میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ مارا گیا ہے۔"

بیگم کا دل ڈوبنے لگا۔ اس نے پریشان ہوکر پوچھا۔ "وہ مرا نہیں ہے؟ زندہ ہے؟"

"زندہ ہے۔ میں نے فون کیا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنے گھر میں ہے۔ دھماکے کے باعث اسے شاک پہنچا ہے۔ اب آپ کو بھی شاک پہنچ رہا ہے۔"

وہ اندر سے جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ یہ ظاہر نہیں کرسکتی تھی کہ واقعی شاک پہنچ

رہا ہے۔ سرفراز اسے بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”عمران ایک گولی سے مر سکتا تھا۔ اسے بم سے اڑانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”ہاں‘ پتا نہیں کیوں بم استعمال کیا گیا.........“

وہ بے خیالی میں بولتے بولتے رک گئی۔ ان لمحات میں یہی سوچ رہی تھی‘ یار محمد نے ریوالور سے کام کیوں نہیں لیا؟ وہ سنبھل کر بولی۔ ”آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟ بم کیوں استعمال کیا گیا‘ آپ قاتل سے جاکر پوچھیں۔“

”وہ جواب دینے کے قابل نہیں ہے۔ مرچکا ہے۔“

”کون؟“

”وہی جو عمران کو قتل کرنے گیا تھا۔ اس نے بم بلاسٹ کی ٹائمنگ صحیح طرح سیٹ نہیں کی تھی۔ اس سے غلطی ہوگئی۔ بم کار میں چھپا کر بھاگنے سے پہلے ہی دھماکا ہوگیا۔ ابھی آپ نے کہا تھا‘ عمران آپ کی سدرہ کے لئے گڑھا کھود رہا تھا‘ خود اس میں گر پڑا۔ اب میں کہتا ہوں یار محمد گڑھا کھودنے گیا تھا عمران کے لئے‘ اس موت کے گڑھے میں وہ خود گر پڑا۔“

وہ حیرانی اور بے یقینی سے بولی۔ ”یار محمد؟ نہیں وہ زندہ ہے۔ وہ بھلا وہاں کیوں جائے گا؟“

”وہ وہاں کیوں گیا تھا‘ یہ بتانے کے لئے وہ زندہ نہیں ہے‘ لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ وہ قتل کے ارادے سے گیا تھا اور اس واردات سے پہلے وہ آپ کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔“

”میرے ساتھ وہ اکثر ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتا تھا‘ اُس شام چار بجے بھی وہ میرے پاس سے اٹھ کر گیا تھا۔ ہماری اس ملاقات سے آپ کیا نتیجہ نکال رہے ہیں۔“

”میں نے ابھی کہا تھا‘ قاتل آپ لوگوں کے درمیان ہے۔ یہ بات درست نکلی۔ یار محمد آپ کا ایک فیملی ممبر تھا اور بہت کچھ تھا.........“ وہ آخری تین الفاظ کو طنزیہ انداز میں بولا۔

بیگم اس کے طنز کو نظرانداز کرکے بولی۔ ”وہ میرا کزن تھا۔ مجھے اس کی موت پر افسوس ہے۔“

”سول اسپتال کے مردہ خانے میں اس کی لاش ہے۔ آپ اسے لاکر دھوم دھام سے

اس کی آخری رسومات ادا کرسکتی ہیں۔“

”مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔ وہ میرا کزن تھا۔ کوئی سگا نہیں تھا۔ میں اس کے عزیزوں کو اطلاع دے رہی ہوں۔“

وہ موبائل آن کرکے رابطہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ بولا۔ ”آپ زحمت نہ کریں۔ پولیس اس کے عزیزوں تک پہنچ چکی ہے۔ اس کی ہلاکت کے سلسلے میں پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔“

اس نے موبائل آف کردیا۔

وہ بولا۔ ”آپ بتائیں یہاں تحریری بیان دینا چاہیں گی یا میرے دفتر میں چلیں گی۔“

”آپ مجھ سے کیا بیان لینا چاہتے ہیں؟“

”آپ نے اس کی ضمانت لی تھی.......... آپ جواب دہ ہیں کہ واردات سے پہلے وہ آپ کے پاس کیوں آیا تھا؟ اس کی لاش کے قریب ایک تھیلا پڑا ہوا تھا۔ اس تھیلے میں ایک سائیلنسر لگا ہوا ریوالور تھا۔ آپ اس سلسلے میں بہت کچھ جانتی ہیں۔ مجھ سے کھل کر باتیں نہیں کریں گی تو آپ کی مصیبت بڑھتی جائے گی۔“

”سیدھی اور سچی بات یہ ہے کہ وہ میرا رشتے دار تھا۔ رشتے میں کزن لگتا تھا اس لئے میں نے ضمانت لی تھی۔“

”اسپتال میں کسی نے آپ کی بیٹی شہلا کو گولی مار کر ہلاک کیا۔ وہاں سے بھاگنے والا ایک ہی شخص یار محمد تھا۔ ہم نے اسے گرفتار کیا۔ آپ نے اسے ضمانت پر رہا کرالیا۔ اگر آج بھی بم دھماکے کے بعد وہ بچ جاتا تو ہم اسے گرفتار کرتے اور پھر آپ اس کی ضمانت لیتیں۔ اس کے لئے مقدمہ لڑتی رہتیں۔“

”وہ میری نظروں میں بے گناہ تھا اس لئے ضمانت لی تھی۔ اگر بم دھماکے میں ملوث رہ کر زندہ رہتا تو اس کی ضمانت منسوخ کرا دیتی۔ کسی قاتل کی ضمانت کبھی نہ لیتی۔“

وہ ملازم سے کاغذ قلم منگوا کر اپنا بیان لکھنے لگی۔ سرفراز نے اس بیان کو پڑھ کر کہا۔ ”امیر کبیر لوگوں کے خلاف جرم ثابت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن ناممکن نہیں ہوتا۔ میں جلد ہی ثابت کروں گا کہ آپ یار محمد کے جرائم میں برابر کی شریک رہی ہیں۔“

”آپ ثابت کرتے رہیں۔ میں دو ماہ کے لئے پہاڑی علاقوں میں جارہی ہوں۔“

”سوری۔ آپ نے یار محمد کی ضمانت لی تھی۔ جب تک اس مرڈر کیس کی فائل کھلی رہے گی۔ آپ یہ شہر چھوڑ کر نہیں جائیں گی۔“

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ کوئی جواب سنے بغیر چلا گیا۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی' یار محمد سے میرے ناجائز تعلقات تھے۔ ان تعلقات کا ثبوت کسی کے پاس نہیں ہے لیکن سرفراز اچھی طرح سمجھ رہا ہے۔ وہ میرے خلاف ثبوت حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

"اونہہ' وہ کوشش کرتا رہے گا۔ اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا لیکن عمران مقدر کا سکندر ہے۔ وہ بڑے حملوں کے باوجود زندہ ہے۔ میرے لئے اب اپنا ایک بیٹا ضروری ہوگیا ہے۔"

"اس ہونے والے بیٹے کا باپ یار محمد ہوتا۔ اب وہ نہیں ہے اس لئے کسی دوسرے صحت مند جوان کو دوست اور رازدار بنانا ہوگا۔"

وہ سوچنے لگی کہ اس کے شناساؤں میں کون ایسا تگڑا جوان ہے جو رازدار بن کر اسے منزلِ مراد تک پہنچا سکتا ہے؟

☆------☆------☆

سدرہ اور خرم نے رجسٹرار آفس میں جاکر شادی کرلی۔ اپنے دو دوستوں اور ان کے والدین کو اپنی شادی کا گواہ بنالیا۔ اس کے بعد فون پر پہلے باپ کو اطلاع دی۔

"ہیلو ڈیڈی! پتا نہیں آپ مجھے مبارک باد اور دعائیں دیں گے یا نہیں؟ لیکن بتانا تو ہوگا' میں خرم سے کورٹ میرج کرچکی ہوں۔"

رئیس چند لمحات تک چپ رہا پھر بولا۔ "بڑی سرپرائز نیوز ہے۔ تم ہماری ایک ہی بیٹی زندہ سلامت رہ گئی ہو۔ میں تمہاری خوشیوں میں خوش ہوں۔"

"تھینک یوں ڈیڈی! آپ بہت فراخ دل ہیں۔"

"میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں۔ میری دعائیں ہیں' تم ہمیشہ شاد و آباد رہو۔ آئندہ کسی جانی دشمن کا سایہ تم پر نہ پڑے۔"

"نہیں پڑے گا۔ میں خرم کے ساتھ ہنی مون کے لئے باہر جارہی ہوں۔ آپ سوئٹزرلینڈ کے میرے بینک اکاؤنٹ میں فی الحال دس لاکھ روپے جمع کرادیں۔"

"مطلوبہ رقم تمہارے اکاؤنٹ میں پہنچ جائے گی۔ تم خرم کے ساتھ یہاں ملنے تو آؤ۔"

"سوری ڈیڈ! آپ کی وہ شاندار مہنگی کوٹھی قتل گاہ بن چکی ہے۔ اب میں وہاں قدم نہیں رکھوں گی۔ میں ہوٹل پرل میں ہوں۔ آپ کسی وقت آئیں۔ مجھے خوشی ہوگی۔"

"کل صبح دس بجے آؤں گا۔ اوکے۔"

سدرہ نے ریسیور رکھ کر خرم سے کہا۔ "ڈیڈی ہماری شادی سے خوش ہیں۔ کل ہم سے ملنے آئیں گے۔"

"تمہارے ڈیڈی واقعی فراخ دل ہیں۔ اب دیکھنا ہے' تمہاری ممی کا ری ایکشن کیا ہوگا۔ ویسے وہ مجھے سخت ناپسند کرتی ہیں۔"

"ماں کی پسند' ناپسند سے کیا ہوتا ہے؟ بیٹی تو تمہاری آغوش میں ہے۔"

وہ اسے آغوش میں لے کر خوش ہونے لگا۔ خوشیاں بانٹنے لگا۔ وہ کہنے لگی۔ "ہم یہاں سے پہلے لندن جائیں گے۔ وہاں تمہارے ابو کے علاج کے لئے رقم جمع کریں گے۔ ابو اور امی کی رہائش کا انتظام کریں گے۔ اس کے بعد سوئٹزرلینڈ جائیں گے۔"

"تم میرے لئے اور میرے والدین کے لئے بہت کچھ کر رہی ہو۔ میں سوچتا رہتا ہوں۔ تمہارے لئے کیا کروں؟ کس طرح تمہارے کام آؤں۔"

"کام تو آرہے ہو۔ میرے زبردست باڈی گارڈ ہو۔ بند کمرے میں بھی اور کمرے کے باہر بھی۔"

وہ ہنسنے لگے۔ ایک نئی زندگی انہیں مسرتیں دے رہی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر بعد اپنی ممی سے فون پر رابطہ کیا۔

"ہیلو ممی!"

بیگم بانو نے پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟ کل رات گھر نہیں آئیں۔ کنواری لڑکی راتوں کو گھر سے باہر نہیں رہتی۔"

"میں کنواری نہیں رہی۔ میری شادی خرم سے ہوچکی ہے۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو۔ تم ایک ٹیکسی ڈرائیور کو میرا داماد نہیں بناؤ گی۔ ہمارے اسٹیٹس کا خیال رکھو۔"

"آپ نے ہمیں بے حیائی کے علاوہ دیا ہی کیا ہے۔ صرف دولت مند ہونے سے اسٹیٹس نہیں بنتا۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور کا اسٹیٹس آپ سے اونچا ہے کیونکہ وہ آپ کی بیٹی کی عزت اور جان و مال کا محافظ ہے۔"

"کیا یہی بکواس کرنے کے لئے فون کیا ہے؟"

"ایک نئی زندگی کی ابتدا کی ہے۔ آپ سے دعائیں چاہتی تھی' سوچا تھا' آپ جیسی

بھی ہیں۔ ایسے وقت ضرور دعائیں دیں گی لیکن آپ تو ایسی ماں ہیں جو بددعا بن کر ہم مسلط رہتی ہیں۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ دوسری طرف بیگم اپنے بیڈ روم میں تھی۔ وہاں ایک صوفے پر ایک جوان شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنا موبائل فون آف کر کے بولی۔ "ہوں' تو تمہارا نام شیراز ہے۔ کیا کرتے ہو؟"

"میں سکیورٹی گارڈ کے طور پر مختلف شعبوں میں کام کرتا ہوں۔"

"پھر تو تم نے قتل بھی کئے ہوں گے؟"

"کسی کو دشمنی سے ہلاک کیا جائے تو اسے قتل کہتے ہیں۔ ڈیوٹی کے دوران میں مجرمانہ حملے کرنے والوں کو ہلاک کرنا قتل نہیں ہے۔ اسے فرض کی ادائیگی کہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ فرض کی ادائیگی کہلاتی ہے لیکن کیڑے مکوڑوں کی طرح بندے مارے جاتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر تم میرے لئے بھی بندے مار سکتے ہو۔"

"یہ تو میری ڈیوٹی ہے جو آپ کے لئے خطرہ بن کر آئے گا میں اسے گولی مار دوں گا۔"

"تنخواہ کیا لیتے ہو؟"

"ماہانہ پانچ ہزار روپے۔"

"میں دس ہزار دوں گی تمہاری نائٹ ڈیوٹی ہوا کرے گی شام سے صبح دس بجے تک تم تمام رات میرے بیڈ روم میں رہو گے۔"

"میں تو حکم کا بندہ ہوں آپ جہاں کہیں گی وہاں ڈیوٹی دوں گا۔ ہفتے میں ایک دن چھٹی لوں گا۔"

"کیا چھٹی ضروری ہے؟"

"ہاں جی میری بیوی لڑتی ہے۔ کہتی ہے ہر رات باہر گزارتے ہو ایک رات میرے ساتھ گزارا کرو۔"

"کیا بیوی سے ڈرتے ہو؟"

"ڈرتا تو نہیں ہوں وہ گھر والی ہے۔ مگر مجھے سکون سے رہنے کے لئے اسے سمجھانا منانا پڑتا ہے۔"

"ٹھیک ہے جاؤ آج شام چھ بجے سے ڈیوٹی پر آجاؤ۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ایڑی بجا کر سیلوٹ کر کے چلا گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک بیٹھی سوچتی رہی پھر اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر پنچ کیا' پھر رابطہ ہونے پر بولی۔ "ہیلو مسٹر سرفراز! میں ہوں بیگم بانو۔"

سرفراز نے کہا۔ "آہا بیگم صاحبہ' ابھی میں آپ کو فون کرنے ہی والا تھا کہ یہاں ایک مجرم پکڑا گیا ہے وہ بم دھماکے کے وقت وہاں موجود تھا اور وہ یار محمد کا ساتھی ہے۔"

"چلئے اچھا ہے آپ نے اتنے عرصے کی بھاگ دوڑ کے بعد ایک مجرم کو زندہ پکڑا ہے اس کے بیان سے ثابت ہوجائے گا کہ ایسی واردات سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"بے شک وہ آپ کو چہرے سے نہیں پہچانتا ہے لیکن یہ ضرور کہتا ہے کہ ایک رئیس خاتون یار محمد کو واردات کرنے کے لئے لاکھوں روپے دیا کرتی تھی۔"

"تو پھر آپ اس رئیس خاتون کو تلاش کریں۔"

"کیا آپ کے علاوہ یار محمد کے تعلقات کسی اور رئیس خاتون سے بھی تھے؟"

"یار محمد سے میرے وہ تعلقات نہیں تھے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ اس سے تعلقات نہیں تھے' رشتے داری تھی۔ ہوسکتا ہے دوسری امیر کبیر خواتین سے اس کے تعلقات رہے ہوں میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتی۔"

"کوئی بات نہیں آپ کچھ نہ بتائیں میں اپنے طور پر معلوم کرلوں گا۔ بائی دا وے ابھی آپ نے کیوں فون کیا ہے؟"

"میں آپ کو یہ اطلاع دینا چاہتی ہوں کہ میں نے اپنی حفاظت کے لئے ایک سکیورٹی گارڈ رکھا ہے میرے بیڈ روم کے دروازے پر اس کی نائٹ ڈیوٹی رہا کرے گی اس کا نام شیراز بوستان ہے۔ میں علاقے کے تھانے میں بھی یہی اطلاع دوں گی۔"

"یہ اچھی بات ہے آپ ضابطے کی کارروائی کر رہی ہیں اگرچہ یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے' پھر بھی پوچھ رہا ہوں کہ جب آپ کی کوٹھی کے باہر چھ سکیورٹی گارڈ ہیں پھر ایسے گارڈ کی کیا ضرورت پڑ گئی جو رات کے وقت آپ کے بیڈ روم کے دروازے پر رہے؟"

"مجھے رئیس احمد پر بھروسہ نہیں ہے وہ اپنے بیٹے عمران کی خاطر میری مخالفت میں کچھ بھی کرسکتا ہے۔"

"آپ میاں بیوی عجیب ہیں۔ ایک دوسرے کے دشمن ہیں لیکن ایک ہی چھت کے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔"

سرفراز نے رابطہ ختم کر دیا۔

☆======☆======☆

رئیس احمد بیٹی سے ملنے کے لئے ہوٹل پرل کے ایک کمرے میں آیا' سدرہ باپ کو دیکھتے ہی دوڑتے ہوئے آکر اس سے لپٹ گئی۔ باپ نے اس کی پیشانی چوم کر اسے مبارک باد دی۔ پھر اپنے داماد خرم کو گلے سے لگا کر کہا۔ "تمہاری ساس انسان کو دولت کے ترازو میں تولتی ہے میں انسان کو اس کے کردار کی کسوٹی پر پرکھتا ہوں۔ مجھے تمہارے جیسا داماد چاہئے تھا۔ تم میری بیٹی کو دل و جان سے چاہتے ہو۔ تم صحت مند ہو دلیر ہو' میری بیٹی کی حفاظت کرتے رہو گے۔ یہ لو میری طرف سے شادی کا تحفہ۔"

اس نے ایک لفافہ نکال کر خرم کو دیا' سدرہ نے مسکرا کر پوچھا۔ "اس میں کیا ہے ڈیڈی؟"

"دس لاکھ روپے کا چیک ہے۔ یہ پہلا تحفہ ہے اپنے داماد کو اور بہت کچھ دیتا رہوں گا کل تک دس لاکھ ڈالر سوئز بینک اکاؤنٹ میں جمع ہو جائیں گے اور کیا چاہتی ہو بولو؟"

"میں تو ساری زندگی کچھ نہ کچھ چاہتی رہوں گی اور آپ دیتے رہیں گے یہ بتائیں ٹھنڈا پئیں گے یا گرم؟"

"گرمی زیادہ ہے اورنج اسکوائش منگواؤ۔"

سدرہ نے فون کے ذریعے تین اورنج اسکوائش کا آرڈر دیا پھر ریسیور رکھ کر بولی۔

"ہم لنچ کے وقت ڈائننگ ہال میں جائیں گے۔ کیوں ڈیڈی ٹھیک ہے نا؟"

"اِیز یُو وِش۔ یہ بتاؤ یہاں سے روانگی کب ہے؟"

خرم نے کہا۔ "ہم تو آج ہی شام کی فلائٹ سے کوشش کر رہے تھے مگر سیٹیں کنفرم نہیں ہیں' چانس پر ہیں۔ آج یا کل جس فلائٹ میں بھی سیٹیں ملیں گی ہم چلے جائیں گے۔"

رئیس نے سدرہ سے کہا۔ "بیٹی! تمہاری اور عمران کی رگوں میں میرا خون دوڑ رہا ہے' خون کے حساب سے تم دونوں سگے ہو' مگر سوتیلے کہلا رہے ہو۔ تمہاری ماں اس کے خلاف دل میں نفرت پیدا کر رہی ہے یہ کہتی پھر رہی ہے کہ وہ تم پر قاتلانہ حملے کر رہا ہے۔ وہ ایسے جھوٹے الزامات کو کبھی سچ ثابت نہیں کر سکے گی۔"

"ڈیڈی اگر عمران میرا دشمن نہیں ہے تو پھر کون مجھ سے دشمنی کر رہا ہے؟ ہمارے

درمیان جائیداد کا جھگڑا ہے۔ میں مر جاؤں گی تو میرے حصے کی بھی دولت اور جائیداد عمران کو ملے گی۔"

"جب تمہارے بھائی امیر احمد کا قتل ہوا تب بھی یہ رائے قائم کی گئی تھی کہ عمران نے اپنے سوتیلے بھائی کو قتل کیا ہے تاکہ اس کے حصے کی دولت اور جائیداد حاصل کر سکے۔ بعد میں یہ خیال غلط ثابت ہوا اور ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والی شہلا نے تمہارے بھائی کو قتل کروا دیا تھا۔"

سدرہ نے کہا۔ "اب تو شہلا نہیں رہی اب مجھ پر کون قاتلانہ حملے کر رہا ہے؟"

"کوئی ضروری نہیں کہ قتل کی وجہ دولت اور جائیداد ہو۔ تم خوبصورت ہو دولت مند ہو کوئی تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہو گا لیکن خرم اس کا رقیب بن گیا۔ دراصل وہ تمہیں ہلاک کرنا نہیں چاہتا ہلاک کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ اسی لئے اس نے ہر بار تم پر ناکام حملے کئے ہیں دوسری طرف وہ پُراسرار شخص بن کر خرم کو فون کرتا رہا' اس کے بینک اکاؤنٹ میں بڑی بڑی رقمیں جمع کرتا رہا۔ مجھے سرفراز نے بتایا ہے کہ وہ اس طرح خرم کو قاتل ثابت کرنا چاہتا ہے۔"

سدرہ اور خرم قائل ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے پھر خرم نے کہا۔ "انکل آپ کی یہ بات سمجھ میں آتی ہے اس نے تو مجھے بری طرح پھنسا دیا تھا اگر سدرہ میرا ساتھ نہ دیتی تو سرفراز یہ ثابت کر دیتا کہ میں بڑی بڑی رقمیں لے کر واردات کرتا رہتا ہوں۔"

"تم پر سے تو شبہ ختم ہو گیا لیکن اس سوال کا جواب نہیں مل رہا کہ قاتل کون ہے! شہلا کو کس نے گولی ماری تھی؟ سدرہ پر کون ناکام حملے کر رہا ہے؟ اگر میرا بیٹا دشمن ہے تو وہ اپنی سوتیلی بہن سدرہ پر ناکام حملے کیوں کرے گا؟"

خرم نے تائید کی۔ "جی ہاں اس سوال کا جواب بھی نہیں مل رہا ہے کہ عمران شہلا کو کیوں قتل کرے گا؟ جب کہ شہلا قتل کے الزام میں گرفتار ہو رہی تھی اور سزائے موت یا عمر قید کی سزا پانے والی تھی' سمجھ میں نہیں آتا کسی نے اسے کیوں خواہ مخواہ قتل کیا ہے؟"

رئیس نے کہا۔ "میرا خیال ہے اگر شہلا زندہ رہتی تو اپنے بیان میں ایسی کوئی بات کہتی جس سے قاتل بے نقاب ہو سکتا تھا۔ شہلا کی موت نے اس قاتل کو تاریکی میں چھپا دیا ہے ایسی گہری تاریکی ہے کہ پولیس والے بھی اسے دیکھ نہیں پا رہے ہیں۔"

خرم نے کہا۔ "یہاں کی پولیس بالکل ناکارہ ہے۔ یہ اچھا ہی ہے کہ اب سدرہ یہاں نہیں رہیں گی ہم وہاں پہنچتے ہی کسی پرائیویٹ جاسوس کی خدمات حاصل کریں گے۔ ہمارے پیچھے آنے والا قاتل وہاں ضرور پکڑا جائے گا۔"

رئیس نے کہا۔ "عمران بھی یہ ملک چھوڑ کر جارہا ہے تم سوئٹزر لینڈ جارہی ہو وہ نیویارک جائے گا۔ اگر تم دونوں کا دشمن ایک ہی ہے تو وہ تم میں سے کسی ایک کے پیچھے جائے گا۔"

سدرہ نے کہا۔ "میں نے ممی کو فون کیا تھا انہوں نے آپ کی طرح مجھے دعائیں نہیں دیں ملنے بھی نہیں آئیں۔"

"تمہاری ماں کے دماغ میں گرمی بہت ہے۔ وہ تو شادی کے پہلے دن سے مجھے اپنا دشمن سمجھتی آرہی ہیں۔ پتا ہے انہوں نے اپنے لئے خاص باڈی گارڈ رکھا ہے وہ رات کو ان کے بیڈ روم کے دروازے پر ڈیوٹی دیتا ہے۔"

"ہماری کوٹھی کے اندر اور باہر پہلے ہی چھ سکیورٹی گارڈ موجود ہیں پھر ایک اور کا اضافہ کیوں کیا ہے؟"

"ہم نے کوٹھی میں سکیورٹی گارڈ رکھے' تمہاری ممی نے باڈی گارڈ رکھا ہے۔ دراصل وہ مجھ سے خوف زدہ ہیں۔"

"وہ آپ سے کیوں خوف زدہ ہیں؟"

"ان کا خیال ہے۔ میں انہیں قتل کرانا چاہتا ہوں۔ ان کی ہلاکت کے بعد تمام دولت و جائیداد کا مالک میں بن جاؤں گا۔ اس عورت کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ میں پچھلے بائیس برس کے دوران میں کسی دن بھی اسے ہلاک کرسکتا تھا۔ اب اس بڑھاپے میں کیا یہی کام کرنے کو رہ گیا ہے؟"

"ممی کچھ ایب نارمل ہوتی جارہی ہیں۔ الٹی سیدھی حرکتیں کر رہی ہیں۔ کوٹھی کے اندر بیڈ روم کے دروازے پر ایک مرد باڈی گارڈ رات بھر رہا کرے گا کیسی عجیب سی بات ہے؟"

وہ بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر لنچ کے وقت ڈائننگ ہال میں آگئے۔ رئیس نے کہا۔ "مجھے بتاؤ فلائٹ کون سی ہے؟ میں تم دونوں کو سی آف کرنے آؤں گا۔"

خرم نے کہا۔ "شام چھ بجے اور رات دس بجے کی دو فلائٹیں ہیں۔ کل دن کو ایک

فلائٹ ہے اب پتا نہیں کس فلائٹ میں سیٹیں ملیں گی؟ ہمیں چانس لینے کے لئے کل تک ائرپورٹ پر رہنا ہوگا۔ رات وہیں ہوٹل میں گزاریں گے۔"

سدرہ نے کہا۔ "ڈیڈی آپ نہ آئیں خواہ مخواہ ہمارے ساتھ پریشان ہوتے رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے وہاں پہنچتے ہی مجھے فون کرنا۔ تمہیں مزید رقم کی ضرورت ہوگی تو میں بھیجتا رہوں گا۔"

وہ بیٹی اور داماد سے خوب باتیں کرتا رہا۔ بڑی محبت سے بولتا رہا۔ پھر بڑی محبت سے رخصت ہوگیا۔

سدرہ اور خرم فلائٹ سے دو گھنٹے پہلے ایئرپورٹ پہنچے' کاؤنٹر پر معلومات حاصل کرتے رہے وہاں پہنچتے ہی پتا چلا کہ ایک میاں بیوی نے اپنی سیٹیں کینسل کرادی ہیں۔ وہ دونوں لکی تھے وہ سیٹیں انہیں مل گئیں۔ وہ فوراً ہی بورڈنگ کارڈز لے کر جہاز میں چلے گئے۔

زرینہ اور رئیس اپنے بیٹے عمران کو سی آف کرنے وہاں آئے اس وقت تک سدرہ اور خرم بورڈنگ کارڈز لے کر جاچکے تھے۔ اس لئے ان کا سامنا نہیں ہوا۔

وہ طیارہ لندن سے ہوتا ہوا نیویارک جانے والا تھا۔ سدرہ اور خرم کو اسی طیارے میں سیٹیں مل گئی تھیں۔ پرواز سے پندرہ منٹ پہلے عمران وہاں آیا۔ اس کی سیٹ خرم کے برابر تھی اس نے اور سدرہ نے حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پہلے کبھی ان کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے صرف ایک دوسرے کی تصویریں دیکھی تھیں۔

رئیس احمد نے سدرہ کو بیٹے کی تصویر دکھا کر کہا تھا۔ "بیٹی اسے سوتیلا نہ سمجھو۔ تمہاری ماں سوتیلے پن کا زہر تمہارے اندر بھر رہی ہے۔ یہ تمہارا محبت کرنے والا بھائی ہے اسے دشمن نہ سمجھو' لیکن ان سب کے اندر زہر بھر چکا تھا۔ حالات نے انہیں ایک دوسرے کے خلاف زہریلا بنا دیا تھا۔

سدرہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "تم؟ تم ہمارے ساتھ کیوں بیٹھ رہے ہو؟"

"یہ میری سیٹ ہے میں بیٹھ رہا ہوں۔ اب یہ نہ پوچھنا کہ میں اس جہاز سے کیوں سفر کر رہا ہوں؟ میں تم سے ایسا کوئی سوال نہیں کروں گا۔"

خرم نے پوچھا۔ "آپ کی تعریف؟"

عمران نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میرا نام عمران احمد ہے میں رئیس احمد کا بیٹا ہوں اور یہ میری چھوٹی بہن سدرہ ہے۔"

خرم نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام خرم ہے شاید انکل نے تمہیں میرے بارے میں کچھ بتایا ہوگا؟"

"ہاں انہوں نے تمہارا ذکر کیا تھا۔ تم میری بہن کے مجازی خدا ہو۔ میں اسے بار بار بہن کہہ رہا ہوں اور کہتا رہوں گا۔ یہ شاید مجھے بھائی نہ کہے۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ میری ایک ہی بہن ہے اور یہ مجھے دشمن سمجھتی ہے۔"

خرم نے سدرہ سے کہا۔ "تم سن رہی ہو۔ عمران کے لہجے میں ایک بھائی کا درد ہے' سچائی ہے۔ تمہارے ڈیڈی نے بھی اس کی طرف سے صفائی پیش کی تھی صرف اپنی ممی کی باتوں پر نہ جاؤ اپنوں کو اپنی ذہانت سے اپنی نظروں سے بھی پہچانا کرو۔"

سدرہ نے جھکی جھکی نظروں سے عمران کو دیکھا۔ عمران نے کہا۔ "دشمن تو سمجھ ہی رہی ہو ایک محبت کرنے والا بھائی بھی سمجھ کر دیکھو' اس طرح سچ تمہارے سامنے آسکتا ہے۔"

خرم نے کہا۔ "تمہیں میری اور اپنے ڈیڈی کی بات مان کر عمران پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ اس کی محبت اور مخالفت دونوں کو آزمانا چاہئے' یہ بات ذہن سے نکال دو کہ اس سے تمہیں نقصان پہنچے گا۔ میں تمہارا محافظ ہوں اگر عمران نے دشمنی کی ہے تو وہ دشمنی اسے بہت مہنگی پڑے گی۔"

عمران نے سدرہ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم نے ایک محافظ شوہر کا ہاتھ پکڑا ہے آج ایک بھائی کا ہاتھ پکڑو۔ تمہاری طرف کوئی بلا نہیں آئے گی۔ تمہاری تمام بلائیں میں اپنے سر لیتا رہوں گا۔"

سدرہ نے مسکراتے ہوئے اعتماد سے عمران کو دیکھا پھر بھائی جان کہتے ہوئے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔

☆======☆======☆

دن' ہفتے اور مہینے گزر رہے تھے اس قاتل کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ جس نے شہلا کو ہلاک کیا تھا اور جو دو بار سدرہ پر ناکام حملے کر چکا تھا۔ سرفراز کے اعلیٰ افسران اس سے بار بار پوچھ رہے تھے کہ قاتل کا سراغ کیوں نہیں مل رہا ہے؟

اس کا آخری جواب یہی ہوتا تھا کہ سدرہ اور عمران ملک سے باہر جاچکے ہیں۔ ان دونوں پر حملے ہوتے رہتے تھے ان کے جانے کے بعد واردات کا سلسلہ رک گیا ہے۔ قاتل ایکشن میں نہیں ہے۔ یقیناً وہ ان کے پیچھے ملک سے باہر چلا گیا ہے۔

بیگم بانو نے سرفراز سے شکایت کی تھی کہ کوئی شخص اسے فون کرتا ہے۔ اسے دھمکیاں دیتا ہے' کہتا ہے کہ سدرہ کو واپس بلاؤ ورنہ تم جان سے جاؤ گی۔

سرفراز نے پوچھا۔ "آپ نے سی ایل آئی میں فون کرنے والے کا فون نمبر نوٹ کیا ہوگا۔"

بیگم بانو نے اسے ایک موبائل نمبر بتایا۔ سرفراز نے اسے نوٹ کرنے کے بعد کہا۔

"آپ تو کسی حد تک محفوظ ہیں۔ ایک باڈی گارڈ تمام رات آپ کے بیڈ روم میں رہتا ہے۔ آپ کی حفاظت سر سے پاؤں تک کرتا ہے۔"

"آپ سوچ سمجھ کر گفتگو کریں۔ وہ باڈی گارڈ میرے بیڈ روم میں نہیں' بیڈ روم کے باہر رہتا ہے۔"

"میں یہی کہہ رہا تھا۔ دراصل بات کرتے وقت ذرا سی لغزش ہوجائے تو اس بات کے معنی بدل جاتے ہیں۔ ویسے وہ گارڈ آپ کی ضرورت پوری کر رہا ہے؟"

"ضرورت؟ وہ میری کیا ضرورت پوری کرے گا۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"آپ پھر غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں حفاظتی ضرورت کی بات پوچھ رہا ہوں۔ کیا وہ ایسا ہے کہ اس کی موجودگی میں آپ خطرہ محسوس نہیں کرتی ہیں؟"

"ہاں وہ ایسا جواں مرد اور فرض شناس ہے۔ میرے کسی بھی دشمن کو دیکھتے ہی اسے جہنم میں پہنچادے گا۔"

"آپ نے اپنے شوہر رئیس احمد کے خلاف بھی بیان دیا ہے۔ آپ کو ان سے بھی خطرہ ہے۔"

"جی ہاں۔ وہ میرے شوہر ہیں لیکن مجھے ان پر بھروسہ نہیں ہے۔"

"وہ شوہر کی حیثیت سے آپ کے بیڈ روم میں آئیں گے تو آپ کا باڈی گارڈ کیا انہیں بھی گولی مار دے گا؟"

"میں نے رئیس سے کہہ دیا ہے' وہ میرے بیڈ روم کی طرف نہ آئے۔ میرے گن مین سے دور رہا کرے۔"

"اس کا مطلب ہے۔ آپ میاں بیوی کے درمیان ازدواجی تعلقات نہیں ہیں؟"

وہ ذرا اُلجھ گئی پھر بولی۔ "تعلقات ہیں۔ رئیس دن کو میرے بیڈ روم میں آتے ہیں۔"

"دن کو ان سے خطرہ نہیں رہتا؟"

"رہتا ہے۔ دن کو ڈیوٹی پر رہنے والے دو باڈی گارڈز میرے بیڈ روم کے باہر موجود رہتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں رئیس مجھے نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

بیگم بانو نے ریسیور رکھ دیا۔ اپنے باڈی گارڈ سے بولی۔ "یہ انٹیلی جنس کا انسپکٹر بہت بولتا ہے۔ کہہ رہا تھا تم رات کو بیڈ روم کے باہر نہیں اندر ڈیوٹی دیتے ہو۔"

اس نے بیگم بانو کو کھینچ کر آغوش میں لیتے ہوئے کہا۔ "وہ ایک اندازے سے بول رہا ہے مگر جھوٹ نہیں بول رہا۔ میں تمہاری باڈی کی حفاظت کرتا رہتا ہوں۔"

رئیس کا بیڈ روم وہاں سے کچھ فاصلے پر تھا۔ وہ اکثر آدھی رات کے بعد اپنے کمرے سے نکلتا تھا پھر تاریکی میں چھپتا ہوا کوٹھی کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا کہیں تاریکی میں رہ کر بیگم کے بیڈ روم کی طرف دیکھتا تھا۔ وہ باڈی گارڈ کبھی کبھی باہر دکھائی دیتا۔ زیادہ تر بیڈ روم کے اندر رہ کر صبح کر دیتا تھا۔

رئیس نے یہ معلوم کیا تھا کہ وہ باڈی گارڈ شیراز بوستان کہاں رہتا ہے اور کیسی ازدواجی زندگی گزارتا ہے؟ وہ ایک رات کار میں بیٹھ کر اس کے مکان کے سامنے پہنچا دروازے پر دستک دی اندر سے کسی عورت نے پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں' بوستان جہاں کام کرتا ہے وہاں سے آیا ہوں' اس کی خبر لایا ہوں۔"

ایک نوجوان عورت نے دروازہ کھولا۔ پہلے اسے پھر اس کی کار کو دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"کیا تم بوستان کی گھر والی ہو؟"

وہ بولی۔ "ہاں میرا نام گل بانو ہے وہ میرا خاوند ہے۔"

"تم کیسی بیوی ہو؟ اپنے خاوند کو ہر رات سوکن کے پاس بھیج دیتی ہو۔"

"سوکن؟ میری تو کوئی سوکن نہیں ہے وہ رات کو ڈیوٹی پر جاتا ہے صبح آجاتا ہے۔"

"میں اس کوٹھی کا مالک ہوں اچھی طرح جانتا ہوں وہ وہاں ڈیوٹی نہیں کرتا بلکہ بیگم صاحبہ کے ساتھ منہ کالا کرتا رہتا ہے۔"

"صاحب آپ اپنی بیگم کے بارے میں کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

"اب وہ میری بیوی نہیں ہے۔ میری اس سے علیحدگی ہو چکی ہے۔ اس لئے اس نے تمہارے خاوند کو اپنی دولت سے خرید لیا ہے۔"

گل بانو سوچ میں پڑ گئی۔

وہ بولا۔ "سوچتی رہو گی تو خاوند ہاتھ سے نکل جائے گا۔ میری کوٹھی میں چلو وہاں جاکر معلوم ہو گا کہ تمہارا خاوند تمہیں کس طرح دھوکا دے رہا ہے؟"

"میں ابھی جاکر دیکھوں گی لیکن آپ کے پہرے دار مجھے اندر نہیں جانے دیں گے۔"

"میری گاڑی میں چلو تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔"

"میں آپ کو نہیں جانتی' کبھی نہیں دیکھا۔ آپ آگے جائیں میں کسی ٹیکسی میں آتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی آجاؤ۔ وہاں تمہیں اندر جانے سے کوئی نہیں روکے گا۔"

وہ اپنی کار میں بیٹھ کر کوٹھی میں واپس آیا۔ وہاں ایک سکیورٹی گارڈ سے بولا۔ "شیراز بوستان کی بیوی ابھی یہاں آرہی ہے۔ اسے اندر جانے سے نہ روکنا اور اس کی آمد کے بارے میں بوستان کو نہ بتانا۔"

وہ انہیں حکم دے کر کوٹھی کے اندر آگیا۔ ایک جگہ چھپ کر تاریکی میں انتظار کرنے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد گل بانو وہاں پہنچ گئی۔ ایک سکیورٹی گارڈ اسے بیگم کے بیڈ روم کا دروازہ دکھا کر چلا گیا۔

گل بانو گرم مزاج رکھتی تھی۔ بات بات پر شوہر سے لڑتی تھی۔ ایک سوکن کے بارے میں سن کر وہ غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے آئی تھی۔ اس نے دستک دینے کے لئے زور زور سے دروازے پر ہاتھ مارا۔ پہلے تو اندر خاموشی رہی پھر بیگم نے پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں بوستان کی گھر والی۔ میرے آدمی کو باہر نکالو۔"

اندر خاموشی چھا گئی۔ گل بانو نے پھر زور زور سے دروازے کو پیٹا۔ اندر خاموشی رہی' بیگم بانو پریشان ہو گئی تھی۔ بوستان سے کہہ رہی تھی۔ "وہ پچھلے دروازے سے چلا جائے۔"

بوستان جلدی جلدی وردی پہنتا ہوا پچھلے دروازے کی طرف آیا اسے کھولنا چاہا دروازہ کھلنے سے انکار کر رہا تھا۔ رئیس احمد نے اسے باہر سے بند کر دیا تھا۔ وہ پلٹ کر بیگم بانو سے بولا۔ "یہ تو باہر سے بند ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "یہ تو باہر سے کھلا رہتا ہے آج بند کیسے ہے؟"

گل بانو نے باہر سے چیخ کر کہا۔ "بوستان میں جانتی ہوں تم اندر ہو' باہر نہیں آؤ گے تو میں صبح تک یہاں کھڑی رہوں گی۔"

بوستان نے دروازے کے قریب آ کر دھیمی آواز میں کہا۔ "اری نیک بخت! شور نہ مچا میں آ رہا ہوں۔"

وہ چپ ہو گئی۔ بوستان نے دروازے کو ذرا سا کھول کر اسے دیکھا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ دروازے کو بند کرتے ہوئے بولا۔ "دیکھ تجھے میری قسم ہے چیخ چیخ کر نہ بول نا آرام سے بات کرے گی تو میں تجھے آرام سے سمجھاؤں گا۔"

وہ بیڈ روم کو دیکھ رہی تھی۔ غصے سے بولی۔ "وہ تمہاری بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟"

"وہ......... وہ باتھ روم میں ہیں۔ ابھی آ جائیں گی۔ تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"تمہاری بدمعاشیاں دیکھنے آئی ہوں۔ مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ تم یہاں نوکری کرنے نہیں مستی کرنے آتے ہو۔ وہ بے شرم عورت کپڑے پہننے باتھ روم میں گئی ہے۔"

"چپ کر ورنہ منہ توڑ دوں گا۔"

"تو میرا منہ توڑے گا۔ میں اس بیگم بانو کی بچی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گی۔"

"کیا بکواس کر رہی ہے؟ میری عزت کا تو کچھ خیال کر۔ میں تجھے کمرے میں کھینچ کر لایا ہوں تاکہ باہر آواز نہ جائے تو تو لاؤڈ اسپیکر کی طرح بولتی ہے۔"

بیگم باتھ روم کا دروازہ کھول کر وہاں سے جھانکنے لگی۔ گل بانو نے کہا۔ "اے! جھانکتی کیا ہے؟ سامنے آ۔ منہ کیوں چھپا رہی ہے؟"

بیگم بانو نے پریشان ہو کر دروازے کے پیچھے سے کہا۔ "بوستان! اس کا منہ بند کرو اسے یہاں سے لے جاؤ۔"

بوستان نے کہا۔ "اسے یہاں چپ نہ کرایا تو یہ باہر چیختی چلاتی جائے گی مجھے آپ کی

فکر ہے میں اسے چپ کرا رہا ہوں۔"

وہ بیوی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں منہ سے کچھ نہ بول یہاں سے چپ چاپ چل ہم گھر چل کے بات کریں گے۔"

"تو گھر جا کے شیر ہو جائے گا۔ وہاں میری پٹائی کرے گا یہاں میں اس بازاری عورت کو نہیں چھوڑوں گی۔"

وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "بکواس مت کر' بیگم صاحبہ کی بے عزتی کرے گی تو میں یہیں تیرا گلا دبا کر ہمیشہ کے لئے تیرا منہ بند کر دوں گا۔"

وہ اپنے منہ پر سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔ "منہ کیا دبا رہا ہے؟ لے گلا دبا' مجھے مار ڈال۔"

بیگم بانو نے دروازے کے پیچھے چھپتے ہوئے کہا۔ "اس سے بولو اپنی زبان بند رکھے۔ میں ابھی اسے ایک لاکھ روپے دوں گی۔"

گل بانو نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "اے! تو اپنے لاکھوں روپے سے ایسے مرد خرید سکتی ہے۔ ایک وفادار بیوی کو نہیں خرید سکتی منہ چھپا رہی ہے کتے کی بچی!"

بوستان نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا' وہ لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے گئی پھر چیخ کر بولی۔ "ایک فاحشہ کے لئے بیوی پر ہاتھ اٹھا رہے ہو؟"

اس نے آگے بولنے نہیں دیا۔ اس کا منہ دبا کر کہا۔ "چلا مت مجھے غصہ مت دلا' نہیں تو میں تجھے مار ڈالوں گا۔"

وہ خود کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ وہ اسے قابو میں کرنے کی کوشش کرتے کرتے بیڈ پر گر پڑا۔ منہ پر سے ہاتھ ہٹتے ہی وہ پھر چیخنے لگی۔ "تو مجھے مارے گا۔ میں اس کتیا کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

اس نے ایک گھونسا اس کے منہ پر رسید کیا۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہنے لگا۔ وہ پھر چیخنے لگی۔ اس بار اس نے تکیہ اٹھا کر اس کے منہ پر رکھ دیا۔ اسے پوری قوت سے دبوچنے لگا۔ وہ بھی تگڑی تھی۔ ماہی بے آب کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کے منہ پر سے تکیہ نہ ہٹے۔

بیگم بانو باتھ روم سے نکل کر دوڑتے ہوئے آئی۔ بیڈ کے اوپر چڑھ گئی پھر اس کے منہ کے اوپر رکھے ہوئے تکیے کے اوپر بیٹھ گئی۔ اس کا وزن دو من تو ضرور ہو گا پھر بوستان

نے بھی اسے دبوچ رکھا تھا۔ اس کے بعد وہ اِدھر سے اُدھر تڑپ نہ سکی۔ ایک ہی جگہ پڑی رہ گئی۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ تک اسے اچھی طرح دبوچ کر بیٹھے رہے۔

بیگم نے کہا۔ "یہ بڑی ڈھیٹ ہے۔ ہم اسی طرح اسے چپ کراتے رہیں گے تو یہ مرجائے گی۔"

بوستان نے کہا۔ "میڈم یہ تو مرچکی ہے۔"

"کیا؟" وہ فوراً ہی تکیے کے اوپر سے ہٹ گئی۔ بوستان نے منہ پر سے تکیہ ہٹا کر دیکھا اس کی آنکھیں بند تھیں۔ منہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ بوستان نے اس کے شانے کو جھنجھوڑ کر آواز دی۔ وہ شور مچانے والی اس دنیا کے شور اور ہنگاموں سے بہت دور جاچکی تھی۔

اس نے سینے پر سر رکھ کر اس کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کی۔ دل کی دنیا خاموش تھی۔ ایک دھڑکن بھی سنائی نہیں دی۔ بیگم اس کی نبض ٹٹول رہی تھی۔ پھر اس نے پریشان ہو کر کہا۔ "یہ تو مرچکی ہے۔"

وہ دونوں بیڈ سے اتر کر اسے دیکھنے لگے۔ بوستان نے کہا۔ "یہ اچھا نہیں ہوا۔ میں......... میں تو آپ کی عزت کی خاطر اسے چپ کرانا چاہتا تھا۔"

بیگم بانو نے کہا۔ "اس کی موت کا افسوس نہ کرو۔ بیوی مرگئی دوسری آجائے گی۔ میری عزت جاتی تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔ بے شک تم نے ایک باڈی گارڈ کا فرض ادا کیا ہے۔ میں تمہیں اتنی رقم دوں گی کہ ساری زندگی عیش کرو گے۔"

"وہ تو میں بعد میں عیش کروں گا۔ ابھی اس لاش کا مسئلہ ہے اسے چھپا کر یہاں سے لے جانا ہوگا۔ باہر ڈیوٹی دینے والوں نے اسے یہاں آتے دیکھا ہوگا۔"

"ان کی پروا نہ کرو۔ میں ان کا منہ نوٹوں سے بھر دوں گی۔"

وہ ایک چابی دیتے ہوئے بولی۔ "میری گاڑی یہاں لے آؤ۔ اس لاش کو ڈگی میں چھپا کر یہاں سے لے جاؤ۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دونوں ایسے چونک گئے جیسے ان کے قریب موت چیخ رہی ہے۔ انہیں پکار رہی ہے۔ بیگم بانو نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا پھر اسے کان سے لگا کر بولی۔ "ہیلو۔"

دوسری طرف سے رئیس احمد کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کیا ہو رہا ہے؟ کیا بہت پریشان

ہو؟"

وہ سخت پریشانی میں تھی۔ اس سے فون پر بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "میری آواز سن کر فون بند کرنا چاہتی ہو تو بند کر دو۔ میں نے تو صرف خطرے کی گھنٹی بجائی ہے سرفراز یہاں پہنچ رہا ہے۔"

"اوہ اب سمجھی، میرے کمرے کے پچھلے دروازے کو باہر سے تم نے بند کیا ہے۔"

"میں اگلا دروازہ بھی بند کرچکا ہوں۔"

بیگم نے پریشان ہو کر دروازے کی طرف دیکھا پھر بوستان سے کہا۔ "دروازے کو دیکھو کھلا ہے یا بند ہے؟"

بوستان نے دروازے کی چٹخنی گرائی اسے کھولنا چاہا، پتا چلا وہ باہر سے بند ہے۔ وہ پریشان ہو کر بولا۔ "یہ تو باہر سے بند ہے۔"

وہ ریسیور کان سے لگا کر بولی۔ "رئیس! یہ کیا بدمعاشی ہے؟ یہاں آکر دروازہ کھولو۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "سامنے سے بھی بند پیچھے سے بھی بند، میں نے چوہے دان میں پھانسا ہے۔ میرے بیٹے کو تمہاری طرف سے ہمیشہ خطرہ رہا ہے لیکن میں نے تم پر قاتلانہ حملے نہیں کروائے کسی اچھے موقع کا انتظار کرتا رہا۔ اب دیکھو کہ کتنا شان دار موقع مجھے ملا ہے۔"

"میں کہتی ہوں دروازہ کھولو۔ یہ دشمنی بہت مہنگی پڑے گی۔"

"دروازہ اپنے وقت پہ کھلے گا۔ اس عورت سے میری بات کراؤ۔"

"کس عورت کی بات کر رہے ہو؟"

"وہی جو بوستان کی بیوی ہے اور تم دونوں کے ساتھ اس کمرے میں قید ہوچکی ہے۔"

"یہاں نہ بوستان کی بیوی ہے اور نہ کوئی دوسری عورت ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے اسے تمہارے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"بڑھاپے میں تمہاری نظر کمزور ہوگئی ہے۔"

"سرفراز آرہا ہے۔ اس کی نظر کمزور نہیں ہے۔"

بیگم نے "شٹ" کہہ کر فون بند کر دیا۔ گہری سنجیدگی سے سوچنے لگی۔ بوستان نے گھبرا کر پوچھا۔ "میڈم اب کیا ہوگا؟"

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے بوستان کو دیکھا۔ پھر ریسیور اٹھا کر سکیورٹی گارڈ سے رابطہ کیا۔ وہ بولا۔ "یس میڈم!"

بیگم نے پوچھا۔ "بوستان کی بیوی تمہارے سامنے یہاں آئی ہے؟"

"جی ہاں آج میری نائٹ ڈیوٹی ہے۔ بڑے صاحب نے کہا تھا وہ اپنے شوہر سے ملنے آئے گی تو اسے آپ کے بیڈ روم تک پہنچا دیا جائے۔"

"اور تم نے اسے یہاں لا کر چھوڑ دیا۔ تم میرے ملازم ہو۔ میں نے تمہیں ملازمت دی ہے۔ میں تمہیں تنخواہ سے زیادہ رقم دیا کرتی ہوں۔"

"آپ مجھے کہہ دیتیں تو میں صاحب کی بات مانتا مگر آپ کو خبر کر دیتا۔ آپ حکم دیں اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

وہ بولی۔ "انسپکٹر سرفراز آ رہا ہے۔ تمہارا بیان ہوگا۔ یہاں کوئی عورت نہیں آئی تھی۔ سرفراز کے جانے کے بعد میں تمہیں پچیس ہزار روپے دوں گی۔"

"میں آپ کا خادم ہوں۔ آپ کی مرضی کے مطابق بیان دوں گا۔"

"رات کے وقت دو گارڈز کی ڈیوٹی ہوا کرتی ہے۔ دوسرا کہاں ہے؟"

"دوسرا یہاں کیبن میں سو رہا ہے۔ اس نے بوستان کی بیوی کو یہاں آتے نہیں دیکھا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم اپنے بیان پر ڈٹے رہو گے۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ بوستان نے کہا۔ "میڈم وہ گارڈ جھوٹا بیان دے گا لیکن میری بیوی تو یہاں پڑی ہوئی ہے۔ انسپکٹر دروازہ کھول کر یہاں آئے گا اسے دیکھے گا۔ ہم اسے کہیں چھپا نہیں سکتے۔"

وہ نفرت سے بولی۔ "رئیس احمد خود کو بہت چالاک سمجھتا ہے۔ میں اسے بائیس برس سے اُلو بناتی آ رہی ہوں۔ آج بھی اسے بُری طرح اُلو بناؤں گی۔"

رئیس احمد اپنے بیڈ روم میں تھا۔ کھڑکی کے پاس کھڑا باہر دیکھ رہا تھا۔ جب اسے گیٹ کے پاس سرفراز کی گاڑی دکھائی دی تو سیڑھیوں سے اترتا ہوا نیچے آ گیا۔

سرفراز گیٹ کے پاس گاڑی روک کر سکیورٹی گارڈ سے پوچھ رہا تھا۔ "کیا یہاں اس

باڈی گارڈ بوستان کی بیوی آئی ہے؟"

"نو سر! یہاں تو کوئی نہیں آئی۔"

"مگر مسٹر رئیس نے مجھے فون پر بتایا ہے وہ یہاں آئی ہے۔"

"سر! ایک گھنٹہ پہلے ایک عورت آئی تھی۔ اسے پھولوں کی ضرورت تھی' میں نے اسے اندر جا کر پھول توڑنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ بہت سارے پھول لے کر واپس چلی گئی تو میں نے اس چھوٹے دروازے کو بند کر دیا تھا۔"

رئیس احمد گیٹ کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "آئیے مسٹر سرفراز اس گارڈ سے بھی پوچھ لیجئے۔ بوستان کی بیوی یہاں اندر موجود ہے۔"

سرفراز نے کہا۔ "لیکن یہ تو کہہ رہا ہے کہ یہاں نہیں ہے۔"

رئیس نے چونک کر اسے دیکھا پھر غصے سے پوچھا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو؟"

گارڈ نے کہا۔ "سر آپ نے کہا تھا۔ یہاں بوستان کی بیوی آنے والی ہے۔ وہ آئے تو میں اسے میڈم کے کمرے میں پہنچا دوں لیکن وہ ابھی تک نہیں آئی ہے۔"

"کیا بکتے ہو؟ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ یہاں اندر آئی ہے۔"

گارڈ نے کہا۔ "صاحب! آپ کی نظر کمزور ہے۔ یہاں ایک عورت پھول توڑنے آئی تھی۔"

رئیس نے غصے سے کہا۔ "یو نان سنس ایڈیٹ! تم مجھے جھوٹا کہہ رہے ہو؟"

"سر! آپ گالیاں نہ دیں۔ میں یہاں ملازمت کرتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں گالیاں کھانے والا غلام ہوں۔"

رئیس نے اسے گھور کر دیکھا پھر سرفراز سے کہا۔ "آپ میرے ساتھ اندر چلیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ بوستان اور اس کی بیوی میری وائف کے کمرے میں موجود ہیں۔"

سرفراز ایک لیڈی کانسٹیبل اور دو سپاہیوں کے ساتھ آیا تھا۔ رئیس کے ساتھ احاطے سے گزرتا ہوا بیگم بانو کے بیڈ روم کے سامنے آیا۔ رئیس نے کہا۔ "یہ دیکھئے میں نے دروازے کو باہر سے بند کیا ہے اور میں اس عورت کو منہ کالا کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑوا رہا ہوں۔ بوستان کی بیوی ان کی بے شرمی کی گواہی دے گی۔ آپ دروازہ کھولیں جھوٹ اور سچ سامنے آئے گا۔"

سرفراز نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اندر بوستان کھڑا ہوا تھا۔ اس نے رئیس کو دیکھ کر سلیوٹ کیا پھر کہا۔ "سر! بیگم صاحبہ کی الماری کا لاک نہیں کھل رہا تھا۔ انہوں نے مجھے اندر بلایا میں لاک کھولنے لگا۔ اسی وقت کسی نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔"

سرفراز نے پوچھا۔ "بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟"

"وہ باتھ روم میں ہیں۔ ابھی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ میں باہر گارڈ کو فون پر اطلاع دوں۔ وہ یہاں آکر دروازے کو کھولے گا۔ میں فون کرنے والا تھا ایسے ہی وقت آپ آگئے۔"

رئیس نے غرا کر پوچھا۔ "تمہاری بیوی کہاں ہے؟"

بوستان نے حیرانی سے پوچھا۔ "بیوی.........! وہ میرے گھر میں ہے۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"بکواس مت کرو۔ وہ یہاں آئی ہے۔"

سرفراز نے رئیس کے شانے پر تھپک کر کہا۔ "مسٹر! آپ نے بہت پی لی ہے خود کو قابو میں رکھیں۔ اگر وہ عورت آئی ہے تو اسی بند کمرے میں ہوگی۔ میں دیکھ رہا ہوں۔"

لیڈی کانسٹیبل اور سپاہی صوفوں اور الماری کے پیچھے بیڈ کے نیچے اسے تلاش کرنے لگے۔ رئیس نے غرا کر کہا۔ "وہ حرافہ ہے۔ بہت مکار ہے۔ اس نے باتھ روم میں اس عورت کو چھپایا ہے۔"

سرفراز نے لیڈی کانسٹیبل سے کہا۔ "اندر جاکر دیکھو۔"

اس نے باتھ روم کے دروازے پر دستک دی۔ بیگم نے اندر سے پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں لیڈی کانسٹیبل ہوں۔ انسپکٹر سرفراز کے ساتھ آئی ہوں۔ آپ کے کمرے کی تلاشی لی جارہی ہے۔ کیا آپ باہر آسکتی ہیں؟"

"میں باتھ ٹب......... میں ہوں باہر نہیں آسکتی۔ تم اندر آسکتی ہو۔"

لیڈی کانسٹیبل نے سرفراز کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ "ٹھیک ہے اندر جاؤ اگر مسٹر رئیس درست کہہ رہے ہیں تو وہ عورت اندر ہوگی جاکر دیکھو۔"

لیڈی کانسٹیبل نے دروازے کے ہینڈل پر دباؤ ڈالا تو وہ ذرا سا کھل گیا۔ اس نے اندر آکر دیکھا......... باتھ ٹب صابن کے جھاگ سے بھرا ہوا تھا۔ بیگم بانو اس جھاگ میں

ڈوب کر بیٹھی ہوئی تھی۔ جھاگ کے اوپر صرف اس کا سر اور چہرہ نظر آرہا تھا۔ اس نے لیڈی کانسٹیبل سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ کس لئے تلاشی لی جارہی ہے؟"

"مسٹر رئیس نے اطلاع دی تھی کہ بوستان کی بیوی یہاں آپ کے کمرے میں موجود ہے۔ یہاں تو کہیں نہیں ہے۔ ویسے آپ مائنڈ نہ کریں آپ کے میاں پیتے بہت ہیں۔ باہر گارڈ بھی کہہ رہا ہے کہ یہاں بوستان کی بیوی نہیں آئی ہے۔"

بیگم نے کہا۔ "تم میرے میاں کی تسلی کردو۔ اس جھاگ کے اندر ہاتھ ڈال کر اسے تلاش کرو۔ یہاں چھپی ہوگی تو اسے نکال کرلے جاؤ۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "وہ اتنی دیر جھاگ کے اندر رہے گی تو دم نکل جائے گا۔ میں یہ شبہ کر رہی تھی اسی لئے اتنی دیر باتیں کر رہی ہوں۔ دس منٹ گزر چکے ہیں اور پانچ دس منٹ رہ جاتی ہوں۔"

"تمہیں یہاں ضرور رہنا چاہئے۔ میں تو بدن صاف کر چکی ہوں۔ اب شاور لے کر لباس پہنوں گی اور باہر چلی جاؤں گی۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ صابن کا جھاگ اس کے بدن پر پھسلنے لگا۔ ٹب کے جھاگ کے سامنے ملنے لگا۔ ایک عورت کے سامنے اسے شرمانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بڑی بے شرمی سے ٹب سے باہر آکر شاور کھول کر کھڑی ہوگئی۔ لیڈی کانسٹیبل کچھ شرمیلی تھی۔ وہ نظریں چرا کر وہاں سے باہر آگئی۔ سرفراز سے بولی۔ "سر! وہاں صرف بیگم صاحبہ ہیں جھاگ سے بھرے ہوئے ٹب میں کسی کو چھپایا جاسکتا ہے۔ میں نے اطمینان کیا ہے' اس جھاگ کے اندر بھی کوئی نہیں ہے۔"

رئیس نے چیخ کر کہا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ نہیں ہوسکتا۔ اس عورت کو کہیں چھپایا گیا ہے۔ کسی راستے سے بھگا دیا گیا ہے۔"

سرفراز نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ "یہاں سے باہر جانے کا پچھلا دروازہ ہے۔ یہ باہر سے بند ہے۔ باتھ روم میں کوئی پچھلا دروازہ نہیں ہے۔ آپ باتھ روم میں جاکر دیکھ سکتے ہیں۔"

بیگم بانو نے اندر سے کہا۔ "خبردار! کوئی مرد یہاں نہیں آئے گا۔ میں غسل کر رہی ہوں۔ رئیس! اس وقت تم بھی نہیں آسکتے کیونکہ تم میرے شوہر نہیں' دشمن بن کر آئے ہو۔"

سرفراز نے رئیس سے کہا۔ "آپ باہر چلیں۔ ہمارا وقت ضائع نہ کریں۔ آپ ابھی اپنے آپ میں نہیں ہیں۔ اپنے کمرے میں جائیں اور دو چار پیگ حلق سے اتاریں اور سو جائیں۔"

وہ سب کمرے سے باہر آ گئے۔ بوستان نے بھی باہر آکر دروازے کو بند کیا۔ سرفراز' رئیس کو اس کے بیڈ روم تک چھوڑنے جارہا تھا۔ رئیس غصے میں بڑبڑا رہا تھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ساڑھے پانچ فٹ کی عورت بند کمرے میں غائب کیسے ہو سکتی ہے؟ اس باتھ روم میں کوئی چور راستہ ضرور ہے۔"

سرفراز نے اس کے دروازے پر پہنچ کر کہا۔ "آپ اندر جائیں ہم چور دروازہ تلاش کریں گے۔ بیگم صاحبہ کو گرفتار کریں گے۔ آپ اطمینان سے سو جائیں۔"

رئیس بڑبڑاتا ہوا اندر گیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد بھی اس کے بڑبڑانے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ سرفراز لیڈی کانسٹیبل اور سپاہیوں کے ساتھ چلا گیا۔ بوستان نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ اب وہ راتوں رات اس لاش کو کہیں مٹی میں دبا سکتا تھا۔

☆======☆======☆

عمران نیویارک جانے والا تھا لیکن سفر کے دوران میں سدرہ اور خرم سے دوستی اور محبت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس نے لندن پہنچ کر سفر ملتوی کر دیا۔ لندن ایسٹ بورن میں ان کا ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا۔ انہوں نے اس بنگلے میں قیام کیا۔ عمران نے کہا۔ "مجھے اس بنگلے میں تنہا رہنے دو۔ تم دونوں کو ہنی مون کے لئے سوئٹزرلینڈ جانا چاہئے۔"

خرم نے کہا۔ "یہ ساحلی علاقہ بھی بہت خوبصورت ہے۔ ہم یہاں انجوائے کریں گے۔ تمہیں تنہا نہیں چھوڑیں گے۔"

سدرہ نے کہا۔ "اگر سوئٹزرلینڈ جائیں گے تو آپ کو ساتھ لے جائیں گے۔"

عمران نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "آئی لو یو سدرہ!"

وہ بولی۔ "آئی لو یو ٹو بھائی جان! یہ کتنی عجیب بات ہے ہم نے ایک دوسرے کی دشمنی سے خوف زدہ ہو کر اپنا ملک چھوڑ دیا۔ ملک سے باہر آتے ہی ہم سگے بہن بھائی بن گئے ہیں۔"

"ہم سگے ہیں سدرہ! ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ مائیں دو ہیں تو ہونے دو۔ ہمارے دلوں میں اب سوتیلا پن نہیں رہے گا۔"

سدرہ نے کہا۔ "ہمارے والدین غلطیاں کر رہے ہیں۔ اگر وہ ایسی وصیت لکھ دیں کہ میری موت کے بعد آپ کو میری دولت اور جائیداد نہیں ملے گی اور آپ کے بعد مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا تو پھر آپس کی دشمنی کا اندیشہ نہیں رہے گا۔ جب کسی کی موت سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا تو کوئی کسی کو کیوں ہلاک کرے گا؟"

خرم نے کہا۔ "بے شک یہ بزرگ ایک وصیت لکھ کر اپنی اولاد کو تحفظ دے سکتے ہیں۔"

عمران نے کہا۔ "میں اکثر سوچتا ہوں۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے' اس کے پیچھے ہمارے بزرگوں کی خود غرضی ہے۔"

"ایک سوال یہ بھی ہے' جو کچھ ہو رہا ہے' کیا وہ محض دولت اور جائیداد کے حصول کی خاطر ہو رہا ہے۔ یا اس کی دوسری وجوہات بھی ہیں؟"

"بھائی جان! جب ہم دونوں کو دولت اور جائیداد کا لالچ نہیں ہے۔ جب ہم قریب رہ کر ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچا رہے ہیں تو پھر پچھلی تمام وارداتوں کے پیچھے قاتل کا کوئی اور مقصد رہا ہے اور وہ مقصد حاصل کرنے کے لئے پھر ہم دونوں پر حملے کر سکتا ہے۔"

"ہاں اس طرح سوچا جائے تو ہم پر پھر حملے ہو سکتے ہیں۔"

"نہ قاتل بے نقاب ہو رہا ہے۔ نہ اس کا مقصد معلوم ہو رہا ہے۔"

عمران نے کہا۔ "معلوم ہو سکتا ہے۔ اگر ہم خطرہ مول لیں۔"

"خطرہ کس طرح مول لینا ہوگا؟"

"اگر ہم واپس اپنے ملک جائیں۔ سدرہ اپنی کوٹھی میں رہے تو وہاں اس پر حملے ہو سکتے ہیں۔ اس کے بیڈ روم میں دو بار حملے ہو چکے ہیں۔ اب تم اس کے مجازی خدا اور محافظ ہو۔ تم اس کے ساتھ رہو گے۔ اس کی حفاظت کرو گے۔"

"میں دو بار قاتل سے مقابلہ کر چکی ہوں۔ میں خوف زدہ نہیں ہوں پھر یہ کہ خرم میرے ساتھ رہیں گے لیکن بھائی جان! آپ کے لئے بھی خطرہ ہے اور مجھ سے زیادہ خطرہ ہے۔"

"میری فکر نہ کرو۔ میں بہت محتاط رہوں گا۔ اس بار ہم قاتل کو بچ نکلنے کا موقع نہیں دیں گے۔"

"ڈیڈی نے کہا تھا یہاں پہنچتے ہی فون کرو۔ میں ابھی انہیں خیریت سے مطمئن کرتی ہوں۔ یہ بھی بتاؤں گی کہ ہم جلد ہی واپس آ رہے ہیں۔"

خرم نے کہا۔ "میرا مشورہ ہے۔ اپنے والدین کو یہ نہ بتاؤ کہ تم دونوں میں سگے بہن بھائی کا اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔ تمہاری ممی اور ڈیڈی آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ یوں لڑتے رہنے سے ان کی کوئی کمزور ہماری نظروں میں آ سکتی ہے۔"

سدرہ نے فون کے ذریعے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے رئیس نے پوچھا۔ "ہیلو بیٹی کیسی ہو؟ خیریت سے پہنچ گئی ہو؟"

"جی ہاں۔ میں یہاں خرم کے ساتھ بہت خوش ہوں۔"

"عمران کہاں ہے؟"

وہ چونک کر بولی۔ "عمران؟ وہ.......... وہ کہاں ہے۔ مجھے کیا معلوم؟ آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

رئیس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم مجھ سے پہلے پیدا نہیں ہوئی ہو۔ مجھ سے کیوں چھپا رہی ہو کہ وہ تمہارے ساتھ نہیں ہے۔"

"جی۔ جی ہاں۔ میں سوچ رہی تھی۔ شاید آپ دو سوتیلوں کا میل جول پسند نہیں کریں گے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو؟ میں تو چاہتا ہوں بہن بھائی میں محبت رہے۔ ریسیور عمران کو دو۔"

وہ عمران کو ریسیور دیتے ہوئے بولی۔ "ڈیڈ کو پتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ ہیں۔"

اس نے ریسیور لے کر کان سے لگایا پھر کہا۔ "ہیلو ڈیڈ! ابھی میں آپ کو فون کرنے والا تھا۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں سدرہ کے ساتھ ہوں؟"

"میں نے آدھا گھنٹہ پہلے بنگلے کے چوکیدار کو فون کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ سدرہ دو مردوں کے ساتھ آئی ہے اس نے تمہارا اور خرم کا نام بھی بتایا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ آگ اور پانی ایک جگہ ہیں۔"

"ہم آگ اور پانی تھے' اب نہیں ہیں اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں کہتا ہوں آپ کے اور سدرہ کی ممی کے درمیان جو اختلافات ہیں' ان اختلافات کی وجہ سے ہمارے درمیان غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اب ایسا کچھ نہیں ہے۔ میری زندگی میں ایک بہن کی

کمی تھی۔ وہ پیاری بہن مجھے مل گئی ہے۔"

"بیٹے میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جب سدرہ اور خرم موجود نہ ہوں تو تنہائی میں مجھ سے بات کرو۔ پھر ہمارے درمیان جو بات ہو وہ سدرہ کو معلوم نہ ہو۔"

"اچھی بات ہے۔ میں پھر کسی وقت فون پر بات کروں گا۔ آپ سدرہ سے بات کریں۔"

سدرہ نے ریسیور لے کر کہا۔ "ہیلو ڈیڈ! کچھ ممی کے بارے میں بتائیں..........؟"

"بیٹی تمہاری ممی سے جو اختلافات تھے اب ان میں شدت پیدا ہو گئی ہے اب ہم ایک چھت کے نیچے نہیں رہ سکتے۔ وہ کبھی یہ کوٹھی چھوڑ کر نہیں جائے گی اس لئے میں جانے والا ہوں۔"

"نہیں ڈیڈ آپ وہاں سے نہیں جائیں گے۔ ہم جلد ہی واپس آئیں گے اور ممی کو کسی دوسری کوٹھی میں جا کر رہنے پر مجبور کر دیں گے۔"

"تمہیں جلد واپس نہیں آنا چاہئے ہنی مون کے لئے گئی ہو وہاں دو چار مہینے رہو پھر واپس آؤ۔ میں تمہیں اسی کوٹھی میں ملوں گا۔"

فون کا رابطہ ختم ہو گیا۔ سدرہ نے کہا۔ "ڈیڈی مجھے بہت چاہتے ہیں۔ میری ہر بات مانتے ہیں۔ اب وہ اس کوٹھی سے نہیں جائیں گے۔"

وہ دعویٰ کر رہی تھی کہ باپ اسے بہت چاہتا ہے اور باپ اس کی غیر موجودگی میں اپنے بیٹے سے بات کرنا چاہتا تھا۔ گویا بیٹی سے کچھ چھپانا چاہتا تھا' بیٹے کو زیادہ اہمیت دینا چاہتا تھا۔

شام کو سدرہ اور خرم نے باہر تفریح کا پروگرام بنایا۔ عمران نے سردرد کا بہانہ کیا۔ اس نے کہا۔ "یہاں غضب کی سردی ہے۔ میں اتنی سردی میں پہلے کبھی یہاں نہیں آیا۔ تم دونوں جاؤ میری طبیعت سنبھل جائے گی تو میں فون کروں گا پھر تم دونوں جہاں تفریح کر رہے ہو گے' میں وہاں چلا آؤں گا۔"

وہ چلے گئے۔ اس نے تھوڑی دیر بعد رئیس سے فون پر رابطہ کیا۔ "ہیلو ڈیڈ! میں ابھی بنگلے میں تنہا ہوں آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"عمران! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنے احمق ہو۔ ایک سوتیلی بہن نے خرم کے ساتھ مل کر تمہیں دوستی کے جال میں پھنسایا اور تم پھنس گئے؟"

عمران نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ سدرہ کہہ رہی تھی کہ آپ خرم سے ملنے ہوٹل میں آئے تھے اسے سمجھایا تھا کہ وہ مجھے سوتیلا بھائی اور دشمن نہ سمجھے ہماری رگوں میں ایک ہی خون دوڑ رہا ہے۔"

"یہ بات میں نے سدرہ سے کہی تھی۔ خرم کی موجودگی میں ایسا کہنا ضروری تھا۔ میں ان لوگوں کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ تم ان کے دشمن نہیں ہو لیکن سچائی کو سمجھو سچ یہ ہے کہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں آپ کی بات سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔"

"میں تمہیں فون پر سمجھا نہیں سکتا۔ اتنا سمجھ لو کہ تم میرے سگے ہو۔ وہ سگی نہیں ہے۔"

وہ بڑی حیرانی سے بولا۔ "آپ.......... آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ آپ کی سگی نہیں ہے؟ آپ کی.......... آپ کی اپنی بیٹی نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر تک فون پر خاموشی رہی پھر رئیس نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ یہ میری بدقسمتی ہے۔ کیا میں تم سے یہ امید رکھوں کہ یہ بات تم اپنی امی کو بھی نہیں بتاؤ گے؟ میں یہ سوچ کر ہی اپنی توہین محسوس کرتا ہوں کہ بیگم بانو سے ہونے والی کوئی اولاد میری اپنی نہیں تھی اور نہ ہے۔"

"ڈیڈی یہ سن کر مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔"

"بیگم بانو کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف زبردستی اس کی شادی مجھ سے کرائی تھی۔ وہ کبھی میری بیوی نہ بن سکی۔ پچھلے بائیس برس سے مجھے اُلو بنا رہی ہے۔ مجھ سے انتقام لے رہی ہے۔"

"اور اب آپ بھی انتقام لے رہے ہیں۔"

"بیٹے ایسا کوئی سوال نہ کرو جس کا میں جواب نہ دے سکوں۔"

"آپ چاہتے ہیں آپ کی اور میری سوتیلی ماں کی تمام دولت اور جائیداد صرف مجھے حاصل ہو۔ اس میں سے ایک تنکا بھی کسی سوتیلے کو نہ ملے؟"

"ہاں اگرچہ یہ کاروبار میرے سسر کا ہے لیکن محنت میری ہے۔ میرا سسر کروڑ پتی تھا۔ میں ارب پتی بن گیا ہوں۔ انسان اپنی اولاد کے لئے محنت کرتا ہے۔ دوسروں کی اولاد کو خیرات کے طور پر کچھ دے سکتا ہے لیکن انہیں اپنی دولت و جائیداد کا وارث نہیں بنا

سکتا۔"

وہ ایک ذرا توقف کے بعد بولا۔ "بیگم بانو چاہتی ہے میں اُلو بنتا رہوں اور اس سے ہونے والے پرائے بچوں کو اپنا سمجھ کر انہیں اپنا وارث بنالوں۔ شہلا، امیر احمد اور سدرہ یہ ایک ایک اولاد میرے لئے ایک ایک گالی ہے۔ میں سب کچھ برداشت کرلیتا ہوں لیکن گالیاں برداشت نہیں کرتا اور نہ کروں گا۔"

عمران بڑی حیرانی سے اور بڑے دکھ سے یہ باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "ڈیڈی! میں آپ کی باتیں سن کر پریشان ہوگیا ہوں۔ میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں آپ سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آپ سے بہت کچھ سننا چاہتا ہوں۔"

"بہتر ہے تم نیویارک نہ جاؤ واپس آجاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ وہاں تمہاری موجودگی میں سدرہ پر حملہ ہو اور تمہیں قاتل سمجھ کر گرفتار کرلیا جائے۔"

باپ کی باتیں سن کر بیٹے کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ باپ نے پوچھا۔ "چپ کیوں ہو؟"

اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ "میں آرہا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ آج جو باتیں اسے معلوم ہوئی تھیں ان باتوں سے اس کی امی اب تک بے خبر تھیں۔

رئیس احمد نے زرینہ سے یہ حقیقت چھپائی تھی۔ وہ کس زبان سے کہتا کہ دوسری بیوی انتہائی بدچلن ہے۔ ناجائز اولاد کا ذکر کرنا چاہتا تو اسے توہین کا احساس ہونے لگتا وہ دولت کی خاطر پرائے بچوں کو اپنا نام دے رہا تھا۔ وہ بچے اس کے دل و دماغ پر بوجھ بنے ہوئے تھے۔ اور سب سے ناقابلِ برداشت بات یہ تھی کہ وہ بچے اس کے وارث کہلا رہے تھے۔ آئندہ اس کے اپنے بیٹے عمران کی وراثت میں حصے دار بننے والے تھے۔

سدرہ اور خرم رات بڑی دیر سے آئے، رات کا کھانا ساتھ لے کر آئے۔ وہ تینوں ڈائننگ ٹیبل کے اطراف بیٹھ کر کھانے لگے۔ سدرہ اور خرم خوب بول ہنس رہے تھے۔ وہ اندر سے بہت پریشان تھا۔ ان کی ہنسی میں شامل نہیں ہو پا رہا تھا۔

خرم نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ تم اتنے خاموش کیوں ہو؟"

عمران نے ان دونوں کو دیکھا پھر کہا۔ "سدرہ! اگر تم پیدا ہوگئی ہو تو کیا تمہیں مار ڈالنا چاہیے؟"

"بھائی جان! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

وہ بولا۔ "ہم سب اپنی مرضی سے دنیا میں نہیں آتے لائے جاتے ہیں۔ یوں پیدا ہونے میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہم بے قصور ہوتے ہیں پھر ہم پر قاتلانہ حملے کیوں کئے جاتے ہیں؟"

خرم نے پوچھا۔ "تم ایسی بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہے ہو؟"

"میں ہوش میں رہ کر بول رہا ہوں۔ ابھی جو حقیقت مجھے معلوم ہوئی ہے' اسے سن کر سدرہ کو بہت دکھ پہنچے گا۔"

"وہ حقیقت کیا ہے؟"

"میں نے ابھی ڈیڈی سے فون پر بات کی تھی۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا جب سدرہ موجود نہ ہو تو میں ان سے فون پر بات کروں۔ میں اسی لئے تم دونوں کے ساتھ باہر نہیں گیا۔"

سدرہ اور خرم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ بول رہا تھا۔ جو کچھ اسے معلوم ہوا تھا وہ اسے ٹھہر ٹھہر کر بیان کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے سدرہ ہنس رہی تھی۔ اب اس کا چہرہ بجھنے لگا تھا پھر اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

وہ روتے ہوئے بولی۔ "میں یہ تو سمجھتی تھی کہ ممی بڑی بے شرمی سے زندگی گزار رہی ہیں لیکن یہ سوچ نہیں سکتی تھی کہ بے شرمی کے نتیجے میں میرا وجود ایک گالی بن جائے گا۔ وہ میری بزرگ ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ماں بے حیا بن جائے تو پوری انسانی تہذیب ننگی ہو جاتی ہے۔"

خرم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "چپ ہو جاؤ تمہارا وجود قابلِ نفرت نہیں ہے۔ قابلِ نفرت تمہاری ممی ہیں۔"

وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "یہ اچھا ہی ہے کہ مجھ پر قاتلانہ حملے ہو رہے ہیں۔ میرے وجود کو مٹ جانا چاہئے۔"

عمران نے کہا۔ "فضول باتیں نہ کرو۔ تم میری بہن ہو محبت اور انسانیت کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ ہمارے بزرگ بے نقاب ہو چکے ہیں۔ ڈیڈی تمہیں مٹانا چاہتے ہیں اور تمہاری ممی مجھے ختم کر دینا چاہتی ہیں۔ ان دونوں کی نفرت سے اور ان دونوں کی عداوت سے انہیں نقصان نہیں پہنچ رہا ہے۔ ہماری جان پر بنی ہوئی ہے۔ ہم پر حملے ہو رہے

ہیں۔"

عمران نے اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "ہم کسی پہلی فلائٹ سے واپس جائیں گے اگر ہم نے اپنے بزرگوں کا محاسبہ نہ کیا تو ہمیں اپنی جان سے جانا ہوگا اور میں کبھی تم پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

☆======☆======☆

زرینہ سوچ میں گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ رئیس احمد نے پوچھا۔ "کہاں پہنچی ہوئی ہو؟"

"میں نے بیٹے کو باہر بھیج دیا۔ اب اس کے بغیر دل نہیں لگ رہا ہے۔ اس کے بغیر یہ گھر یہ زندگی خالی خالی سی لگتی ہے۔"

"اگر وہ واپس آجائے تو؟"

"اچھا ہے آجائے میں پھر اسے نہیں جانے دوں گی۔"

"میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں۔ وہ واپس آ رہا ہے۔"

زرینہ نے تعجب سے پوچھا۔ "اتنی جلدی واپس آ رہا ہے؟ بات کیا ہے؟ کیا وہاں بھی اس پر حملہ ہوا ہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ہمارا بیٹا بہت نادان ہے۔ اس نے سدرہ سے دوستی کی ہے۔"

زرینہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کون سدرہ؟ وہی سوتیلی؟"

"ہاں وہ نیویارک میں نہیں ہے۔ لندن میں سدرہ کے ساتھ ہے۔"

"یا اللہ! یہ عمران کو کیا ہوا؟ سوتیلی اسے کہاں مل گئی تھی؟ وہ لندن میں کیوں ہے؟ اس پر تو الزام ہے کہ وہ سدرہ پر قاتلانہ حملے کر رہا ہے۔"

"میں یہی سوچ کر پریشان ہوں کہ وہاں سدرہ پر حملہ کیا جائے گا تو اسے شبے میں گرفتار کر لیا جائے گا۔"

"آپ اسے.......... فون کریں کہ وہ ابھی آجائے۔"

"میں فون کر چکا ہوں۔ اسے جس فلائٹ میں سیٹ ملے گی وہ اسی فلائٹ سے چلا آئے گا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی کال بیل کی آواز سنائی دی۔ زرینہ نے اٹھ کر دروازہ

کھولا پھر خوشی سے چیخ پڑی۔ ”میرا بچہ!“

عمران اندر آکر ماں کے گلے لگ گیا۔ رئیس نے قریب آکر کہا۔ ”ابھی تمہارا ہی نام لیا جارہا تھا۔ بڑی لمبی عمر ہے تمہاری۔“

زرینہ نے کہا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنی جلدی واپس آجاؤ گے۔“

عمران نے کہا۔ ”ڈیڈی سے کچھ ایسی باتیں معلوم ہوئی ہیں کہ انہیں سننے کے بعد میں پریشان ہوگیا ہوں۔“

زرینہ نے پوچھا۔ ”ایسی بات کیا ہے؟“

رئیس نے کہا۔ ”کوئی خاص بات نہیں ہے‘ یہ خواہ مخواہ پریشان ہوجاتا ہے۔“

”ڈیڈی! آپ امی سے کچھ نہ چھپائیں آج انہیں بتا دیں کہ وہاں کوٹھی میں جتنی اولادیں ہوئی تھیں ان کی کیا حیثیت ہے؟“

زرینہ دونوں باپ بیٹے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ رئیس نے کہا۔ ”بیٹے! میں نے تم سے کہا تھا اپنی امی کے سامنے ایسی باتیں نہ کرنا مگر تم میری بے عزتی کرنا چاہتے ہو۔“

”اس میں آپ کی نہیں بیگم بانو کی بے عزتی ہے۔ وہ میری امی کی سوکن ہے بے حیا ہے‘ بدچلن ہے۔ ساری عمر آپ کو دھوکا دیتی رہی اور ناجائز اولاد پیدا کرتی رہی۔“

زرینہ نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”وہی کہہ رہا ہوں جو ڈیڈی اب تک آپ سے چھپاتے رہے‘ یہ ان ناجائز بچوں کو اپنا نام دیتے رہے ہیں۔“

زرینہ نے رئیس سے کہا۔ ”اس میں آپ کی توہین کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ مجھ سے کیوں چھپاتے رہے ہیں؟“

رئیس نے کہا۔ ”تم نہیں جانتیں‘ میں پچھلے بائیس برس سے ان ناجائز بچوں کو برداشت کرتا آرہا ہوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ صرف ایک عمران ہی میرا اپنا خون ہے۔ یہی میرا وارث ہے جب یہ جوان ہوا تو میں نے طے کرلیا کہ میں اپنے نام سے پرورش پانے والے بچوں کو اپنی دولت اور جائیداد کا وارث نہیں بننے دوں گا۔ انہیں نابود ہوجانا چاہئے یا نابود کردینا چاہئے۔ وہ تین تھے شہلا‘ امیر احمد اور سدرہ۔ ان میں سے ایک سدرہ رہ گئی ہے۔“

زرینہ نے حیرانی اور بے یقینی سے پوچھا۔ ”کیا آپ.......... آپ نے امیر احمد اور شہلا کو..........؟“

”ہاں میں نے یہی چاہا تھا کہ پہلے امیر احمد کو قتل کرادوں۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ شہلا اپنے بھائی امیر احمد کو اور سدرہ کو سوتیلا سمجھ رہی ہے۔ اس نے اسد سے مل کر ان دونوں کو ٹھکانے لگانے کی پلاننگ کی تھی۔ اس سے پہلے کہ میری طرف سے امیر احمد پر حملہ ہوتا‘ اسد نے اسے قتل کردیا۔ جب اسد گرفتار ہوا تو میں سمجھ گیا کہ شہلا کتنی خطرناک ہے؟ وہ زیادہ حصہ حاصل کرنے والے کسی بھی سوتیلے بھائی کو زندہ نہیں چھوڑے گی‘ اس سے پہلے کہ وہ میرے عمران کی طرف حملہ کرتی‘ میں نے اسے اسپتال میں قتل کروادیا۔“

زرینہ نے پریشان ہوکر کہا۔ ”یہ آپ نے کیا کیا؟ اپنے بیٹے کی خاطر قاتل بن گئے؟“

”مجھے بانو بیگم کی دشمنی نے مجبور کردیا۔ اس نے عمران پر قاتلانہ حملہ کروایا تھا۔ میں نے جواباً سدرہ پر حملہ کروایا تھا۔ اتفاق سے اِدھر میرا بیٹا بچ گیا اُدھر سدرہ بچ گئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ عمران پر پھر حملہ کیا جائے گا۔ پتا نہیں یہ حملہ کب ہوگا کیسے ہوگا؟ میرے بیٹے کا کیا بنے گا؟ میرے آدمی یار محمد پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ وہ اسے کسی خاص موقع پر پھانسنا چاہتے تھے۔ انہیں ایسا موقع مل گیا انہوں نے لوگوں کے ہجوم میں یار محمد کو عمران کی کار کے پاس دیکھا۔ اس سے پہلے کہ عمران اس کار میں آکر بیٹھتا وہ اسے بہانے سے دفتر میں واپس لے گئے پھر کار میں ریموٹ کنٹرول بم رکھ کر اڑا دیا۔ میرے بیٹے کو قتل کرنے والا خود ہی جہنم میں پہنچ گیا۔“

زرینہ نے کہا۔ ”میں آپ کی باتیں سن کر پریشان ہو رہی ہوں۔ آپ میرے مجازی خدا نہیں لگ رہے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ اتنے ظالم ہوں گے۔ امیر احمد آپ کا خون نہیں تھا اگر اسے آپ سے منسوب کیا جارہا تھا تو اس میں اس بچے کا کیا قصور تھا؟ آپ اسے قتل کرانا چاہتے تھے۔ آپ کو تو بیگم بانو سے انتقام لینا چاہئے‘ اس بے حیا کو قانون کے حوالے کرنا چاہئے؟“

عمران نے کہا۔ ”امی! میرے ڈیڈی اس سے انتقام نہیں لے سکتے تھے۔ اسے جانی نقصان پہنچے گا تو ڈیڈی کو گرفتار کیا جائے گا کیونکہ اس عورت کی موت سے صرف ڈیڈی کو

فائدہ پہنچے گا۔ بائی داوے میں نے ڈیڈی کی ایک مشکل آسان کر دی ہے۔"

ماں باپ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے کہا۔ "ڈیڈی سدرہ کو ہلاک کر کے تمام سوتیلوں کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ میں نے لندن سے چلتے وقت سدرہ کو قتل کر دیا ہے۔"

زرینہ ایک دم سے تڑپ کر بیٹے کے پاس آئی۔ اسے مارنے لگی۔ اسے جھنجوڑنے لگی۔ "یہ تم نے کیا کیا؟ تم قاتل بن گئے؟ تم پکڑے جاؤ گے۔ تمہیں سزا ہو گی تو کیا میں زندہ رہ سکوں گی؟"

رئیس نے اس کے بازو کو مضبوطی سے تھام کر کہا۔ "بیٹے یہ کام میرا تھا تم نے کیوں کیا؟ اب یہ بات کبھی زبان پر مت لانا کہ تم نے سدرہ کو ہلاک کیا ہے۔ بیٹے تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ یہاں سرفراز تمہارے پیچھے پڑ جائے گا۔"

کال بیل کی آواز سنائی دی۔ رئیس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ پھر سرفراز کو دیکھتے ہی ایک دم سے گھبرا گیا۔ اس کے ساتھ خرم بھی تھا۔ سرفراز نے عمران کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا تھا تم اپنی ماں کی گود میں چھپنے آؤ گے۔"

رئیس نے انجان بن کر پوچھا۔ "آپ میرے بیٹے سے کیا کہہ رہے ہیں؟"

سرفراز نے کہا۔ "آپ کے صاحبزادے نے لندن میں سدرہ کو قتل کیا ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ میرے بیٹے نے کسی کو قتل نہیں کیا' آپ الزام دے رہے ہیں۔ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟"

خرم نے کہا۔ "میں چشم دید گواہ ہوں میرے علاوہ اس بنگلے کا چوکیدار بھی گواہی دے گا۔"

عمران نے کہا۔ "ڈیڈی! میں اعتراف کر رہا ہوں آپ بھی اعتراف کریں کہ آپ میرے تمام سوتیلوں کو قتل کرانا چاہتے تھے۔ ان میں سے شہلا کو آپ نے گولی ماری' سدرہ کو میں ہلاک کر چکا ہوں۔"

رئیس نے گرج کر کہا۔ "بکواس مت کرو۔ سدرہ کو تم نے ہلاک نہیں کیا ہے۔ میرا ایک کرائے کا قاتل پہلے بھی اس پر حملے کر چکا ہے۔ لندن میں اس کا آخری حملہ کامیاب رہا ہے۔"

سرفراز نے کہا۔ "اگر آپ اقبالِ جرم کر لیں کہ تمام سوتیلوں کو ہلاک کرانے کے

لئے کرائے کے قاتلوں سے کام لیتے رہے ہیں تو آپ کے بیٹے عمران پر قتل کا الزام نہیں آئے گا۔"

"ہاں میں اعتراف کرتا ہوں۔ اپنے تمام جرائم کو قبول کرتا ہوں۔ مجھے گرفتار کرو مجھے لے چلو۔ میں تحریری بیان دوں گا۔"

سرفراز نے ہتھکڑی نکال کر رئیس کے دونوں ہاتھوں میں پہنا دی۔ ایسے وقت سدرہ دروازے پر آئی۔ زرینہ نے اسے دیکھ کر کہا۔ "یہ تو زندہ ہے۔"

وہ عمران کے پاس آ کر اس کے بازو سے لگ کر بولی۔ "میرے بھائی جان قاتل کو بے نقاب کر کے مجھے نئی زندگی دے رہے ہیں۔"

عمران نے کہا۔ "سوری ڈیڈ! آپ مجھے جھوٹے الزامات سے بچانے اور قاتلوں سے محفوظ رکھنے کے لئے دولت پانی کی طرح بہاتے رہے۔ میرے لئے دن رات پریشان ہوتے رہے۔ آپ بہت اچھے والد ہیں لیکن بہت اچھے انسان نہیں ہیں۔ آپ نے بے قصور امیر احمد کو قتل کرانا چاہا۔ معصوم سدرہ پر حملے کراتے رہے۔ صرف اس لئے کہ ان کی رگوں میں آپ کا لہو نہیں دوڑ رہا۔"

سرفراز نے کہا۔ "سیدھا سا راستہ تھا۔ آپ امیر احمد اور سدرہ کو اپنی اولاد تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے۔ انہیں باپ کا نام نہ دیتے تو پھر یہ بچے خود ہی وراثت سے محروم ہو جاتے۔"

رئیس نے کہا۔ "میں اعلانیہ ایسا کہتا تو بیگم بانو سے میرا رشتہ ٹوٹ جاتا۔ میرے سسر کی وصیت کے مطابق میں بیگم بانو کو کبھی طلاق نہیں دے سکتا تھا۔ کسی بھی بہانے سے رشتہ توڑ نہیں سکتا تھا۔ ایسا کرنے سے اربوں روپے کا کاروبار میرے ہاتھ سے نکل جاتا۔ میری تمام دولت اور جائیداد کو سیل کر دیا جاتا۔ عمران میرا ایک ہی اپنا بیٹا ہے میں اسے اتنے بڑے کاروبار اور دولت اور جائیداد سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

عمران نے کہا۔ "مجھے معلوم ہوتا کہ آپ میری خاطر جرائم کا راستہ اختیار کر رہے ہیں تو میں آپ کو اس راستے پر کبھی چلنے نہ دیتا۔ میرے لئے آپ کی اور امی کی محبت دنیا کی تمام دولت سے زیادہ قیمتی ہے اور اب تو مجھے سدرہ جیسی بہن کا پیار بھی مل رہا ہے۔"

رئیس نے سر جھکا لیا۔

سرفراز نے بیگم بانو کو اطلاع دی کہ رئیس احمد نے اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا

ہے۔ وہ حوالات میں ہے لہٰذا وہ انٹیلی جنس کے آفس میں چلی آئے۔

یہ اس کے لئے بہت بڑی خوشخبری تھی۔ وہ فوراً ہی وہاں پہنچ گئی۔ رئیس کو آہنی سلاخوں سے باہر لایا گیا۔ اس نے بیگم سے کہا۔ "میں نے اقبالِ جرم کیا ہے۔ تمہیں بھی اپنے جرائم کو قبول کرنا چاہئے۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "میں شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ تمہاری طرح مجرم نہیں ہوں۔ مجھے افسوس ہے اب تم ایک لمبی سزا کاٹو گے۔ ایسے وقت میں تمہیں خوشخبری سنانے آئی ہوں۔ لیڈی ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا ہے اور کہا ہے کہ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ یہ ایسی خوشخبری ہے کہ تمہیں خوش ہونا چاہئے۔"

رئیس نے کہا۔ "یہ ایسی خبر ہے کہ تمہیں رونا چاہئے۔ مسٹر سرفراز! یہ عورت بدچلن ہے۔ گناہگار ہے۔ آپ اسے حراست میں لیں' میں اس کے ہونے والے بچے کا باپ نہیں ہوں۔"

سرفراز نے کہا۔ "آپ کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ہے۔ آپ دونوں ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہیں۔ اس ہونے والے بچے کے باپ آپ ہی کہلائیں گے۔"

رئیس نے ریسیور اٹھا کر اپنے ڈاکٹر دوست سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "میری بیگم کا دعویٰ ہے کہ یہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ پلیز آپ ابھی میری فائل لے آئیں۔ میں مسٹر سرفراز کے آفس میں ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ سرفراز نے پوچھا۔ "آپ نے کسے فون کیا ہے؟ کس قسم کی فائل منگوا رہے ہیں۔"

"اس فائل میں میری میڈیکل رپورٹ دیکھ کر آپ کو یقین ہوجائے گا کہ میں باپ بننے کے قابل نہیں ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے فائل لاکر سرفراز کو دکھائی پھر کہا۔ "مسٹر رئیس پانچ ماہ پہلے خاندانی منصوبہ بندی کے دفتر میں آئے تھے۔ انہوں نے وہاں اپنی مرضی سے نس بندی کرائی تھی۔ یہ نس بندی کی تاریخ یہاں درج ہے۔"

سرفراز نے بیگم بانو کو دیکھ کر کہا۔ "اگر آپ پانچ ماہ پہلے ماں بننے کی خبر سناتیں تو یہ خوشخبری ہوتی۔ اب تو یہ خبر آپ کے گلے میں ہڈی کی طرح اٹک گئی ہے۔ نہ اس بچے کو مار سکیں گی اور نہ ہی پیدا کرنا چاہیں گی۔ میں تمہیں بدکاری کے الزام میں گرفتار کر رہا

ہوں۔"

بیگم بانو کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ رئیس اسے بدکار ثابت کرنے کے لئے خاندانی منصوبہ بندی کے طریقۂ کار سے فائدہ اٹھائے گا۔

رئیس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ہمارے درمیان بڑی عداوتیں رہیں پھر بھی ہم بیس برس تک ایک ہی چھت کے نیچے زندگی گزارتے رہے۔ آؤ اب ایک ہی حوالات میں کچھ وقت گزاریں۔"

☆====== تمت بالخیر ======☆